الكوثر

في تفسير القرآن

١

الکوثر فی تفسیر القرآن

جلد ششم

سُورَةُ الْفُرْقَانِ ۲۵ تا سُورَةُ السَّجدَة ۳۲

محسن علی نجفی

مِصْبَاحُ الْقُرآن ٹرسٹ۔لاہور

تفسیر القرآن

الفرقان ۲۵۔ الشوری ۲٦۔ النمل ۲۷۔ القصص ۲۸۔ العنکبوت ۲۹۔
الروم ۳۰۔ لقمان ۳۱۔ السجدة ۳۲۔

نام کتاب: الکوثر فی تفسیر القرآن (جلد ششم)
مفسر: محسن علی نجفی
کمپوزنگ و فارمٹنگ: خادم حسین
انتظامی امور: علی حیدری
تعداد: ایک ہزار
باراول: محرم الحرام ۱۴۳٦ھ/نومبر ۲۰۱۴ء
باردوم: ربیع الاول ۱۴۳۷ھ/جنوری ۲۰۱٦ء
مطبع: عاشق شاہ زیب پریس۔ لاہور
پیشکش: جامعة الکوثر۔ اسلام آباد
ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور
فون: 0321 448 1214
ای میل: info@misbahulqurantrust.com
ویب: www.misbahulaqurantrust.com

اس کتاب میں نقل شدہ اکثر روایات کے متن اور حوالوں کی اصلاح و تطبیق، کتب احادیث پر مبنی سافٹ ویئر ''جامع الاحادیث'' تیار کردہ کمپیوٹر ریسرچ سینٹر آف اسلامک سائنسز اور المحدث سے کی گئی ہے۔

نہج البلاغة کے اکثر اقتباسات کا ترجمہ نہج البلاغة ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ مطبوعہ امامیہ کتب خانہ لاہور سے نقل کیا گیا ہے۔

تشریح کلمات مفردات القرآن راغب اصفہانی، ترجمہ مولانا محمد عبدہ فیروز پوری سے ماخوذ ہے۔

ملنے کا پتہ: محمد علی بک ایجنسی۔ کراچی کمپنی۔ اسلام آباد
معراج کمپنی۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

قارئین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! مصباح القرآن ٹرسٹ عہد حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے امت مسلمہ کے لیے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ ادارہ ہذا کی یہ شہرت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

خالقِ کائنات نے ''انسان'' کو روح و بدن سے مرکب، عقلِ سلیم اور قوتِ گویائی کی نعمات سے مالا مال فرما کر موجوداتِ عالم میں منفرد و ممتاز مقام عطا فرمایا ہے۔ جس طرح بدن کو اپنے ہی اعضا کی تقویت و ارتقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی بلندی اور تازگی کے لیے زہد و تقویٰ سے ملبوس ہو کر علمی تفکر کے میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ روحانی تسکین اور معرفت کی بلندیوں سے فیض یاب ہونے کے لیے آیاتِ قرآن پر غور و فکر کرنا، اس کے رموز و حقائق کو سمجھنا اور فرمودات الٰہی پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی گزارنا آخرت کی کامیابی کا باعث ہے۔

بلاشبہ قرآنِ مجید دین اسلام کا حقیقی آئین و دستور ہے۔ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے اسی قدر اس میں مزید تازگی آ جاتی ہے؟ جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔''

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے دنیا کے ہر شخص کے لیے قرآنی آیات کے مفہوم اور تفاسیر کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر علمائے اسلام نے عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں قرآن مجید کی بہت سی تفاسیر اور تراجم مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے اہل تشیع و اہل

سنت علماء نے بھی اردوزبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم و تفاسیر پیش کیے ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان میں طبع شدہ اکثر تراجم و تفاسیر لکھنؤ (انڈیا) کے مترجمین و مفسرین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔لکھنؤ کی اُردو پاکستان کی موجودہ اردو سے ذرا مختلف ہے۔

دنیا کا ہر شخص دوسری زبانوں کے علاوہ اپنی قومی زبان بلکہ اپنے خطے کی زبان سے زیادہ مانوس ہوتا ہے لہٰذا خطے کی موجودہ اردو زبان کے پیش نظر اور قرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات اور جدید معاندانہ تحریروں اور الزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا موقف بیان کرنے کے لیے ۱۰ جلدوں پر مشتمل زیر نظر تفسیر قرآن '' الکوثر فی تفسیر القرآن '' کی جلد ششم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ محسن علی نجفی مدظلہ العالی کی غیر معمولی مساعی اور شبانہ روز محنت کا ثمر ہے۔ خداوندعالم اُن کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اور انہیں طاقت وصحت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ قبلہ موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ادارہ ہذا کو یہ تفسیری مجموعہ پرنٹ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ:

www.misbahulqurantrust.com

کے ذریعے گھر بیٹھے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق مصباح القرآن ٹرسٹ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی و عملی استفادہ فرمائیں گے اور ادارے کو اپنی قیمتی تجاویز و آراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

والسلام
اراکین
مصباح القرآن ٹرسٹ لاهور۔
پاکستان

سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورہ مبارکہ کی پہلی آیت میں لفظ الفرقان مذکور ہونے نیز سورہ کی مباحث کے مضامین کی مناسبت سے اس سورہ کا نام الفرقان ہے۔

زمان نزول: بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ جب نازل ہو رہی تھی اسلام کو کچھ کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں جن کی وجہ سے مشرکین کا ردعمل پہلے سے شدید تر ہو گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی زندگی کے اواسط میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ آیت نمبر ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تدوین مکی زندگی میں شروع ہو گئی تھی بلکہ قرآن کے نزول کے ساتھ ساتھ تدوین بھی ہوتی رہی ہے:

وَ قَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ اکۡتَتَبَہَا فَہِیَ تُمۡلٰی عَلَیۡہِ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا ○

اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھوا رکھی ہیں اور جو صبح و شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

بقول مشرکین صبح و شام جو سنائی جاتی ہیں۔ اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: ایک تو یہ کہ قرآن کی تدوین ابتدائے وحی سے شروع ہو گئی تھی۔ دوسری بات یہ کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہو رہی تھی قرآن کا ایک قابل توجہ حصہ نازل ہو چکا تھا جسے مشرکین نے محسوس کیا کہ صبح و شام سنایا جاتا ہے۔

یہ سورۃ بالاتفاق ۷۷ آیات پر مشتمل ہے۔ طبرسیؒ کے مطابق آیات کی یہ تعداد اجماعی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۱﴾	۱۔ بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل فرمایا تاکہ وہ سارے جہاں والوں کے لیے انتباہ کرنے والا ہو۔

تشریح کلمات

تَبٰرَکَ: (ب ر ك) کے معنی خیر کثیر کے ثبوت و لزوم کے ہیں یہ غالباً صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے اور اس خیر کثیر میں سے ایک فرقان کا نازل کرنا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ: بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا۔ قرآن ایک ایسا دستور حیات ہے جو حق اور باطل کو نمایاں کر کے جدا کر دیتا ہے۔ وہ ذات کتنی بابرکت ہوگی جس نے بنی نوع انسان کے لیے قرآن جیسی کتاب ہدایت عنایت فرمائی ہے۔

۲۔ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا: عالمین میں صرف مکلفین شامل ہیں چونکہ غیر مکلف کی تنبیہ نہیں ہوتی۔ مکلفین میں انسان اور جن دونوں شامل ہیں۔ نَذِیۡرًا صرف تنبیہ کا ذکر آیا بشیراً کا ذکر نہیں آیا چونکہ مشرکین، منکرین اور معاندین اس سورہ کے مخاطب ہیں۔

اس آیت میں مستشرقین کے اس الزام کی رد ہے کہ محمدؐ شروع میں صرف مکہ اور اس کے گرد و پیش والوں کی طرف مبعوث ہونے کے مدعی تھے۔ بعد میں محمد نے اپنی دعوت کو وسعت دی۔ حالانکہ مکہ میں نازل ہونے والی اس سورت میں اعلان ہے: یہ رسول سارے جہانوں کی تنبیہ کے لیے آیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تنبیہ میں بشارت ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنْ حَذَّرَكَ كَمَنْ بَشَّرَكَ۔[1] جو (برائیوں سے) خوف دلائے وہ تمہارے لیے مژدہ سنانے والے کی مانند ہے۔

الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ﴿۲﴾

۲۔ جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا اور جس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے اور جس نے ہر چیز کو خلق فرمایا پھر ہر ایک کو اپنے اندازے میں مقدر فرمایا۔

تفسیر آیات

۱۔ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا: اس جملے کی تشریح سورہ بقرہ آیت ۱۱۶، یونس آیت ۶۸ میں ہو گئی ہے کہ زمین و آسمانوں کی سلطنت صرف اللہ کے پاس ہے۔

۲۔ وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ: اللہ کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں ہے جب کہ مشرکین تدبیر و سلطنت میں دوسروں کو اللہ کا شریک بناتے تھے کہ خلق تو خدا نے کیا ہے لیکن خلق کے بعد تدبیر کے اختیارات غیر اللہ کے پاس ہیں۔

۳۔ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا: ہر چیز کو خلق فرمانے کے بعد اس کی بقا و ارتقا کا پیمانہ متعین فرمایا نیز اس کی تخلیق کے وقت ہی اس کی بقا و ارتقا کے لیے ضروری ہدایات بھی اس میں ودیعت فرمائیں۔ ہر ایک کے لیے بقا و ارتقا کے علل و اسباب کا تعین فرمایا اور فزیکلی قوانین وضع فرمائے جسے تقدیر کہتے ہیں۔

وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ وَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا وَّ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّ لَا

۳۔ لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے جو کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہیں اور وہ اپنے لیے بھی کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور وہ نہ موت کا اختیار رکھتے ہیں

[1] نہج البلاغۃ حکمت: ۵۹

حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ③ — اور نہ حیات کا اور نہ ہی اٹھائے جانے کا۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں بیان فرمایا کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا چونکہ خلق اور تقدیر دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس آیت میں فرمایا: جن چیزوں کو ان مشرکین نے معبود بنا رکھا ہے ان میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں: نہ خلق، نہ تقدیر۔

قرآنی آیات کی روشنی میں ہم نے عبادت کی یہ تعریف اختیار کی ہے کہ کسی کو خالق اور رب سمجھ کر اس کی تعظیم کرنا عبادت ہے۔ ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔ اس آیت سے بھی یہی تعظیم نکل آتی ہے کہ ان مشرکین نے ایسی چیز کو معبود بنایا جو لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا کسی شیء کی خالق نہیں ہے۔ وَلَا يَمْلِكُوْنَ ربوبیت کے مقام پر بھی فائز نہیں ہے چونکہ رب وہ مالک ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں نفع و ضرر، موت و حیات ہوتی ہے۔ اس آیت میں معبود کے لیے تین باتوں کا ہونا لازمی قرار دیا ہے:

i۔ خالق ہونا چاہیے۔

ii۔ مالک ہونا چاہیے۔

iii۔ موت و حیات اس کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ④

۴۔ اور کفار کہتے ہیں: یہ قرآن ایک خود ساختہ چیز ہے جسے اس شخص نے خود گھڑ لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے، (ایسی باتیں کر کے) یہ لوگ ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: سے مراد مشرکین مکہ ہیں جو کہتے ہیں یہ قرآن خود ساختہ ہے۔ افْتَرٰىهُ جس کے گھڑنے میں خود نے بھی کوشش کی ہے۔

۲۔ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ: دوسرے لوگوں نے بھی اس میں اس کی مدد کی ہے۔

کہتے ہیں: دوسرے لوگوں سے مراد چند آزاد شدہ غلام ہیں جو اہل کتاب تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ روایات میں ان کے نام بھی لیے گئے ہیں: عداس، خویطب بن عبد العزی کا آزاد کردہ غلام۔ یسار، علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام اور جبر، عامر بن ربیعہ کا آزاد کردہ غلام۔ الزام

یہ لگایا کہ محمدؐ قدیم قوموں کی داستانیں ان آزاد شدہ غلاموں سے اخذ کرتے ہیں پھر ہمیں وحی کے نام سے سناتے ہیں۔

اس کے جواب میں قرآن نے یہ کہنے پر اکتفا کیا: یہ الزام لگانے والے ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں چونکہ وہ اپنے اس الزام کی کوئی سند نہیں رکھتے۔

i۔ جب یہ لوگ رسول ﷺ کے محضر میں بیٹھتے تھے، سب کو علم تھا کہ رسولؐ ان سے سنتے ہیں یا یہ لوگ رسول ﷺ سے سنتے ہیں۔ کسی نے یہ دعویٰ تک نہیں کیا کہ ہم نے رسول ﷺ کو ان سے سنتے ہوئے دیکھا ہے یا رسولؐ کے پاس بیٹھنے والوں میں سے کسی نے کہا ہے۔

ii۔ اگر ان آزاد شدہ غلاموں سے مواد جمع کر کے ایسا کلام ترتیب دیا جا سکتا ہے تو یہ کام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشرکین مکہ کے لیے زیادہ آسان تھا چونکہ اہل کتاب بھی اس کام میں ان کی مدد کے لیے آمادہ تھے۔ وہ ان غلاموں سے زیادہ پڑھے لکھے، اہل کتاب کے احبار اور ماہرین سے مدد لے سکتے تھے۔

iii۔ یہ آزاد شدہ غلام اہل کتاب کے علماء میں سے نہیں تھے۔ عام اہل کتاب رہ چکے تھے۔ ان کے مبلغ علم کا سب کو اندازہ تھا کہ کیا وہ ایسے علمی مواد فراہم کر سکتے ہیں؟ کیا ان کی علمی صلاحیت اور قرآن کی سطح کلام میں کوئی تناسب ہے؟

iv۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ یہ آزاد شدہ غلام، ناقابل تحمل ظلم و ستم برداشت کر کے کسی دوسرے کی جھوٹی نبوت چمکا دیں۔

اسی طرح اس الزام کے جھوٹ ہونے کے کئی شواہد خود اس الزام میں موجود تھے۔ اس لیے اس کی رد میں صرف ظلم اور جھوٹ کہنے پر اکتفا کیا۔

اہم نکات

۱۔ کبھی جھوٹے الزام میں اس کے جھوٹ ہونے کے شواہد، خود الزام میں موجود ہوتے ہیں۔

وَ قَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ اکۡتَتَبَہَا فَہِیَ تُمۡلٰی عَلَیۡہِ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا۵

۵۔ اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھوا رکھی ہیں اور جو صبح و شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ: کہتے ہیں کہ یہ قرآن سابقہ امتوں کی داستانیں ہیں۔ اس الزام

سے ایسا لگتا ہے کہ قرآن صرف ماضی کی امتوں کی داستانوں سے عبارت ایک داستانی کتاب ہے حالانکہ ماضی کی امتوں کے واقعات قرآنی مطالب کا ایک حصہ ہیں۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ گزشتہ تکذیبی قوموں کے واقعات ان کی عبرت ناک ہلاکت پر مشتمل تھے جن سے یہ لوگ خوف زدہ تھے۔ اس خوف کو دلوں سے نکالنے کے لیے خاص کر ان واقعات کو ہدف بناتے تھے۔

۲۔ اکۡتَتَبَہَا فَہِیَ تُمۡلٰی عَلَیۡہِ: ان داستانوں کو محمد ﷺ نے لکھوایا ہے۔ اس بات میں اس بات کا ثبوت چھوڑ گئے۔ قرآن کی زندگی میں بھی ضبط تحریر میں لایا جاتا تھا اور اس کی تدوین کا انتظام شروع سے کیا جا رہا تھا۔ اس میں ان لوگوں کی رد ہے جو کہتے ہیں قرآن عہد نبوت میں مدون نہ تھا۔

اکتب، امر بہ کتابت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے احجم، امر بہ حجامت اور افتصد امر بہ فصد میں ہے۔

۳۔ فَہِیَ تُمۡلٰی عَلَیۡہِ: اس جگہ املاء سے مراد لکھنے کے بعد پڑھ کر سنانا ہے، لکھانا نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ لکھانا، پڑھ کر سنانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ تعلیم تھا (بہ اعتراف مخالف)۔

قُلۡ اَنۡزَلَہُ الَّذِیۡ یَعۡلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۝۶

۶۔ کہد یجیے: اسے تو اس اللہ نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا راز جانتا ہے، بے شک وہ بڑا غفور رحیم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ کہد یجیے: اس کتاب کا مضمون خود یہ گواہی دیتا ہے کہ اسے ایسی ذات نے نازل فرمایا ہے جو کائنات کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔ چند عام آدمیوں کی کمک سے ایسے مضامین تیار نہیں ہو سکتے۔

۲۔ اس افترا پر اللہ عذاب نازل کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیتا ہے وہ غفور و رحیم ہے۔

اہم نکات

۱۔ آسمانوں اور زمین کے اسرار قرآن میں تلاش کرنے چاہئیں۔

وَ قَالُوۡا مَالِ ہٰذَا الرَّسُوۡلِ یَاۡکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمۡشِیۡ فِی الۡاَسۡوَاقِ ؕ لَوۡ

۷۔ اور وہ کہتے ہیں: یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ اس

لَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مَلَکٌ فَیَکُوۡنَ مَعَہٗ نَذِیۡرًا ۙ﴿۷﴾
کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟ تاکہ اس کے ساتھ تنبیہ کر دیا کرے۔

اَوۡ یُلۡقٰۤی اِلَیۡہِ کَنۡزٌ اَوۡ تَکُوۡنُ لَہٗ جَنَّۃٌ یَّاۡکُلُ مِنۡہَا ؕ وَ قَالَ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ﴿۸﴾
۸۔ یا اس کے لیے کوئی خزانہ نازل کر دیا جاتا یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس سے وہ کھا لیا کرتا اور ظالم لوگ (اہل ایمان سے) کہتے ہیں: تم تو ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو۔

اُنۡظُرۡ کَیۡفَ ضَرَبُوۡا لَکَ الۡاَمۡثَالَ فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا ٪﴿۹﴾
۹۔ دیکھیے! یہ لوگ آپ کے بارے میں کیسی باتیں بنا رہے ہیں، پس یہ ایسے گمراہ ہو گئے ہیں کہ ان کے لیے راہ پانا ممکن نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالُوۡا مَالِ ہٰذَا الرَّسُوۡلِ یَاۡکُلُ الطَّعَامَ: مشرکین کا یہ نظریہ تھا کہ بشر، اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا۔ مادی وجود، اللہ کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ فرشتوں کو اللہ تک پہنچنے کے لیے وسیلہ سمجھتے، ان کی پرستش کرتے اور ان کے نزدیک کھانا اور لوگوں کے درمیان چلنا پھرنا رسالت کے منافی تھا۔

۲۔ لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مَلَکٌ فَیَکُوۡنَ مَعَہٗ نَذِیۡرًا: اگر کوئی، بشر رسول بن سکتا ہے تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک فرشتہ اس کے ساتھ ہو اور اس کے ذریعے غیب کے ساتھ رابطہ قائم ہو۔ پھر یہ بشر اور فرشتہ دونوں مل کر نذیر بن جائیں: فَیَکُوۡنَ مَعَہٗ نَذِیۡرًا۔

۳۔ اَوۡ یُلۡقٰۤی اِلَیۡہِ کَنۡزٌ: دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اس رسول پر کوئی خزانہ اتار دیتا۔ ایک فقیر، نادار جو اپنے نان جویں کا محتاج ہو، اللہ کا نمایندہ کیسے ہو سکتا ہے؟

۴۔ اَوۡ تَکُوۡنُ لَہٗ جَنَّۃٌ: یا اس کے پاس ایسا باغ ہوتا جس سے وہ اپنی معیشت مستحکم کرتا۔

۵۔ وَ قَالَ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا: یہ مشرکین، یہ ظالم لوگ کہتے ہیں: اس شخص کے ساتھ نہ فرشتہ ہے، نہ اس کے پاس خزانہ ہے، نہ کھانے کے لیے باغ ہے لہٰذا یہ اللہ کا نمایندہ نہیں ہے۔ مسلمانو! تم ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو۔

جب مشرکین یہ الزام لگاتے ہیں: وَ اَعَانَہٗ عَلَیۡہِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ اس قرآن کو گھڑنے میں دوسرے لوگوں نے اس کی مدد کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ رسول نہایت عاقل سمجھدار ہے۔ دوسروں سے سیکھ کر پر کشش باتیں بناتا ہے۔

جب کہتے ہیں: رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا یہ سحرزدہ آدمی ہے تو کسی سے کچھ سیکھنے کے قابل نہیں ہے چونکہ سحرزدہ انسان کچھ سیکھ نہیں سکتا۔ اس طرح ان مشرکین کے الزامات میں تضاد اور تصادم ہے۔ سچ ہے، جھوٹ کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔

۲۔ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ ضَرَبُوۡا لَکَ الۡاَمۡثَالَ: یہ آپؐ کے بارے میں متضاد اور مختلف باتیں بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن خود آپؐ کے خلاف ایک الزام پر بھی ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔ متضاد باتیں کر کے نہ صرف انہیں حق کا راستہ نہیں ملتا بلکہ باطل پر چلنے کے راستے میں بھی تضاد کا شکار ہیں: فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا۔

تَبٰرَکَ الَّذِیۡۤ اِنۡ شَآءَ جَعَلَ لَکَ خَیۡرًا مِّنۡ ذٰلِکَ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۙ وَ یَجۡعَلۡ لَّکَ قُصُوۡرًا ﴿۱۰﴾

۱۰۔ بابرکت ہے وہ ذات کہ اگر وہ چاہے تو آپ کے لیے اس سے بہتر ایسے باغات بنا دے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں اور آپ کے لیے بڑے بڑے محل بنا دے۔

تفسیر آیات

۱۔ تَبٰرَکَ الَّذِیۡۤ اِنۡ شَآءَ جَعَلَ لَکَ خَیۡرًا: اگر اللہ کی مشیت اور حکمت کا تقاضا اس میں ہوتا تو دنیا میں بھی آپ کے لیے ان چیزوں سے بہتر نعمتوں کی فراوانی کر دیتا جن کا تصور یہ لوگ کر رہے ہیں مگر اللہ اپنے رسول کو کردار و سیرت کے لیے اسوہ بناتا ہے اور نہ صرف ناز و نعمت میں نہیں رکھتا بلکہ ہر قسم کی آزمائش میں مبتلا کر دیتا اور ہلا کر کے رکھ دیتا ہے:

وَ زُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ...[1]

اور وہ اس حد تک جھنجھوڑے گئے کہ (وقت کا) رسول اور اس کے مومن ساتھی پکار اٹھے کہ آخر اللہ کی نصرت کب آئے گی؟

17

یہاں تک کہ رسول اور رسول کے ساتھ ایمان لانے والے کہہ اٹھتے ہیں: اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ یہ آزمائش اس حد تک کٹھن ہوتی ہے کہ ناامیدی کی سرحد تک پہنچنے والے ہوتے ہیں:

حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا جَآءَہُمۡ نَصۡرُنَا ۙ ...[2]

یہاں تک کہ جب انبیاء (لوگوں سے) مایوس ہو گئے اور لوگ بھی یہ خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا تو پیغمبروں کے لیے ہماری نصرت پہنچ گئی۔

اسی لیے اس الٰہی منصب کا ہر کوئی اہل نہیں ہوتا۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۱۴ [2] ۱۲ یوسف: ۱۱۰

اہم نکات

۱۔ الٰہی منصب ناز و نعمت میں نہیں، کڑی آزمائشوں میں رکھا گیا ہے۔

بَلۡ کَذَّبُوۡا بِالسَّاعَۃِ ۟ وَ اَعۡتَدۡنَا لِمَنۡ کَذَّبَ بِالسَّاعَۃِ سَعِیۡرًا ﴿۱۱﴾

اِذَا رَاَتۡہُمۡ مِّنۡ مَّکَانٍۭ بَعِیۡدٍ سَمِعُوۡا لَہَا تَغَیُّظًا وَّ زَفِیۡرًا ﴿۱۲﴾

وَ اِذَاۤ اُلۡقُوۡا مِنۡہَا مَکَانًا ضَیِّقًا مُّقَرَّنِیۡنَ دَعَوۡا ہُنَالِکَ ثُبُوۡرًا ﴿۱۳﴾

لَا تَدۡعُوا الۡیَوۡمَ ثُبُوۡرًا وَّاحِدًا وَّ ادۡعُوۡا ثُبُوۡرًا کَثِیۡرًا ﴿۱۴﴾

۱۱۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) انہوں نے قیامت کو جھٹلایا اور جو قیامت کو جھٹلائے اس کے لیے ہم نے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

۱۲۔ جب وہ (جہنم) دور سے انہیں دیکھے گی تو یہ لوگ غضب سے اس کا بپھرنا اور دھاڑنا سنیں گے۔

۱۳۔ اور جب انہیں جکڑ کر جہنم کی کسی تنگ جگہ میں ڈال دیا جائے گا تو وہاں وہ موت کو پکاریں گے۔

۱۴۔ (تو ان سے کہا جائے گا) آج ایک موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی اموات کو پکارو۔

تشریح کلمات

زَفِیۡرًا: (ز ف ر) الزفیر کے اصل معنی سانس کے اس قدر تیزی سے آمد و رفت کے ہیں کہ اس سے سینہ پھول جائے۔

مُّقَرَّنِیۡنَ: (ق ر ن) قرنت البعیر مع البعیر۔ دو اونٹوں کو ایک رسی کے ساتھ باندھا جانا۔

ثُبُوۡرًا: (ث ب ر) الثبور ہلاک ہونے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ بَلۡ کَذَّبُوۡا بِالسَّاعَۃِ: انکار نبوت کا اصل محرک وہ باتیں نہیں جن کا ان لوگوں نے ذکر کیا ہے بلکہ اس انکار کا اصل محرک انکار معاد ہے۔ وہ قیامت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ مجرم اپنے جرم پر کسی عدالت و محاسبہ کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ جب ان کے نزدیک یوم حساب نہیں ہے، عذاب و ثواب نہیں ہے، جنت و نار نہیں ہے تو قانون، شریعت اور رسالت بے معنی ہو جاتی ہے۔

۲۔ اِذَا رَاَتۡہُمۡ: جب جہنم ان مجرموں کو دیکھ لے گی تو غیض و غضب میں آئے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ کی طرح بے شعور نہیں بلکہ مجرموں کو شعور و آگہی کے ساتھ قصداً جلا

دے گی جیسا کہ جب جہنم سے خطاب ہوا: ہَلِ امۡتَلَاۡتِ کیا تو بھر گئی تو اس نے جواب میں کہا: ہَلۡ مِنۡ مَّزِیۡدٍ [1]

۳۔ وَ اِذَاۤ اُلۡقُوۡا مِنۡہَا: جب یہ مجرم لوگ زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کی تنگ جگہ پر ڈال دیے جائیں گے تو وہ موت کو پکاریں گے۔ جہنم کے عذاب میں سے ایک عذاب تنگی ہے جیسا کہ جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت وسعت ہے۔

۴۔ لَا تَدۡعُوا: ان سے کہا جائے گا ایک موت کو نہیں بلکہ بے شمارا موات کو پکارو۔ ہر آن موت اور مسلسل موت کی سی شدت میں رہیں گے اور جہنم میں پیش آنے والی موت کے بعد خلاصی نہ ہو گی بلکہ ہر وقت موت جیسا عذاب ہو گا۔ چنانچہ:

کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا ... [2]	جب بھی ان کی کھالیں گل جائیں گی (ان کی جگہ) ہم دوسری کھالیں پیدا کریں گے۔

سے واضح ہے۔

اہم نکات

۱۔ جہنم قصد و ارادے سے بحکم خدا عذاب دے گی۔

۲۔ ہر مصیبت سے موت کے بعد آزادی ملتی ہے سوائے جہنم کے۔ یہاں ہر وقت موت ہے۔

قُلۡ اَذٰلِکَ خَیۡرٌ اَمۡ جَنَّۃُ الۡخُلۡدِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ کَانَتۡ لَہُمۡ جَزَآءً وَّ مَصِیۡرًا ﴿۱۵﴾	۱۵۔ کہد یجیے: کیا یہ مصیبت بہتر ہے یا دائمی جنت جس کا اہل تقویٰ سے وعدہ کیا گیا ہے، جو ان کے لیے جزا اور ٹھکانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَذٰلِکَ خَیۡرٌ: کہد یجیے یہ جہنم بہتر ہے یا دائمی جنت؟ یہ سوال منکر کے ضمیر اور وجدان سے ہے کہ اگرچہ تو جہنم و جنت کا منکر ہے تاہم یہ انکار خود تیرے حق میں نہیں ہے۔ تو خود سوچ، اگر جنت و نار برحق ثابت ہوئی تو تیرے لیے کون سی چیز بہتر ہے جنت یا نار؟

۲۔ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ: وہ دائمی جنت جس کا اہل تقویٰ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ زندگی کے راستے پر سوئے منزل جاتے ہوئے جو لوگ اپنے آپ کو خطرات سے بچاتے ہیں: اَلۡمُتَّقُوۡنَ، وہی منزل پر فائز ہوتے ہیں۔

---

[1] ۵۰ ق: ۳۰ [2] ۴ نساء: ۵۶

۳۔ کَانَتۡ لَہُمۡ جَزَآءً وَّ مَصِیۡرًا: ثواب اور مکان ثواب، دونوں کا ذکر ہے چونکہ صرف ثواب اور نعمت کافی نہیں ہوتی جب تک مکان کشادہ، پرکشش، پرفضا نہ ہو۔

لَہُمۡ فِیۡہَا مَا یَشَآءُوۡنَ خٰلِدِیۡنَ ؕ کَانَ عَلٰی رَبِّکَ وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا ﴿۱۶﴾

۱۶۔ وہاں ان کے لیے ہر وہ چیز جسے وہ چاہیں گے موجود ہو گی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ لازمی وعدہ آپ کے پروردگار کے ذمے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَہُمۡ فِیۡہَا مَا یَشَآءُوۡنَ: وہاں ان بچاؤ کرنے والوں، الۡمُتَّقُوۡنَ کی ہر خواہش پوری ہو گی۔ جنت کی سب سے بڑی نعمت اللہ کی خوشنودی ہو گی۔ لہٰذا جنت کی تمام خواہشات خوشنودی رب کے تابع ہوں گی۔ وہی چاہیں گے جو اللہ چاہتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جنت میں جنتی کا ارادہ نافذ ہو گا۔ کسی چیز کے چاہنے سے وہ چیز مل جائے گی۔ دنیا میں کسی چیز کے ملنے کے لیے علل و اسباب کا ایک سلسلہ عبور کرنا پڑتا ہے۔ جنت میں ایسا نہ ہو گا۔

۲۔ خٰلِدِیۡنَ: جنت کی حیات دائمی ہے جس میں رہنے والے کی ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش پوری ہو جائے گی۔

۳۔ کَانَ عَلٰی رَبِّکَ وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا: وعدہ جنت کو پورا کرنا اللہ پر واجب ہے۔ کسی نے اللہ پر واجب نہیں کیا بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر لازم قرار دیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ...۔[1]		تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔

یہاں بھی ایسا ہی ہے اللہ نے خود لازم قرار دیا ہے کیونکہ وعدہ خلافی قبیح ہے اور اللہ سے قبیح عمل صادر نہیں ہو سکتا۔

اہم نکات

۱۔ جنت کی خواہشات رضائے رب کے مطابق ہوں گی۔

۲۔ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُہُمۡ وَ مَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَقُوۡلُ ءَاَنۡتُمۡ

۱۷۔ اور اس دن اللہ، ان لوگوں کو اور اللہ کو چھوڑ کر جن معبودوں کی یہ لوگ پوجا کرتے تھے ان

---

[1] ۶ انعام: ۵۴

اَضۡلَلۡتُمۡ عِبَادِیۡ هٰۤؤُلَآءِ اَمۡ هُمۡ ضَلُّوا السَّبِیۡلَ ﴿۱۷﴾

کو (بھی) جمع کرے گا اور پھر فرمائے گا: کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود گمراہ ہوئے تھے؟

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُهُمۡ: قیامت کے دن اللہ ان کافروں کو ان کے معبودوں کے ساتھ جمع کرے گا پھر معبودوں سے سوال ہو گا: کیا میرے بندوں کو اپنی عبادت کی دعوت دے کر تم نے گمراہ کیا ہے یا خود گمراہ ہوئے؟ واضح رہے مشرکین کے اصل مذہب میں بت خود معبود نہیں تھے بلکہ ان کے معبودوں کے شبیہ تھے۔ بعد میں مذہب شرک میں بھی انحراف آیا اور خود بتوں کو معبود سمجھنے لگے۔

قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ مَا کَانَ یَنۡۢبَغِیۡ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَّخِذَ مِنۡ دُوۡنِکَ مِنۡ اَوۡلِیَآءَ وَ لٰکِنۡ مَّتَّعۡتَهُمۡ وَ اٰبَآءَهُمۡ حَتّٰی نَسُوا الذِّکۡرَ ۚ وَ کَانُوۡا قَوۡمًۢا بُوۡرًا ﴿۱۸﴾

۱۸۔ وہ کہیں گے: پاک ہے تیری ذات ہمیں تو حق ہی نہیں پہنچتا کہ ہم تیرے سوا کسی کو اپنا ولی بنائیں لیکن تو نے انہیں اور ان کے باپ دادا کو نعمتیں عطا فرمائیں یہاں تک کہ یہ لوگ (تیری) یاد کو بھول گئے اور یہ ہلاکت میں پڑنے والے لوگ تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ مِنۡ دُوۡنِکَ مِنۡ اَوۡلِیَآءَ: سوال غیر اللہ کے معبود بننے سے متعلق تھا۔ جواب غیر اللہ کو ولایت کا حق دینے کے بارے میں آیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ معبود وہ ہوتا ہے جس کے قبضے میں اس کی ولایت ہوتی ہے۔ یعنی خود سے زیادہ اسے تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ وَ لٰکِنۡ مَّتَّعۡتَهُمۡ: جواب میں کہا: ہم نے انہیں گمراہ نہیں کیا بلکہ خواہش پرستی نے ان کو حقیقی معبود سے دور کیا۔ کہا: اے اللہ! تو نے انہیں نعمتیں دیں، یہ سرکش ہو گئے۔ واضح رہے اللہ ایسے لوگوں کو نعمتیں دے کر ڈھیل دیتا ہے جو قابل ہدایت نہیں ہوتے۔ سرکش لوگوں کے لیے یہ ڈھیل بڑا عذاب ہے۔

اہم نکات

۱۔ سرکشی کے باوجود نعمتوں کا وفور عذاب الٰہی ہے۔

فَقَدۡ کَذَّبُوۡکُمۡ بِمَا تَقُوۡلُوۡنَ ۙ فَمَا تَسۡتَطِیۡعُوۡنَ صَرۡفًا وَّ لَا نَصۡرًا ۚ وَ مَنۡ یَّظۡلِمۡ مِّنۡکُمۡ نُذِقۡہُ عَذَابًا کَبِیۡرًا ﴿۱۹﴾

۱۹۔ پس انہوں (تمہارے معبودوں) نے تمہاری باتوں کو جھٹلایا لہٰذا آج تم نہ تو عذاب کو ٹال سکتے ہو اور نہ ہی کوئی مدد حاصل کر سکتے ہو اور تم میں سے جو بھی ظلم کرے گا ہم اسے بڑا عذاب چکھا دیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَقَدۡ کَذَّبُوۡکُمۡ: تمہارے معبودوں نے تمہاری تکذیب کی ہے کہ انہوں نے اپنی عبادت کے لیے تمہیں دعوت نہیں دی۔ جس ذات سے آج تمہیں مدد مل سکتی تھی اور عذاب کو جو ٹالا جا سکتا تھا اس کی تم نے عبادت نہیں کی اور جن کی تم نے عبادت کی ہے وہ آج تم سے بیزار ہیں۔ لہٰذا عذاب کا مزہ چکھنے کے علاوہ تمہارے سامنے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہادیان برحق کی اسی لیے ضرورت ہے کہ وہ غیر اللہ سے امیدیں وابستہ رکھنے سے باز رکھتے ہیں اور صرف اللہ سے مربوط رکھتے ہیں۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّاۤ اِنَّہُمۡ لَیَاۡکُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَ یَمۡشُوۡنَ فِی الۡاَسۡوَاقِ ؕ وَ جَعَلۡنَا بَعۡضَکُمۡ لِبَعۡضٍ فِتۡنَۃً ؕ اَتَصۡبِرُوۡنَ ۚ وَ کَانَ رَبُّکَ بَصِیۡرًا ﴿۲۰﴾ ع ۲

۲۰۔ اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجے تھے وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنا دیا کیا تم صبر کرتے ہو؟ اور آپ کا پروردگار تو خوب دیکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ: منکرین کا جو اعتراض تھا: یہ کیسے رسول ہیں جو کھانا کھاتے ہیں اور بازاروں میں پھرتے ہیں، اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اے رسولؐ! آپ پہلے رسول نہیں ہیں جو کھاتے اور پھرتے ہوں:

قُلۡ مَا کُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ ...[1] کہد یجیے: میں رسولوں میں انوکھا (رسول) نہیں ہوں۔

[1] ۴۶ احقاف: ۹

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ بعض انبیاء کو تسلیم کرتے تھے، جیسے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل علیہم السلام ہیں۔ مشرکین ان انبیاء علیہم السلام کو تسلیم کرنے کے باوجود معاد پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے یہ جواب دیا گیا کہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یہ اعتراض کیوں اٹھاتے ہو۔

۲۔ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً: ہم نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنا دیا ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے لیے کفار آزمائش ہیں کہ وہ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ ان مظالم کے وجہ سے کھرے اور کھوٹے الگ ہو جاتے ہیں۔

کفار کے لیے رسول اور مومنین آزمائش ہیں کہ ان کے پاس نہ مال و دولت ہے، نہ طاقت و اقتدار ہے۔ غریبوں کی ایک ناقابل توجہ جماعت اس رسول کے گرد جمع ہے جن کے جسم سے بدبو آتی ہے۔ ذہنوں میں یہ تصور آتا ہے کہ کیا مالک ارض و سماء کی طرف سے یہ لوگ نمائندگی کر رہے ہیں؟ اگر یہ رسولؐ، اللہ کی طرف سے ہوتا تو اللہ کی طرف سے کوئی خزانہ کیوں نہیں ملتا؟

یہ ناداں لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اگر رسولؐ کے پاس خزانے ہوتے تو سب سے پہلے مفاد پرستوں کا ایک ٹولہ اس دین کا وارث بن جاتا۔

۳۔ اَتَصْبِرُوْنَ: کیا تم صبر کرو گے؟ یہ سوال مومنوں سے ہے کہ کیا تم اس آزمائش پر صبر کرو گے؟ چونکہ کافروں نے تو اس آزمائش میں ناکام ہونا ہے۔ کامیابی کا امکان صرف مومنوں کی طرف ہے لہٰذا صبر کی توقع بھی صرف انہی سے ہے۔

اہم نکات

۱۔ دین کی بنیاد کڑی سی کڑی آزمائشوں میں ہے، آسائشوں میں نہیں۔

۲۳ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں: ہم پر فرشتے کیوں نازل نہیں کیے گئے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھ لیتے؟ یہ لوگ اپنے خیال میں خود کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور بڑی حد تک سرکش ہو گئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا: مشرکین معاد اور اللہ کے سامنے حساب دینے کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی زندگی قیامت، ثواب و عقاب کی بنیاد پر نہیں گزارتے تھے۔ وہ اگر کسی کو معبود بناتے تھے تو اس

سے اپنی دنیوی حوائج کی توقع رکھتے تھے۔ انکار معاد کی بنیاد پر وہ انکار رسالت کرتے تھے۔

۲۔ لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ: ان کا ایک اعتراض یہ تھا: اگر ایک بشر رسول بن سکتا ہے، اس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں تو ہم بھی بشر ہیں، ہم پر فرشتے نازل کیوں نہیں ہوتے یا فرشتے ہم پر نازل ہو کر کیوں نہیں کہتے: محمد صلی اللہ علیہ و آلہ برحق رسول ہیں؟

۳۔ اَوۡ نَرٰی رَبَّنَا: یا ہم اپنے رب اللہ کو کیوں نہیں دیکھ سکتے کہ ہم سے بھی بالمشافہ بات کرے یا بتا دے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ برحق ہیں؟

۴۔ لَقَدِ اسۡتَکۡبَرُوۡا: ان بے حیثیت لوگوں نے اس قدر تکبر کیا کہ اپنے آپ کو فرشتوں کے نزول کا اہل سمجھنے لگے۔

۵۔ وَ عَتَوۡ عُتُوًّا کَبِیۡرًا: اور یہ کہہ کر ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھ سکتے، بڑی سرکشی کی ہے کہ اللہ کے بارے میں یہ خیال کہ وہ انسان کے حاسہ بصر کے احاطے میں آ سکتا ہے، شان الٰہی میں بڑی گستاخی ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کا تصور راسخ نہ ہو تو سرکشی آجاتی ہے۔

یَوۡمَ یَرَوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشۡرٰی یَوۡمَئِذٍ لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ وَ یَقُوۡلُوۡنَ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا ﴿۲۲﴾

۲۲۔ جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو ان مجرموں کے لیے مسرت کا دن نہ ہو گا اور وہ (فرشتے) کہیں گے: (تمہارے لیے مسرت) حرام ممنوع ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَوۡمَ یَرَوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ: وہ دنیا میں فرشتوں کے نزول کی توقع رکھتے ہیں۔ البتہ ان کا فرشتوں سے واسطہ پڑنے والا ہے ان کی قبض روح یا جہنم کی طرف ہانکنے کے لیے۔ جب یہ مشرکین فرشتوں کو دیکھیں گے تو ان مجرموں کو کوئی مسرت نہ ہو گی۔

۲۔ وَ یَقُوۡلُوۡنَ: فرشتے ان مجرموں سے کہہ رہے ہوں گے۔ تمہارے لیے آج ہر قسم کی مسرت حرام ممنوع ہو گئی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یَقُوۡلُوۡنَ کا تعلق مجرموں سے ہے کہ خود مجرمین کہیں گے: ہمارے لیے مسرت حرام ممنوع ہے۔ یہاں فرشتوں سے واسطہ پڑنے کا ذکر ہے لیکن اللہ کے قیامت کے دن نظر آنے کا ذکر نہیں ہے چونکہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ کفار کی طرف سے دو باتیں اٹھائی گئیں: ایک یہ کہ ہم پر فرشتے نازل کیوں نہیں ہوتے؟ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا کہ ان کو فرشتوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔

۲۴

دوسری بات کفار نے یہ کی کہ ہم اللہ کو کیوں نہیں دیکھ پاتے؟ اس کے جواب میں مثلاً یہ نہیں فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کو دیکھنے کا وقت آئے گا تو کافر لوگ اللہ کی زیارت نہیں کر سکیں گے بلکہ جواب میں فرمایا: عَتَوۡ عُتُوًّا کَبِیۡرًا اللہ کو دیکھنے کی توقع رکھ کر ان لوگوں نے بڑی گستاخی کی ہے۔

۳۔ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا: الحجر ممنوع کو کہتے ہیں:

وَ قَالُوۡا ہٰذِہٖۤ اَنۡعَامٌ وَّ حَرۡثٌ حِجۡرٌ ...[1] اور یہ کہتے ہیں: یہ جانور اور کھیتی ممنوع ہیں۔

عربوں میں یہ جملہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب حرمت کے مہینوں میں کسی کی طرف سے حملے کا خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ الامان کی جگہ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا کہتے ہیں۔ ان مہینوں میں قتال حرام ممنوع ہے۔

اہم نکات

۱۔ مجرمین پر فرشتے نازل ہوں گے مگر عذاب لے کر۔

وَ قَدِمۡنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰہُ ہَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا ﴿۲۳﴾

۲۳۔ پھر ہم ان کے کیے ہوئے عمل کی طرف توجہ کریں گے اور ان کے کیے ہوئے عمل کو اڑتی ہوئی خاک بنا دیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَدِمۡنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوۡا: مشرک ایک مجرم ہے۔ اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ عمل کرنے والا مجرم ہے تو اس کے عمل میں کوئی خوبی نہیں آتی۔ جس شخص میں ایمان نہیں اس میں کوئی خوبی نہیں تو اس کے عمل میں بھی کوئی خوبی نہ ہو گی۔

۲۔ ہَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا: ہَبَآءً ان ذروں کو کہتے ہیں جو روشندانوں سے آنے والی سورج کی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ مشرکین کے اعمال خاک کے ان ذروں کی طرح نابود ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ عمل میں حسن کا دار و مدار عمل کنندہ میں موجود حسن پر ہے۔

اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ یَوۡمَئِذٍ خَیۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا وَّ اَحۡسَنُ مَقِیۡلًا ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اہل جنت اس دن بہترین ٹھکانے اور بہترین سکون کی جگہ میں ہوں گے۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۳۸

تشریح کلمات

مَقِیۡلًا : (ق ی ل) استراحت کی جگہ۔ مجمع البیان میں آیا ہے: عربوں میں قیلولہ، دوپہر کے آرام کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن اہل جنت بہترین مستقر میں ہوں گے۔ مستقر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں آپس کی گفتگو کے لیے اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور مَقِیۡلًا دوپہر کے آرام کو کہتے ہیں۔ دنیا میں تو قیلولہ دوپہر کی نیند کو کہتے ہیں جنت میں چونکہ نیند نہیں لہٰذا یہاں قیلولہ سے مراد آرام ہے۔

وَ یَوۡمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالۡغَمَامِ وَ نُزِّلَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ تَنۡزِیۡلًا ﴿۲۵﴾

۲۵۔اوراس دن آسمان ایک بادل کے ذریعے پھٹ جائے گااور فرشتے لگاتار نازل کیے جائیں گے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ یہ مشرکین کے اس خرافاتی عقیدے کی رد ہے جس میں وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادلوں سے ظاہر ہوں گے اور ان کو حق کی طرف بلائیں گے۔ چنانچہ سورہ بقرہ آیت ۲۱۰ میں فرمایا:

هَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ....

کیا یہ لوگ منتظر ہیں کہ خود اللہ بادلوں کے سائبان میں ان کے پاس آئے اور فرشتے بھی اتر آئیں۔

اس آیت میں فرمایا: قیامت کے دن جب آسمان پھٹ جائے گا تو اللہ تو نہیں آئے گا، فرشتے نازل ہوں گے۔ یہ بات اپنی جگہ قرآنی تعلیمات میں واضح ہے کہ قیامت کے دن کائنات دگرگوں ہو جائے گی۔

فَاِذَا انۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتۡ وَرۡدَۃً کَالدِّهَانِ ۝ [1]

پس جب آسمان پھٹ جائے گا تو سرخ ہو جائے گا جیسے سرخ چمڑا۔

اَلۡمُلۡکُ یَوۡمَئِذِ ۣالۡحَقُّ لِلرَّحۡمٰنِ ؕ وَ کَانَ یَوۡمًا عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ عَسِیۡرًا ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اس دن سچی بادشاہی صرف خدائے رحمٰن کی ہو گی اور کفار کے لیے وہ بہت مشکل دن ہو گا۔

---

[1] ۵۵ رحمٰن: ۳۷

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡمُلۡکُ یَوۡمَئِذِ: قیامت کے دن وہ تمام علل و اسباب معطل ہو جائیں گے جن کے ذریعے دنیا میں لوگ تسلط قائم کرتے تھے۔ وہاں صرف اور صرف ارادۂ الٰہی نافذ ہو گا۔ اس طرح اس دن صرف اللہ تعالیٰ کی بادشاہی ہو گی۔

اَلۡمُلۡکُ موصوف، الۡحَقُّ صفت ہے۔ ترتیب کلام اس طرح ہے: الملك الحق یومئذ للرحمٰن۔

۲۔ وَ کَانَ یَوۡمًا عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ عَسِیۡرًا: جب تمام اسباب، وسائل معطل ہو جائیں گے اور صرف اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنا ہو گا تو کفار کے لیے ایسے حالات سے سخت دن قابل تصور نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ جب قیامت کے دن صرف ارادۂ الٰہی نافذ ہو گا تو دنیا میں ارادۂ الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے قیامت سخت ترین دن ہو گا۔

۲۷ وَ یَوۡمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیۡهِ یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِی اتَّخَذۡتُ مَعَ الرَّسُوۡلِ سَبِیۡلًا ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا: کاش میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔

یٰوَیۡلَتٰی لَیۡتَنِیۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِیۡلًا ﴿۲۸﴾

۲۸۔ ہائے تباہی! کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔

لَقَدۡ اَضَلَّنِیۡ عَنِ الذِّکۡرِ بَعۡدَ اِذۡ جَآءَنِیۡ ؕ وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اس نے مجھے نصیحت سے گمراہ کر دیا جب کہ میرے پاس نصیحت آ چکی تھی اور انسان کے لیے شیطان بڑا ہی دغا باز ہے۔

تشریح کلمات

یَعَضُّ: (ع ض ض) کسی چیز کو دانت سے پکڑ لینا یا کاٹنا۔

شان نزول: روایات میں آیا ہے:

امیہ بن خلف کے ساتھ عقبہ کی دوستی تھی۔ عقبہ ایمان لے آیا تو امیہ نے کہا: اگر تو محمد کی

پیروی کرتا ہے تو میں روبرو نہ ہوں گا جس پر عقبہ مرتد ہو گیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

شان نزول خواہ خاص ہو، قرآن کے اطلاق میں ہر ظالم شامل ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيَوۡمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيۡهِ: قیامت کے دن ظالم ندامت سے اپنا ہاتھ کاٹے گا۔

۲۔ يٰلَيۡتَنِى اتَّخَذۡتُ مَعَ الرَّسُوۡلِ سَبِيۡلًا: کاش رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔ راستہ، سبیل سے مراد سبیل رسول اسلامؐ ہے یا مطلق تعلیمات ہیں۔ دوسری صورت وہ لوگ اس میں شامل ہو جائیں گے جو کلمہ پڑھنے کے باوجود زندگی میں اسلامی احکام کو اعتنا میں نہیں لاتے۔

۳۔ يٰوَيۡلَتٰى لَيۡتَنِىۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِيۡلًا: خلیل یعنی دوست۔ وہ دوست جس نے اسے گمراہ کیا اس کا نام لے کر کہے گا: کاش میں نے اسے اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔

۴۔ لَقَدۡ اَضَلَّنِىۡ: اسی دوست نے مجھے الذِّكۡرِ سے گمراہ کر دیا۔ الذِّكۡرِ سے مراد قرآن ہو سکتا ہے یا مطلق تعلیمات رسولؐ۔

۵۔ وَكَانَ الشَّيۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا: یہ اس گمراہ کا قول نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ شیطان انسان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ جب وہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ اس سے بیزار ہوتا ہے:

كَمَثَلِ الشَّيۡطٰنِ اِذۡ قَالَ لِلۡاِنۡسَانِ اكۡفُرۡ ۚ شیطان کی طرح جب اس نے انسان سے کہا: کافر ہو جا!

فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّنۡكَ ....[1] پھر جب وہ کافر ہو گیا تو کہنے لگا: میں تجھ سے بیزار ہوں.

اہم نکات

۱۔ برے دوستوں سے بچنا چاہیے۔

۲۸

وَقَالَ الرَّسُوۡلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِى اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا ۝۳۰

۳۰۔ اور رسول کہیں گے: اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو واقعی ترک کر دیا تھا۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن جہاں گمراہ لوگ اپنے کیے پر نادم ہوں گے وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارگاہ الٰہی میں ان مجرموں کے جرم سے متعلق جو بنیادی مسئلہ اٹھائیں گے وہ قرآن کو متروک کرنا ہو گا۔ اے

---

[1] ۵۹ حشر: ۱۶

اللہ! جو دستور حیات آپ نے انسانوں کے لیے عنایت فرمایا تھا اسے ان لوگوں نے قابل اعتنا نہ سمجھا اور اس کی جگہ انسان کے خود ساختہ دستور پر عمل کرنے اور اس کے مطابق فیصلے کرنے کو قابل فخر سمجھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

فَاِذَا الْتَبَسَتْ عَلَيْكُمُ الْفِتَنُ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ فَعَلَيْكُمْ بِالْقُرْآنِ...[1] فتنے اگر رات کی تاریکیوں کی طرح تم پر چھا جائیں تو قرآن کو اپناؤ۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝۳۱

۳۱۔ اور اس طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرمین میں سے بعض کو دشمن بنایا ہے اور ہدایت اور مدد دینے کے لیے آپ کا پروردگار کافی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا: ہر نبی کے لیے مجرمین میں سے ہم نے دشمن بنایا۔ جَعَلْنَا ہم نے بنایا کا مطلب ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ اور روش کلی یہ ہے کہ حق اور باطل میں سے ہر ایک کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ نہ حق کی جانبداری میں طاقت استعمال فرماتا ہے، نہ باطل کو حق قبول کرانے کے لیے طاقت کو ذریعہ بناتا ہے۔ اس طرح اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ہر نبی کے مقابلے اس کے دشمن کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس موقع دینے کو جَعَلْنَا فرمایا ہے۔ فافهم ذلك.

۲۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا: ان کی دشمنی سے آپؐ کی رسالت متاثر نہ ہو گی کیونکہ هَادِيًا ہدایت دینے کے لیے اللہ کافی ہے۔ اسی کی طرف سے ہدایت مل جاتی ہے۔ وَّنَصِيْرًا نصرت و یاری کے لیے بھی اللہ کافی ہے جو آپؐ اور آپ کے دین کی مدد کرے گا۔ یہ عدو اگر آپؐ سے دشمنی کرتے ہیں تو آپؐ ان سے بے نیاز ہیں۔ جس کا مددگار اللہ ہو اس سے زیادہ بے نیاز اور کون ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ جس کا ہادی اور نصیر اللہ ہو اسے دشمن کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ

۳۲۔ اور کفار کہتے ہیں: اس (شخص) پر قرآن یکبارگی نازل کیوں نہیں ہوا؟ (بات یہ ہے کہ)

[1] الکافی ۲: ۵۹۸

كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾	اس طرح (آہستہ اس لیے اتارا) تاکہ اس سے ہم آپ کے قلب کو تقویت دیں اور ہم نے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سنایا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: کفار کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ قرآن اگر اللہ کی طرف سے ہوتا تو توریت، انجیل اور زبور کی طرح دفعتاً نازل ہوتا۔ تدریجی نزول کا مطلب یہ ہے کہ موقع محل کی مناسبت سے محمد ﷺ کے لیے خود بنا کر جوڑ دینا ممکن ہو جاتا ہے۔

جواب: اول تو یہ بات درست نہیں کہ کتب آسمانی دفعتاً نازل ہوتی رہی ہیں۔ سابقہ کتب بھی تدریجاً نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ توریت اٹھارہ سالوں میں نازل ہوئی۔ خود توریت کی صریح عبارت اس پر شاہد ہے۔[۱]

ثانیاً: قرآن ایک امت کی تربیت اور ایک معاشرے کی بنیاد رکھنے کے لیے نازل ہوا ہے۔ ایک ناخواندہ قوم کی تربیت، جدید مطالب کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے ان تعلیمات کو اس وقت بیان کرنا ضروری تھا جب اس کی ضرورت پیش آتی۔ ضرورت کے بعد بیان شدہ تعلیمات ذہنوں میں بہتر طریقے سے راسخ ہو جاتی ہیں۔ ان تعلیمات کو ناخواندہ قوم میں رائج کرنا دفعتاً ایک کتاب کے پڑھانے سے ممکن نہ تھا۔ اس عظیم انقلاب کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے فطرت سے ہم آہنگ تدریجی قدم اٹھانا ضروری تھا۔

۲۔ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ: قرآن کے تدریجی نزول میں قلب رسولؐ کی تقویت مطلوب ہے۔ تدریجی نزول سے بار رسالت کی سنگینی اٹھانے اور اس کے درجہ بدرجہ وقتاً فوقتاً نفاذ میں آسانی آ جاتی ہے۔ خود قرآن فرماتا ہے بار رسالت سنگین ہے:

اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ...[۲]	عنقریب آپ پر ہم ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں.

ہر مشکل مرحلے میں وحی کے ذریعے اللہ سے رابطہ قائم ہونے سے قلب رسولؐ کو تقویت ملتی ہے۔ قانون و شریعت کے ضرورت کے موقع پر نفاذ سے امت کے دلوں میں جدید قانون اس طرح دل نشین ہوتے ہیں جس طرح طب کے طالب علم کو تشریح کے موقع پر آپریشن کا طریقہ سمجھایا جائے تو دل نشین ہوتا ہے۔

۳۔ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا: اسی لیے تدریجی حکمت عملی کو اختیار کرتے ہوئے فرمایا: ہم نے ٹھہر ٹھہر کر اس قرآن کو پڑھ کر سنایا ہے۔

---

[۱] تفسیر المراغی ۱۹: ۱۲ [۲] ۷۳ مزمل: ۵

وَلَا یَاۡتُوۡنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَ اَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور یہ لوگ جب بھی آپ کے پاس کوئی مثال لے کر آئیں تو ہم جواب میں آپ کو حق کی بات اور بہترین وضاحت سے نوازتے ہیں۔

تفسیر آیات

مَثَل: کا مطلب یہ ہے کہ منکرین دلیل و حجت کے طور پر ایسی مثالیں اور نظیریں پیش کرتے ہیں جن سے آپؐ کی نبوت کو مخدوش کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم ان مثالوں کو ان کے لیے حجت اور دلیل بننے نہیں دیتے اور ان کی ان باطل مثالوں اور دلیلوں کے مقابلے میں وہ دلیل پیش کرتے ہیں جو حق پر مبنی ہے اور ایسی بہتر تفسیر پیش کرتے ہیں جس سے باطل کے چہرے سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ ''تفسیر'' کشف المغطی پردہ اٹھانے کو کہتے ہیں۔

اِنۡزَال اور تَنۡزِیۡل میں فرق: اگرچہ یہ بات مشہور ہے کہ انزل دفعۃً نازل کرنے اور تنزیل تدریجاً نازل کرنے کے معنوں میں ہے مگر قرآنی استعمالات میں اس معنی کا التزام نہیں ہے۔ چند مثالیں:

وَ قَالُوۡا لَوۡ لَا نُزِّلَ عَلَیۡہِ اٰیَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ۔[۱] اور وہ کہتے ہیں: اس (نبی) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ نازل کیوں نہیں ہوا؟

اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَۃً ...[۲] اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایسی نشانیاں نازل کر دیں.

وَ لَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ کِتٰبًا فِیۡ قِرۡطَاسٍ فَلَمَسُوۡہُ بِاَیۡدِیۡہِمۡ ...[۳] اور (اے رسول) اگر ہم کاغذ پر لکھی ہوئی کوئی کتاب (بھی) آپ پر نازل کرتے....

ان آیات میں اٰیَۃً اور کِتٰبًا ایک معجزے، ایک کتاب کے لیے نُزِّلَ استعمال ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایک چیز دفعۃً آ سکتی ہے۔

اس موضوع پر سب سے واضح آیت یہی زیر بحث آیت ہے جس میں دفعۃً نازل کرنے کے لیے نُزِّلَ استعمال ہوا ہے۔

لہٰذا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے باب افعال اور باب تفعیل کی دیگر خاصیتوں کی طرف توجہ کر کے آیات میں پوشیدہ نکات کا استنباط کرنا چاہیے بشرطیکہ سیاق آیت اجازت دے۔

اہم نکات

۱۔ خود قرآن میں قلب رسولؐ کی تقویت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

---

[۱] ۶ انعام: ۳۷ [۲] ۲۶ شعراء: ۴ [۳] ۶ انعام: ۷

۲۔ تعلیم و ارتقاء تدریجاً ممکن ہے۔ یہی طریقۂ قدرت ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یُحۡشَرُوۡنَ عَلٰی وُجُوۡہِہِمۡ اِلٰی جَہَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۳۴﴾ ع

۳۴۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے، ان کا ٹھکانا بہت برا ہے اور وہ راہ حق سے بہت ہی دور ہو گئے ہیں۔

تفسیر آیات

ا۔ یُحۡشَرُوۡنَ: کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ یہاں حشر علی الوجوہ کی تشریح میں مفسرین کے کلمات میں بہت اضطراب ہے کہ منہ کے بل جمع کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ بظاہر حشر اپنے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ یعنی یحشرون الی جھنم ان کو جہنم میں جمع کیا جائے گا اور جہنم میں منہ کے بل دھکیلے جائیں گے۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ جَعَلۡنَا مَعَہٗۤ اَخَاہُ ہٰرُوۡنَ وَزِیۡرًا ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت فرمائی اور ان کے بھائی ہارون کو مددگار بنا کر ان کے ساتھ کر دیا۔

تفسیر آیات

تاریخ انبیاء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحریک کو صدر مقام حاصل ہے۔ اس لیے اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دو اہم چیزوں کا ذکر ہے۔ ایک کتاب عنایت کرنے کا اور دوسرا ایک وزیر اور مددگار فراہم کرنے کا۔ اس وزیر اور مددگار کو اَخَاہُ اپنے ہی خاندان سے قرار دیا۔

فَقُلۡنَا اذۡہَبَاۤ اِلَی الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ فَدَمَّرۡنٰہُمۡ تَدۡمِیۡرًا ﴿۳۶﴾

۳۶۔ پھر ہم نے کہا: تم دونوں اس قوم کی طرف جاؤ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے، چنانچہ ہم نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب سے موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے دو اہم نکتے بیان فرما رہا ہے: ہم نے موسیٰ و ہارون سے کہا: اس قوم کی تنبیہ کے لیے قدم اٹھاؤ۔ جس نے بعد میں ہماری آیات کی تکذیب کی۔ پھر ہم نے

اس قوم کو تباہ کر دیا۔

کَذَّبُوْا اور دمرنا، صیغہ ماضی حال نزول کے اعتبار سے ہے، حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ملنے کے وقت کے اعتبار سے نہیں۔ اس پر قرینہ دمرنا کا جملہ ہے۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿ۚ۳۷﴾

۳۷۔ اور جب قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور انہیں لوگوں کے لیے نشان (عبرت) بنا دیا اور ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قوم نوح کو ہم نے تباہ کر دیا چونکہ وہ بھی رسولوں کی تکذیب کرتے تھے۔ صرف ایک رسول نوح کی نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی جو رسل آئے۔ سب کی تکذیب کرتے تھے۔ یا یہ کہ وہ اصل رسالت کے منکر تھے۔ جس سے سب رسولوں کی تکذیب لازم آتی ہے۔

۲۔ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً: ان کی تباہی آنے والی نسلوں کے لیے عبرت کی ایک علامت بن گئی۔

وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور یہی (حشر) عاد اور ثمود اور اصحاب الرس کا بھی ہوا ہے اور ان کے درمیان بہت سی امتوں کا بھی۔

تفسیر آیات

قوم عاد و ثمود کی تشریح اس سے پہلے سورہ ہائے اعراف، ہود میں ہو چکی۔

اصحاب الرس کون تھے؟

اصحاب الرس کے بارے میں اقوال بہت مختلف اور مضطرب ہیں۔ نہج البلاغۃ میں آیا ہے:

اَيْنَ اَصْحَابُ مَدَائِنِ الرَّسِّ الَّذِينَ قَتَلُوا النَّبِيِّينَ... [۱]

کہاں ہیں اصحاب الرس کے شہروں کے باشندے جنہوں نے نبیوں کو قتل کیا۔

اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے یہاں کئی شہر آباد تھے۔ تفسیر صافی میں قمی سے نقل کیا ہے۔ رَس آزربائیجان کے ایک علاقے کے ایک شہر کا نام ہے۔ محمد عبدہ کے مطابق یہ وہی شہر ہے جسے آج

[۱] نہج البلاغۃ خ ۱۸۲

کل نہر ارس کہتے ہیں۔ اس کے معنی کنویں سے کیے گئے ہیں۔ روایت ہے کہ اس قوم نے اپنے نبی کو کنویں میں پھینک کر قتل کیا تھا۔ والعلم عنداللہ۔

وَکُلًّا ضَرَبۡنَا لَہُ الۡاَمۡثَالَ ۫ وَکُلًّا تَبَّرۡنَا تَتۡبِیۡرًا ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے مثالوں سے سمجھایا اور (آخر میں) سب کو بالکل ہی تباہ کر دیا۔

تفسیر آیات

ان اقوام میں سے ہر ایک کو ہم نے مثالوں سے تنبیہ، نصیحت کی۔ ان پر حجت پوری کی۔ آخر میں ان کی سرکشی پر ان کو تباہ کر دیا۔

وَلَقَدۡ اَتَوۡا عَلَی الۡقَرۡیَۃِ الَّتِیۡۤ اُمۡطِرَتۡ مَطَرَ السَّوۡءِ ؕ اَفَلَمۡ یَکُوۡنُوۡا یَرَوۡنَہَا ۚ بَلۡ کَانُوۡا لَا یَرۡجُوۡنَ نُشُوۡرًا ﴿۴۰﴾

۴۰۔ اور بتحقیق یہ لوگ اس بستی سے گزر چکے ہیں جس پر بدترین بارش برسائی گئی تھی تو کیا انہوں نے اس کا حال نہ دیکھا ہوگا؟ بلکہ (اس کے باوجود) یہ دوبارہ اٹھائے جانے کی توقع ہی نہیں رکھتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اَتَوۡا: اس بستی سے مراد قوم لوط کی بستی ہوسکتی ہے اور بارش سے مراد پتھروں کی بارش ہے۔ ہوسکتا ہے طاقتور لاوہ پھٹنے سے ان پر پتھر کی بارش ہوئی ہو۔ حجاز والے شام جاتے ہوئے قوم لوط کے تباہ شدہ علاقوں سے گزرتے تھے:

وَ اِنَّکُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَیۡہِمۡ مُّصۡبِحِیۡنَ ۙ[1] اور تم دن کو بھی ان (بستیوں) سے گزرتے رہتے ہو۔

۲۔ اَفَلَمۡ یَکُوۡنُوۡا یَرَوۡنَہَا: کیا وہ اس قوم کے عبرت ناک انجام کا مشاہدہ نہیں کرتے رہے۔

۳۔ بَلۡ کَانُوۡا لَا یَرۡجُوۡنَ: وہ اس عبرت ناک انجام کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں لیکن وہ اس سے عبرت نہیں لیتے۔ کیونکہ وہ دوبارہ زندہ ہونے کے قائل نہیں ہیں لہٰذا عبرت کا موضوع منتفی ہے۔

اہم نکات

۱۔ عقیدہ معاد کی کمزوری سے عبرت ناک دروس بھی بے اثر ہوتے ہیں۔

---

[1] ۳۷ صافات ۱۳۷

وَ اِذَا رَاَوۡكَ اِنۡ یَّتَّخِذُوۡنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیۡ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوۡلًا ﴿۴۱﴾

۴۱۔اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق ہی اڑاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کیا یہی وہ شخص ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟

تفسیر آیات

رسول اللہ ﷺ دعوت توحید سے پہلے نہایت قابل احترام اور امین مشہور تھے۔

دعوت توحید کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو مذاق اڑایا جاتا ہے وہ واقعی مذاق نہیں تھا۔ واقع میں ان کے دلوں میں ان کی شخصیت، ان کے خاندان بنی ہاشم اور ان کے چالیس سال تک کردار کے بڑے گہرے اثرات تھے اور آج بھی سوائے دعوت توحید اور بتوں کو مسترد کرنے کے اور کوئی عیب نہ تھا۔ یہ استہزاء درحقیقت ایک سازش کے طور پر مصنوعی استہزاء تھا اس طرح وہ اس دعوت کے اثرات کم کرنا چاہتے تھے۔

اِنۡ كَادَ لَیُضِلُّنَا عَنۡ اٰلِهَتِنَا لَوۡلَاۤ اَنۡ صَبَرۡنَا عَلَیۡهَا ؕ وَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ حِیۡنَ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ مَنۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۴۲﴾

۴۲۔اگر ہم اپنے معبودوں پر ثابت قدم نہ رہتے تو اس (شخص) نے تو ہمیں ان سے گمراہ ہی کر دیا ہوتا اور جب یہ لوگ عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ (صحیح راستے سے) گمراہ کون ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ كَادَ لَیُضِلُّنَا عَنۡ اٰلِهَتِنَا: مشرکین کا یہ کہنا کہ اگر ہم صبر اور مقاومت نہ کرتے تو محمدؐ ہمیں اپنے معبودوں سے گمراہ کرتے، خود دلیل ہے کہ وہ جو مذاق اڑا رہے ہیں ایک سازش کے طور پر ہے۔ دراصل وہ اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ اس دعوت میں جو طاقت ہے اس کا مقابلہ کرنا صبر آزما ہے۔

۲۔ وَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ حِیۡنَ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ: ان کے جواب میں فرمایا: رہا گمراہی کا مسئلہ تو اس کا علم اس وقت ہو جائے گا جب یہ لوگ عذاب کا مشاہدہ کریں گے کہ کون گمراہی میں تھا۔

اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَیۡهِ وَكِیۡلًا ﴿۴۳﴾

۴۳۔کیا آپ نے اس (شخص) کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ کیا آپ اس شخص کے ضامن بن سکتے ہیں؟

تفسیر آیات

جو شخص اپنی خواہشات کو اپنا معبود بناتا ہے، اپنی خواہشات کا تابع ہے وہ اندھا ہوتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کا بندہ ہوتا ہے۔ نفس پرستی اور خواہشات کا بندہ کس قدر خطرناک اور ناقابل ہدایت ہے۔ اس کا اندازہ آیت کے آخری جملے سے ہوتا ہے۔ اَفَاَنۡتَ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِ وَکِیۡلًا کیا آپ ایسے شخص کی ہدایت کا ذمہ لے سکتے ہیں؟

اہم نکات

۱۔ نفس پرست پر ہادی برحق کی ہدایت کا اثر نہ ہوگا۔

اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَکۡثَرَہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ یَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۴۴﴾ ع

۴۴۔ یا کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سننے یا سمجھنے کے لیے تیار ہیں؟ (نہیں) یہ لوگ تو محض جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ لوگ خود عقل سے کام لینے کے قابل نہیں ہیں۔ خود عقل نہیں رکھتے تو کسی عاقل سے حرف حق سننے کے بھی قابل نہیں ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک صورت ہوتی تو ان کا راہ راست پر آنا ممکن تھا۔

۲۔ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا کَالۡاَنۡعَامِ: مذکورہ دونوں صلاحیتوں سے عاری یہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں۔ نہ خود عقل رکھتے ہیں، نہ کسی سے سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

۳۔ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا: بلکہ یہ لوگ چوپاؤں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ چوپائے اپنی غرض خلقت میں ہمیشہ مگن رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ جانور انسان کے لیے مسخر ہیں اور یہ اس تسخیری مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت چرتے رہتے ہیں اور انسان کے لیے گوشت، دودھ وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔ جب کہ سرکش انسان اپنی غرض خلقت سے دور اور اس کے منافی عمل کرتا ہے۔ اس لیے انسان چوپاؤں سے زیادہ گمراہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ نفس پرست کے ظاہری اور باطنی حواس کام نہیں کرتے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْہِ دَلِیْلًا ﴿۴۵﴾

۴۵۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کا پروردگار سائے کو کس طرح پھیلاتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے ساکن بنا دیتا، پھر ہم نے سورج کو سائے (کے وجود) پر دلیل بنا دیا۔

ثُمَّ قَبَضْنٰہُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا ﴿۴۶﴾

۴۶۔ پھر ہم تھوڑا تھوڑا کر کے اسے اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ سورج سائے کے وجود پر دلیل اس لیے ہے کہ سائے کا پھیلنا اور سکڑنا سورج کی مختلف حالتوں سے مربوط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام تخلیق میں جہاں دھوپ کا اہم کردار ہے بلکہ دھوپ ہی سے زندگی ہے وہاں اس حیات آفرین دھوپ سے بچنا بھی پڑتا ہے۔ اس لیے سایہ کی پناہ فراہم فرمائی۔ سایہ کی فراہمی کے لیے اجسام کو سایہ دار بنایا، ورنہ اجسام شفاف ہوتے تو سایہ وجود میں نہ آتا۔

۲۔ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا: اگر اللہ چاہتا تو اس سایہ کو ساکن بنا دیتا۔ اگر سایہ متحرک نہ ہوتا اور آنے جانے کا نظام نہ ہوتا تو ساکن سایہ سے اس نظام میں خلل پڑتا۔ اگر زمین متحرک نہ ہوتی تو سایہ ساکن ہوتا۔ نظام حیات درہم برہم ہوتا۔ نظام حیات میں ہم لوگ سایہ کے اہم کردار سے غافل رہتے ہیں۔

۳۔ ثُمَّ قَبَضۡنٰہُ اِلَیۡنَا: پھر سورج چڑھنے سے تدریجاً سایہ سمٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ اِلَیۡنَا ”ہم اس سایے کو اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں“۔ یہاں اپنی طرف کہنے میں کس نکتے کی طرف اشارہ ہے؟ صاحب المیزان اس جگہ فرماتے ہیں:

> اشیاء کا موجود ہونے کے بعد مفقود ہونا، معدوم ہونا اور مٹ جانا نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف رجوع ہے۔

ممکن ہے اِلَیۡنَا کا اشارہ الی ارادتنا ہو۔ والعلم عند اللّٰہ۔

اہم نکات

۱۔ اس کائنات میں دھوپ اور سایہ کا ہونا اور نہ ہونا دونوں اللہ کے تدبیری نظام کے ستون ہیں۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِبَاسًا وَّ النَّوۡمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّہَارَ

۴۷۔ اور وہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو سکون اور دن کو مشقت کے

نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾　　لیے بنایا۔

تفسیر آیات

۱۔ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِبَاسًا: اس نے تمہاری تنظیم حیات و تدبیر زندگی کے لیے رات کی تاریکی کو بھی اس نظام کا حصہ بنا دیا ہے۔ چنانچہ رات کی تاریکی کا لباس پہنا کر اس مضطرب الحال انسان کو ان چیزوں سے الگ کر دیا جن میں یہ دن بھر مگن رہتا ہے تا کہ اسے سکون اور تھکے ہوئے اعصاب کو آرام مل جائے اور زندگی کی نبرد آزمائی میں ہونے والی ناکامیوں سے خستہ حال انسان دوبارہ بحال ہو جائے۔ اس طرح نیند اعادۂ حیات کے لیے ایک وقتی موت ہے اور ادامہ حیات کے لیے ایک چارجنگ سسٹم ہے۔

۲۔ وَّجَعَلَ النَّہَارَ نُشُوۡرًا: دن کو اس تدبیری نظام میں خود حیات کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ دن کو نُشُوۡرًا سے تعبیر فرمایا۔ نُشُوۡرًا منتشر ہونا، پھیلنا، دوڑ دھوپ کرنا کے معنوں میں ہے اور نشر، حیات اور زندگی کے معنوں میں بھی ہے:

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنۡشَرَہٗ ؀[1]　　پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھالے گا۔

اہم نکات

۱۔ لیل، نوم، نہار، تدبیر حیات کے تین ستون۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِہٖ ۚ وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَہُوۡرًا ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور وہی تو ہے جو ہواؤں کو خوشخبری کے طور پر اپنی رحمت کے آگے آگے بھیجتا ہے اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی برسایا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ الرِّیٰحَ: تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف آیت ۵۷۔

۲۔ مَآءً طَہُوۡرًا: پانی بذات خود پاک ہے اور پاک کنندہ ہے۔ فعول کے وزن پر مبالغہ ہے۔ یعنی پانی پاک کرتا ہے نجاسات اور احداث کو۔ دوسرے لفظوں میں خبث اور حدث دونوں کو دور کرتا ہے۔ پانی سے دھونے سے نجس چیز پاک ہو جاتی ہے اور وضو اور غسل کرنے سے حدث، ناپاکی دور ہو جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ پانی جہاں مایہ حیات ہے وہاں ظاہری و باطنی ناپاکی کو دور کرنے کا ذریعہ ہے۔

[1] ۸۰ عبس: ۲۲

لِّنُحۡیِۦَ بِهٖ بَلۡدَةً مَّیۡتًا وَّ نُسۡقِیَهٗ مِمَّا خَلَقۡنَاۤ اَنۡعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ کَثِیۡرًا ﴿۴۹﴾	۴۹۔ تا کہ ہم اس کے ذریعے مردہ دیس کو زندگی بخشیں اور اس سے اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چوپاؤں اور انسانوں کو سیراب کریں۔

تفسیر آیات

بَلۡدَةً کے بعد میتاً فرمایا جبکہ میتاً، بلدۃ کی صفت ہونے کے اعتبار سے میتۃ ہونا چاہیے تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: چونکہ بَلۡدَةً مکان اور موضع کے معنی میں ہے۔(الکشاف)

بارش سے غیر آباد اراضی آباد ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں بارش زمین کی روح ہے۔ چوپاؤں اور بہت سے انسانوں کو بھی ہم اس بارش کے پانی سے سیراب کرتے ہیں۔

اَنَاسِیَّ کَثِیۡرًا: ''بہت سے انسانوں کو'' کیسے فرمایا؟ جبکہ سب انسان پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔

جواب یہ ہے: انعام اور انسان دونوں ملا کر تعداد کثیر بنتی ہے نیز ممکن ہے: نسقیه سقیا کثیرا ہو، ورنہ کثیرین فرماتے۔

وَ لَقَدۡ صَرَّفۡنٰهُ بَیۡنَهُمۡ لِیَذَّکَّرُوۡا ۫ فَاَبٰۤی اَکۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوۡرًا ﴿۵۰﴾	۵۰۔ اور بتحقیق ہم نے اس (پانی) کو مختلف طریقوں سے ان کے درمیان پھرایا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں مگر اکثر لوگ انکار کے علاوہ کوئی بات قبول نہیں کرتے۔

تفسیر آیات

۱۔ صَرَّفۡنٰهُ: ہم نے اس پانی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا ہے۔ یعنی ہم نے اس پانی کو ان لوگوں کے درمیان گھمایا پھرایا تا کہ ہر ایک کو اپنی ضرورت کے مطابق پانی میسر آئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ پانی کو بخار، بادل اور ہوا کے ذریعے فضا میں اور نہروں اور دریاؤں کے ذریعے زمین میں پھراتا ہے۔

۲۔ لِیَذَّکَّرُوۡا: پانی کو ہم نے ان میں پھرایا تا کہ یہ اللہ کی اس نعمت سے نصیحت حاصل کریں اور شکر ادا کریں لیکن اکثر انسان ناشکرے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ پانی اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے مگر اکثر انسان پانی کی ناقدری کرتے ہیں۔

وَ لَوۡ شِئۡنَا لَبَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ قَرۡیَةٍ	۵۱۔ اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک تنبیہ کرنے

نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾　والا مبعوث کرتے۔

تفسیر آیات

مگر ہم نے آپؐ کو مبعوث کر کے سارے جہاں کے لیے رسول بنایا۔ ہم نے ہر بستی میں تنبیہ کرنے والا رسول نہیں بھیجا۔ ان تمام رسولوں کی جگہ صرف آپؐ کو مبعوث کیا چونکہ صرف آپؐ کی وجہ سے تمام بستیوں کی طرف رسول مبعوث کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی عظمت اور آفاقیت واضح ہو جاتی ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾

۵۲۔ لہٰذا آپ کفار کی بات ہرگز نہ مانیں اور اس قرآن کے ذریعے ان کے ساتھ بڑے پیمانے پر جہاد کریں۔

تفسیر آیات

جب ہم نے آپؐ کو تمام بستیوں کے لیے رسول و نذیر بنا کر بھیجا ہے تو آپؐ کی ذمہ داری بہت سنگین ہو گئی۔ لہٰذا آپؐ اس قرآن کے ذریعے (بہ بالقرآن) بڑے پیمانے پر جہاد شروع کریں۔ جہاد بالسیف نہیں بلکہ جہاد بالقرآن کا حکم ہے۔ قرآنی آیات کی تلاوت اور دلیل و حجت قائم کر کے جہاد کریں۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٥٣﴾

۵۳۔ اور اسی نے دو دریاؤں کو مخلوط کیا ہے، ایک شیریں مزیدار اور دوسرا کھارا کڑوا ہے اور اس نے دونوں کے درمیان ایک حد فاصل اور مضبوط رکاوٹ بنا دی ہے۔

تشریح کلمات

عَذْبٌ : (ع ذ ب) ماء عذبٌ کے معنی خوش گوار اور ٹھنڈا پانی کے ہیں۔

فُرَاتٌ : (ف ر ت) الفرات کے معنی شیریں یا نہایت شیریں پانی کے ہیں۔

اُجَاجٌ : (ا ج ج) الاجاج کے معنی سخت کھارا اور گرم پانی کے ہیں۔

تفسیر آیات

دریا کا میٹھا پانی جب سمندر میں گرتا ہے تو دریا کا پانی سمندر کے تلخ پانی کے درمیان اپنی شیرینی

قائم رکھتا ہے۔ قدرت کا کرشمہ ہے کہ یہ دونوں پانی وزن میں مختلف ہونے کی وجہ سے آپس میں مخلوط نہیں ہوتے۔

کیا اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے:

مؤمن اور منافق، مسلم اور کافر دونوں ایک ہی سرزمین پر زندگی کرنے کے باوجود ایک دوسرے سے ممتاز رہتے ہیں جیسا کہ المیزان کا خیال ہے۔

وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهۡرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيۡرًا ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اور وہی ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا پھر اس کو نسب اور سسرال بنایا اور آپ کا پروردگار بڑی طاقت والا ہے۔

تشریح کلمات

صِهۡرًا: نسب وہ ہے جس سے نکاح حرام ہے اور صهر وہ ہے جس سے نکاح ہو سکتا ہے۔

تفسیر آیات

ایک ہی بوند سے دو مختلف مخلوقات نسب اور سسرال، مرد اور عورت وجود میں آتے ہیں۔ جن کی اصل، نوع ایک ہے اور دونوں کا تعلق ایک بنیاد یعنی انسانیت سے ہے مگر خصوصیات مختلف، نفسیاتی اور جسمانی تقاضے مختلف ہیں۔ اس کے باوجود ایک دوسرے سے متصادم نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے پرکشش ہیں۔ مرد و زن کی خصوصیات کے مختلف ہونے کے باوجود باہم منسلک ہونے میں نوع انسانی کی بقا ہے۔

ابن سیرین راوی ہیں:

نزلت فی النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم و علی لانه جمعه معه نسب و صهر...۔[1]

یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم اور علی (ع) کے بارے میں نازل ہوئی چونکہ علی کے نبی کے ساتھ نسبی اور دامادی دونوں رشتے ہیں۔

وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُهُمۡ وَلَا يَضُرُّهُمۡ ؕ وَكَانَ

۵۵۔ اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو نہ تو انہیں نفع پہنچا سکتی ہیں

[1] البحر المحیط ۸: ۱۱۹۔ شواهد التنزیل ۱: ۵۳۸۔ کشف الغمة ۱: ۲۲۲۔ نور الابصار ۱: ۲۹۰ الکشف والبیان ۷: ۱۴۲

الۡکَافِرُ عَلٰی رَبِّہٖ ظَہِیۡرًا ﴿۵۵﴾	اور نہ ضرر اور کافر اپنے رب کے مقابلے میں (دوسرے کافروں کی) پشت پناہی کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین ایسے بتوں کی پرستش کرتے ہیں جن کی پوجا کرنے میں کوئی فائدہ ہے نہ پوجا نہ کرنے میں کوئی ضرر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے معبود نفع وضرر پر قادر نہیں ہیں ورنہ خود بت کی عبادت باعث ضرر ہے۔

۲۔ وَکَانَ الۡکَافِرُ عَلٰی رَبِّہٖ ظَہِیۡرًا: درحقیقت کافر اپنے رب کے خلاف ہر قدم کے پشت پناہ ہوتے ہیں خواہ یہ قدم اٹھانے والے انسانی شیطان ہوں یا جناتی شیطان۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ﴿۵۶﴾	۵۶۔ اور (اے رسول) ہم نے آپ کو صرف بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

تفسیر آیات

رسول کی ذمہ داری کفار کے سامنے حق کا پیغام رکھنا ہے اور جہاں تک پیغام رسانی اور اتمام حجت کا تعلق ہے اس میں رسول افہام و تفہیم کا ہر وسیلہ استعمال کریں گے۔ اس سے آگے اس پیغام کو قبول کروانا رسولؐ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

البتہ اسلام قبول کرنے والوں پر رسولؐ کو ولایت کا حق حاصل ہے۔ رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہنا واجب ہے خواہ اس میں جان کا خطرہ کیوں نہ ہو۔

اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ ...۔[1]	نبی مومنین کی جانوں پر خود ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہے۔

نیز رسولؐ حاکم ہیں ان کی اطاعت لازم ہے ان کا حکم نافذ ہے:

وَمَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗۤ اَمۡرًا اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ مِنۡ اَمۡرِہِمۡ ؕ وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیۡنًا ﴿﴾[2]	اور کسی مؤمن اور مومنہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے میں فیصلہ کریں تو انہیں اپنے معاملے کا اختیار حاصل رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

---

[1] ۱۳۳۱ احزاب: ۶ [2] ۱۳۳۲ احزاب: ۳۶

اہم نکات

۱۔ رسولؐ منکرین کے لیے صرف نذیر ہیں۔ مؤمنین پر واجب الاطاعۃ حاکم ہیں۔

قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اَنۡ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیۡلًا ﴿۵۷﴾

۵۷۔ کہدیجیے: اس کام پر میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر یہ (چاہتا ہوں) کہ جو شخص چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔

تفسیر آیات

تبلیغ رسالت پر میں تم سے اجرت نہیں مانگتا۔ بس میری اجرت یہ ہے کہ تم خود اپنی مختاری سے آزادانہ طور پر مَنۡ شَآءَ کی بنیاد پر اپنے رب کا راستہ اختیار کرو۔ اگر اجر مانگتا ہوں تو اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے تمہاری بھلائی اور تمہاری نجات میرا اجر رسالت ہے۔

واضح رہے: رب کا راستہ دکھانے والے ہادیان برحق، قربیٰ کی محبت بھی خود انسانوں کی بھلائی اور نجات کے لیے چاہتے ہیں:

قُلۡ مَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَہُوَ لَکُمۡ ....[1] کہدیجیے: جو اجر (رسالت) میں نے تم سے مانگا ہے وہ خود تمہارے ہی لیے ہے۔

لہٰذا اس آیت کے مطابق رب کا راستہ اختیار کرنا، آیۂ مودت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے قرابتداروں سے محبت کرنا وہ اجر رسالت ہے جو فَہُوَ لَکُمۡ کے تحت تمہارے مفاد کا اجر ہے۔ رسولؐ کی غرض بعثت پوری ہونے کی وجہ سے اجر کہا ہے ورنہ یہ باتیں مؤمنین کے لیے اجر ہیں۔

اہم نکات

۱۔ رسول مؤمنین سے اجر نہیں نجات کا ذریعہ اختیار کرنے کی خواہش کرتے ہیں۔

وَ تَوَکَّلۡ عَلَی الۡحَیِّ الَّذِیۡ لَا یَمُوۡتُ وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِہٖ ؕ وَ کَفٰی بِہٖ بِذُنُوۡبِ عِبَادِہٖ خَبِیۡرَا ۚ﴿ۙ۵۸﴾

۵۸۔ اور (اے رسول) اس اللہ پر توکل کیجیے جو زندہ ہے اور اس کے لیے کوئی موت نہیں ہے اور اس کی ثناء کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اپنے بندوں کے گناہوں سے مطلع ہونے کے لیے بس وہ خود ہی کافی ہے۔

[1] ۳۴ سبا: ۴۷

تفسیر آیات

توکل اور بھروسہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے تین اوصاف کا بیان ہوا ہے کہ اس ذات پر بھروسہ رکھو جو:

۱۔ زندہ ہے: عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ اس زندہ پر توکل کرو جو نہ صرف زندہ ہے بلکہ زندگی کی سرچشمہ ہے لہٰذا تسبیح بھی اسی کی کرو۔

۲۔ وہ دانا ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی آپ سے غافل نہیں ہو سکتی۔

۳۔ وہ قادر ہے: الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ....جس کا ذکر اگلی آیت میں ہوا ہے۔

الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾

۵۹۔ جس نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے (سب کو) چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر اقتدار قائم کیا، وہ نہایت رحم کرنے والا ہے لہٰذا اس کے بارے میں کسی باخبر سے دریافت کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کی خلقت پھر عرش پر متمکن ہونے کے بارے میں تشریح سورۃ الاعراف آیت ۵۴ اور یونس آیت ۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا: هو الرحمٰن۔ وہ رحمٰن ہے جس نے کائنات کو بنایا پھر عرش پر متمکن ہوا۔ فَسْـَٔلْ بِهٖ یعنی عنه رحمٰن کے بارے میں کسی باخبر ذات سے پوچھو جو خود خدائے تعالیٰ ہے۔

مجمع البیان میں ہے: روایت میں آیا ہے کہ یہود اشیاء کی خلقت کی ابتدا کے بارے میں ایسی باتیں نقل کرتے تھے جو فرمان الٰہی کے خلاف تھیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا۔

اہم نکات

۱۔ باخبر ذات سے سوال ہونا چاہیے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾

۶۰۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں: رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے لیے تو کہدے؟ پھر ان کی نفرت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ عرب مشرکین لفظ رحمٰن سے ناآشنا تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے رحمٰن کہہ کر اللہ کو پکارا تو مشرکین کہنے لگے: اس صابئی کو دیکھو! ہمیں دو معبودوں کو پکارنے سے روکتا ہے، خود دو معبودوں کو پکارتا ہے۔ اللہ اور رحمٰن کو جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَیًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۚ ...[1]

کہہ دیجیے: اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں۔

۲۔ وَ مَا الرَّحۡمٰنُ: مشرکین کا یہ سوال رحمٰن کیا ہے؟ خود ایک جسارت ہے ورنہ رحمٰن کون؟ سوال ہوسکتا تھا اسی طرح اَنَسۡجُدُ لِمَا تَاۡمُرُنَا کیا ہم اس کو سجدہ کریں جس کے لیے تو کہتا ہے؟ ایک گستاخی ہے اور انداز کلام میں تکبر بھی ہے ساتھ رسولؐ کے حکم کی بے اعتنائی بھی ہے۔

۳۔ وَ زَادَہُمۡ نُفُوۡرًا: رحمٰن کو سجدہ کرو کے حکم سے ان کی نفرت میں اضافہ ہوگیا۔ حکم رسول سے نفرت میں اضافہ یا رحمٰن کے لیے سجدہ کرنے سے نفرت میں اضافہ ہوا؟ دونوں ہو سکتے ہیں۔ ان کی نفرت حکم رسول سے یا خود سجدۂ برائے رحمٰن سے بڑھ گئی۔

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ جَعَلَ فِیۡہَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیۡرًا ﴿۶۱﴾

۶۱۔ بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں ستارے بنائے اور اس میں ایک چراغ اور روشن چاند بنایا۔

تفسیر آیات

۱۔ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا: بروج کے بارے میں تشریح سورہ حجر آیت ۱۶ میں ہو چکی ہے۔

۲۔ وَّ جَعَلَ فِیۡہَا سِرٰجًا: سراج سے مراد ہے۔

جس ذات کا نام رحمٰن ہے اس کی شان میں گستاخی کرتے ہو جس کے قبضہ قدرت میں آسمانوں کی حکومت ہے اور جس کے ہاتھ میں گردش لیل و نہار ہے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ خِلۡفَۃً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّذَّکَّرَ اَوۡ

۶۲۔ اور وہی ہے جس نے ایک دوسرے کی جگہ لینے والے شب و روز بنائے، اس شخص کے لیے

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۱۱۰

اَرَادَ شُكُوۡرًا ۞ جو نصیحت لینا اور شکر ادا کرنا چاہتا ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ روئے زمین پر موجودات کی زندگی کی تدبیری امور میں سے ایک تدبیر شب و روز کا تبادلہ ہے۔ چونکہ نہ ہمیشہ دھوپ سے، نہ ہمیشہ شب سے یہ زندگی جاری رہ سکتی ہے۔

زمین کی گردش کی موجودہ رفتار ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی جگہ ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو دن رات دس گنا لمبے ہو جاتے، گرمیوں میں تمام نبات جل جاتیں اور سردیوں میں رات کو جم جاتیں۔ قرآن بھی گردش لیل و نہار کی غرض و غایت یہی کچھ بتاتا ہے۔

۲۔ لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّذَّکَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُکُوۡرًا: شب و روز کی یہ گردش اس شخص کے لیے بنائی جو نصیحت لینا یا شکر ادا کرنا چاہتا ہے۔

اَرَادَ اَنۡ یَّذَّکَّرَ نصیحت اس بات پر لینا چاہیے کہ کائنات اور انسانی زندگی کو چلانے اور تدبیر کرنے والی ذات وہی ہو سکتی ہے جس کے قبضۂ قدرت میں گردش لیل و نہار ہیں۔ اللہ کے علاوہ کسی کو مدبّر تسلیم نہ کرو۔ اللہ ہی تمہارا مدبّر ہے اَوۡ اَرَادَ شُکُوۡرًا یا اس ذات کا شکر ادا کرنا چاہتا ہے جس نے شب و روز کی گردش سے انسان کو وہ آسائش فراہم فرمائی جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھی۔

اہم نکات

ا۔ گردش لیل و نہار کو معمول پر نہ لو۔ تدبیر الٰہی پر ایمان پختہ کرو۔

وَ عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ہَوۡنًا وَّ اِذَا خَاطَبَہُمُ الۡجٰہِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا ۞

۶۳۔ اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر (فروتنی سے) دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے گفتگو کریں تو کہتے ہیں: سلام۔

تشریح کلمات

ہَوۡنًا: (ہ و ن) الھوان۔ نرمی اور تواضع کے معنوں میں نیز ذلت اور رسوائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

آنے والی چند آیات میں عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ کی چند اہم خصوصیات بیان فرمائی ہیں:

۱۔ عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ: رحمٰن کے بندے اس لیے فرمایا کہ یہ لفظ ذہنوں میں راسخ ہو جائے کہ رحمٰن اللہ تعالیٰ کے ان اسماء میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ چنانچہ یہ نام کسی غیر اللہ کے لیے نہیں بولا جاتا۔

۲۔ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ہَوۡنًا: رحمٰن کے بندے زمین پر تواضع کے ساتھ چلتے ہیں۔

چال انسان کی شخصیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ مطمئن ضمیر اور فکری اعتدال رکھنے والے کی چال اور شخصیت میں خلا رکھنے والے کی چال میں فرق ہوتا ہے کیونکہ اللہ کی بندگی کرنے والوں کی شخصیت میں خلا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ تکبر نہیں، تواضع کرتے ہیں۔ وہ جاہلوں کے ساتھ الجھتے نہیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے:

سُرْعَةُ الْمَشْيِ يَذْهَبُ بِبَهَاءِ الْمُؤْمِنِ...[1] تیز قدم چلنے سے مؤمن کا وقار جاتا ہے۔

مؤمن کے اوصاف میں ایک وصف یہ ہے:

مَشْيُهُمْ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنٌ ...[2] زمین پر ان کی چال باوقار ہوتی ہے۔

۳۔ وَّ اِذَا خَاطَبَہُمُ الۡجٰہِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا: اگر جاہل لوگ بدتہذیبی کریں تو رحمٰن کی بندگی کرنے والے اپنے مطمئن ضمیر کا مظاہرہ تہذیب کے ساتھ کریں گے۔ الجاھل سے مراد وہ بدتہذیب مشرک ہیں جو اسلامی تہذیب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بعض نے اس سے مراد بے وقوف، بے ادب مراد لیا ہے۔

قَالُوۡا سَلٰمًا: سلام سے مراد اسلامی سلام نہیں ہے بلکہ یہ سلام تودیعی ہے جو لاتعلقی کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں، ہم اپنی سلامتی چاہتے ہیں۔ اس میں بیہودہ گو لوگوں سے نہ الجھنے کی خصلت کی تعریف کی گئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ وقار کے ساتھ چلنا، بدتہذیبوں سے نہ الجھنا عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ کے دو اوصاف ہیں۔

وَ الَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اور جو اپنے پروردگار کے حضور سجدے اور قیام کی حالت میں رات گزارتے ہیں۔

تفسیر آیات

عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ رات سجدے اور قیام کی حالت میں گزارتے ہیں۔

رات عبادت کے لیے مناسب وقت ہے۔ اس میں سکون اور سکوت ہوتا ہے۔ لوگوں کی نظروں

---

[1] وسائل الشیعۃ ۱۱: ۴۴۰

[2] الکافی ۲: ۲۳۲

سے پوشیدہ اور ریا کاری سے دور ہوتا ہے۔ یعنی رات کا ایک قابل توجہ حصہ، جیسے تہجد کی نماز جب کہ دن حصول علم و معاش اور جہاد جیسی عبادت کے لیے موزوں ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

رُھْبَانٌ بِا للَّیْلِ اُسْدٌ بِالنَّھَارِ[1]　　رات کے عابد اور دن کے شیر ہوتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾　　۶۵۔ اور جو یوں التجا کرتے ہیں: ہمارے رب! ہمیں عذاب جہنم سے بچا، بے شک اس کا عذاب تو بڑی تباہی ہے۔

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۶۶﴾　　۶۶۔ بے شک جہنم تو بدترین ٹھکانا اور مقام ہے۔

تشریح کلمات

غَرَامًا: (غ ر م) خسارہ کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کی چوتھی صفت خوف از عذاب ہے۔ عذاب سے بچنے کی صرف دعا پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس سے بچنے کے اسباب پر عمل کر کے نتیجے کے لیے دعا کرتے ہیں۔

۲۔ اِنَّهَا سَآءَتْ: ساتھ یہ شعور بھی ہے کہ جہنم کا عذاب کیا ہوتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَ لَمْ یَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾　　۶۷۔ اور یہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں بلکہ ان کے درمیان اعتدال رکھتے ہیں۔

تشریح کلمات

یَقْتُرُوْا: (ق ت ر) القتر کے معنی بہت کم خرچ کرنے اور بخل کے ہیں۔

قَوَامًا: (ق و م) قواماً بفتح قاف۔ اعتدالی کے معنوں میں ہیں۔

تفسیر آیات

عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کی پانچویں صفت خرچ میں اعتدال ہے۔

---

[1] حوالہ سابق

۱۔ لَمۡ یُسۡرِفُوۡا: اسراف ضرورت یا حد سے زیادہ اور الاقتار واجب اور ضرورت سے کم خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔

اسراف دولت کا ضیاع، محتاجوں کے حقوق کی پامالی ہے:

اِنَّمَا الۡاِسۡرَافُ فِیۡمَا اَتۡلَفَ الۡمَالَ وَ اَضَرَّ بِالۡبَدَنِ ۔[۱] اسراف وہاں ہے جہاں مال کا ضیاع اور بدن کا ضرر ہو۔

۲۔ لَمۡ یَقۡتُرُوۡا: الاقتار بخل کرنے کو کہتے ہیں۔ بخل بہت بری خصلت ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

اَیُّ دِاءٍ اَدۡوَی مِنَ الۡبُخۡلِ .... [۲] بخل سے زیادہ کون سی بیماری ہو سکتی ہے۔

البخل بالموجود سوء الظن بالمعبود۔[۳] مال موجود پر بخل کرنا معبود پر بدگمانی ہے۔

بخل خیانت ہے اس مال میں جسے اللہ نے اہل ایمان کو اپنے نائب کے طور پر امانتاً دیا ہے:

وَ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ....[۴] اور اس مال سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمہیں جانشین بنایا ہے۔

مؤمن کی صفت یہ ہے کہ وہ نہ اسراف کرتے ہیں نہ ہی کنجوسی کرتے ہیں۔ اسراف طاقت کا ضیاع اور کنجوسی طاقت کا جمود ہے۔ اسلام فردی ملکیت کا قائل ہے لیکن اس ملکیت میں نہ ضیاع کی اجازت دیتا ہے نہ جمود کی بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک اعتدال کی سفارش کرتا ہے۔ احادیث میں اس اعتدال کو دو برائیوں کے درمیان ایک نیکی قرار دیا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضرت امام محمد باقر نے حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے فرمایا:

یابنی عَلَیۡکَ بِالۡحَسَنَۃِ بَیۡنَ السَّیِّئَتَیۡنِ...[۵] بیٹا! تم دو برائیوں کے درمیان ایک نیکی اختیار کرو۔

پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

اسراف کی دو صورتیں ہیں: ناجائز کام پر پیسہ خرچ کرنا خواہ ایک روپیہ ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری صورت جائز کاموں میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا۔ اسی طرح بخل کی بھی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اپنے اور اپنے بچوں پر اپنی استطاعت کے مطابق خرچ نہ کرے اور ان کو تنگی میں رکھے۔ دوسری صورت یہ کہ کسی نیکی کے کام میں کوئی پیسہ خرچ نہ کرے۔

اہم نکات

۱۔ اسراف اور بخل کے درمیان اعتدال مؤمن کی علامت ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا ۶۸۔ اور یہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنا کر

---

[۱] الکافی ۶: ۴۹۹ [۲] الکافی ۲: ۴۴ [۳] غرر الحکم: ۶۵۱۲ [۴] ۵۷ حدید: ۷ [۵] بحار الانوار ۶۸: ۲۱۶

اٰخَرَ وَ لَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ لَا یَزۡنُوۡنَ ۚ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾

نہیں پکارتے اور جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے قتل نہیں کرتے مگر جائز طریقہ سے اور زنا کا ارتکاب (بھی) نہیں کرتے اور جو ایسا کام کرے گا وہ اپنے گناہ میں مبتلا ہوگا۔

یُّضٰعَفۡ لَہُ الۡعَذَابُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ یَخۡلُدۡ فِیۡہٖ مُہَانًا ﴿۶۹﴾

۶۹۔ قیامت کے دن اس کا عذاب دوگنا ہو جائے گا اور اسے اس عذاب میں ذلت کے ساتھ ہمیشہ رہنا ہوگا۔

تفسیر آیات

عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ کی چھٹی صفت اخلاص در توحید ہے۔

۱۔ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ: وہ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے بلکہ صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔ یہ اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جو ایک معبود کو ماننے کے باوجود غیر اللہ سے لو لگاتے ہیں یا مَعَ اللّٰہِ کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اگرچہ بظاہر مشرک ہوتا ہے لیکن اس کا باطن، اس کی فطرت اور جبلت توحید سے سرشار ہوتی ہے۔ اس طرح مشرک کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ پکارتا ہے۔

۲۔ کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتا۔ یہ مؤمن کو ساتویں صفت ہے۔ چونکہ قتل نفس ان بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے جس پر جہنم کی سزا مقرر ہے۔ اِلَّا بِالۡحَقِّ البتہ یہ قتل ناحق نہ ہو تو گناہ نہیں ہے۔ مثلاً قصاص میں قتل کرنا گناہ نہیں ہے۔

۳۔ وَ لَا یَزۡنُوۡنَ: وہ زنا کا ارتکاب نہیں کرتے۔ یہ مؤمن کی آٹھویں صفت ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

اِذَا فَشَا الزِّنَا ظَھَرَتِ الزَّلۡزَلَۃُ ....[1] جب زنا عام ہو جائے تو زلزلہ آیا کرے گا۔

۴۔ ایسے گناہوں کے مرتکب لوگوں کو اس صورت میں جہنم میں دائمی عذاب ہوگا جو حالت کفر میں مر جائیں اور انہوں نے قتل اور زنا کا ارتکاب بھی کیا ہو چونکہ صرف قتل اور زنا کے گناہ سے عذاب تو ہوگا مگر دائمی عذاب نہ ہوگا۔

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ

۷۰۔ مگر جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیا تو اللہ ان کی برائیوں کو

[1] الکافی ۲: ۴۴۷

سَیِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۝ نیکیوں میں بدل دیتا ہے اور اللہ تو بڑا غفور رحیم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِلَّا مَنۡ تَابَ: وہ لوگ جہنم میں دائمی عذاب میں نہ ہوں گے جو کفر و شرک سے توبہ کرتے ہیں اگرچہ ان لوگوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کیا ہے۔ قتل نفس اور زنا کا بھی ارتکاب کیا ہے تاہم توبہ، ایمان لانے اور اعمال صالحہ کی وجہ سے ان کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔

۲۔ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا: نیک اعمال بجا لانے کی وجہ سے یعنی اپنے ایمان پر قائم رہنے اور مذکورہ گناہوں سے دوری اختیار کر کے عمل صالح بجا لانے کی وجہ سے نہ صرف ان کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں بلکہ

۳۔ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ: اللہ ان کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ یہ سب توبہ اور ایمان کے اثرات ہوں گے کہ تمام گناہوں کی جگہ ایمان لے لے گا اور نیکی ہی نیکی ہو گی۔ یُبَدِّلُ کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس توبہ کے بعد اعمال سیئہ کی جگہ اعمال حسنہ لیں گے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ ان کے گناہ مٹا کر ان کی جگہ نیکیاں لکھے گا۔

قرین واقع تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ اور ایمان کی وجہ سے اس کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ لہٰذا اگر ایک شخص توبہ و ایمان لانے کے بعد فوراً مر جاتا ہے تو یہ آیت اس پر بھی صادق آتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ توبہ اس کیمیکل تبدیلی کی طرح ہے جس سے متعفن غلاظت، شیرین میوہ میں بدل جاتی ہے۔

51

وَ مَنۡ تَابَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوۡبُ اِلَی اللّٰهِ مَتَابًا ۝ ۷۱۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل انجام دیتا ہے تو وہ اللہ کی طرف حقیقی طور پر رجوع کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سابقہ آیت میں شرک، قتل، زنا سے توبہ کا ذکر تھا۔ اس آیت میں مطلق گناہوں سے توبہ کا ذکر ہے۔

۲۔ فَاِنَّهٗ یَتُوۡبُ اِلَی اللّٰهِ مَتَابًا: توبہ کے بعد عمل صالح بجا لانے کی صورت میں یہ توبہ، عظیم توبہ ہو جائے گی۔ جیسا کہ یَتُوۡبُ کی مَتَابًا سے تاکید کی گئی کہ عمل صالح توبہ کو حقیقی بناتا ہے۔

وَالَّذِیۡنَ لَا یَشۡہَدُوۡنَ الزُّوۡرَ ۙ وَ اِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا کِرَامًا ﴿۷۲﴾

۷۲۔ اور (عباد الرحمٰن وہ ہیں) جو لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب بیہودہ باتوں سے ان کا گزر ہوتا ہے تو شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔

تشریح کلمات

الزُّوۡرَ: (ز و ر) قول الزور جھوٹی بات کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ کی نویں صفت یہ ہے کہ لَا یَشۡہَدُوۡنَ الزُّوۡرَ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ اگر ہم الزُّوۡرَ کو ہم لغویات کے معنوں میں لیں تو معنی یہ ہو جائیں گے: مؤمن لغو مجالس میں حاضر نہیں ہوتے۔ المیزان کے نزدیک دوسرے معنی پر ذیل آیت قرینہ ہے۔ یعنی وَ اِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ قرینہ ہے۔

۲۔ وَ اِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مؤمن لغویات میں مشغول نہیں ہوتے بلکہ جب لغویات میں مشغول لوگوں سے ان کا گزر ہو جائے تو شریفانہ گزر جاتے ہیں۔ ان میں شامل ہوتے ہیں اور نہ ان سے بے جا الجھتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کی زندگی کے لحات قیمتی ہوتے ہیں۔ لغویات میں مشغول ہونے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

وَالَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡہَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور وہ لوگ جنہیں ان کے رب کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جائے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں گرتے۔

تشریح کلمات

لَمۡ یَخِرُّوۡا: (خ ر ر) خرّ آواز کے ساتھ نیچے گرنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

مؤمن کی دسویں صفت یہ ہے کہ وہ آیات الٰہی سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ مشرکین کی طرح آیات الٰہی سننے پر گونگے اور بہرے ہو کر ان آیات پر برہم نہیں ہوتے بلکہ وہ ان میں غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے ایمان میں اضافہ کرتے ہیں۔

وَالَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا هَبۡ لَنَا مِنۡ اَزۡوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعۡيُنٍ وَّ اجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِيۡنَ اِمَامًا﴿۷۴﴾

۷۴۔اور جو دعا کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہماری ازواج اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا دے۔

تفسیر آیات

ا۔مؤمن کی گیارہویں صفت یہ ہے کہ وہ اپنے رب سے دو چیزیں مانگتے ہیں:

الف: ازواج و اولاد سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملے۔ ان سے خوشی اور مسرت حاصل رہے۔ ظاہر ہے مؤمن کو ان سے مسرت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب یہ اللہ کی اطاعت اور اللہ کی معصیت سے پرہیز کریں۔ واضح رہے صالح اولاد قیامت کے دن اپنے والدین کو فائدہ دے سکتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

جَنّٰتُ عَدۡنٍ يَّدۡخُلُوۡنَهَا وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ ....[۱] (یعنی) ایسی دائمی جنتیں ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے آبا بھی....

ب: وَّاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِيۡنَ اِمَامًا: ہمیں پرہیز گاروں کا ہر اول دستہ بنا دے کہ ہم آنے والوں کے لیے تقویٰ کی مثال بن جائیں۔ جیسا کہ حکم ہے:

فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ....[۲] پس تم لوگ نیکیوں کی طرف سبقت کرو....

اہل بیت علیہم السلام کی قرائت میں آیا ہے:

و احعل لنا من المتقین اماماً۔[۳] ہمارے لیے تقویٰ والوں میں رہنما بنا دے۔

ابوسعید راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اے جبرئیل اس آیت میں ازواجنا کون ہیں؟ کہا: خدیجہ ہیں۔ فرمایا: ذریاتنا کون ہیں؟ کہا: فاطمہ۔ فرمایا: قرۃ العین کون ہیں؟ فرمایا: حسن و حسین۔ فرمایا: و اجعلنا للمتقین اماماً کون ہیں؟ فرمایا: علی ہیں۔[۴]

ابان بن تغلب سے روایت ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا:

نحن هم اهل البیت۔[۵] یہ ہم اہل بیت ہیں۔

ابن عباس راوی ہیں: یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[۶]

---

[۱] ۱۳ رعد: ۲۳ [۲] ۲ بقرۃ: ۱۴۸ [۳] بحار الانوار ۲۴: ۱۳۲

[۴] شواھد التنزیل ۱: ۵۳۹ ذیل آیت [۵] شواھد التنزیل ۱: ۵۳۹ [۶] البرھان ذیل آیت

اہم نکات

۱۔ ازدواج و اولاد کی اچھی تربیت دارین کے لیے فائدہ مند ہے۔

۲۔ مؤمن کو چاہیے کہ وہ تقویٰ کے لیے مثال بن جائے۔

أُولَٰٓئِكَ يُجۡزَوۡنَ ٱلۡغُرۡفَةَ بِمَا صَبَرُواْ وَيُلَقَّوۡنَ فِيهَا تَحِيَّةٗ وَسَلَٰمًا ۝٧٥

۷۵۔ ایسے لوگوں کو ان کے صبر کے صلے میں اونچے محل ملیں گے اور وہاں ان کا استقبال تحیت اور سلام سے ہو گا۔

خَٰلِدِينَ فِيهَاۚ حَسُنَتۡ مُسۡتَقَرّٗا وَمُقَامٗا ۝٧٦

۷۶۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، بہت ہی عمدہ ٹھکانا اور مقام ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡغُرۡفَةَ: بالا خانے کو کہتے ہیں۔ یہ جنت میں بلندی درجات کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ بِمَا صَبَرُوۡا: یہ درجات اس صبر کے صلے میں ملیں گے جو دنیا میں ادائے واجبات، اجتناب محرمات اور زندگی میں پیش آنے والے حوادث کے مقابلے میں کیا ہے۔

۳۔ وَ یُلَقَّوۡنَ فِیۡهَا تَحِیَّةً وَّ سَلٰمًا: جنت میں اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ملا کرے گا:

سَلٰمٌ ۟ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ ۝ [۱] مہربان رب کی طرف سے سلام کہا جائے گا۔

جنت میں سب سے بڑی نعمت اور مسرت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو گی:

وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكۡبَرُ ... [۲] اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے.

فرشتوں کی طرف سے سلام و تحیت ہوا کرے گی اور مؤمنین کا آپس میں سلاماً سلاماً ہو گا۔

۴۔ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا: پھر جنت کی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ یہ ابدی زندگی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ زندگی کے یہ پر لطف لمحات ختم نہ ہونے والے ہوں۔

اہم نکات

۱۔ صبر ہی وہ ذریعہ ہے جس سے درجات حاصل ہو سکتے ہیں۔

قُلۡ مَا یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡ لَا

۷۷۔ کہد یجیے: اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتیں تو

---

[۱] ۳۶ یس: ۵۸ [۲] ۹ توبة: ۷۲

دُعَآؤُكُمۡ ۚ فَقَدۡ كَذَّبۡتُمۡ فَسَوۡفَ يَكُوۡنُ لِزَامًا ۝٧٧ میرا رب تمہاری پرواہ ہی نہ کرتا، اب تم نے تکذیب کی ہے اس لیے (سزا) لازمی ہوگی۔

تشریح کلمات

يَعۡبَؤُا: (ع ب ء) العبء الثقل وزن کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ مَا يَعۡبَؤُا بِكُمۡ رَبِّيۡ لَوۡلَا دُعَآؤُكُمۡ: ایک تفسیر یہ ہے: کہدیجیے میرا رب تم کو کوئی وزن نہ دیتا، تمہارا وجود و عدم برابر ہے لَوۡلَا دُعَآؤُكُمۡ اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتیں۔ اس تفسیر کے مطابق انسان کو وزن دینے والی چیز دعا ہے۔ نجات کے لیے واحد ذریعہ دعا ہے۔ بندگی سے انسان کو قدر و قیمت ملتی ہے اور دعا سے بندگی ملتی ہے۔

دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ دُعَآؤُكُمۡ تمہاری عبادت نہ ہوتی تو تمہارا رب تمہاری پرواہ نہ کرتا۔

تیسری تفسیر یہ: لَوۡلَا دُعَآؤُكُمۡ اگر تمہارے رب کی طرف سے دعوة الی الحق نہ ہوتی تو تمہاری پرواہ نہ کرتا۔ تمہیں زندگی دی ہے اور زندہ رکھنا چاہتا ہے تو صرف اس لیے کہ تم کو حق کی دعوت پہنچ جائے۔ یہی تمہاری غرض خلقت ہے۔ اسی کے قریب ہے یہ فرمان:

مَا يَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمۡ اِنۡ شَكَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ ....[1] اگر تم شکر ادا کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟

۲۔ فَقَدۡ كَذَّبۡتُمۡ: لیکن تم نے اس حق کی دعوت کی تکذیب کی ہے۔ اسے ٹھکرا دیا ہے۔ اب تمہارا کوئی وزن نہیں رہا۔ تمہارا وجود و عدم برابر ہے چونکہ تم نے اپنی غرض خلقت کو ٹھکرا دیا ہے۔

یہ تیسری تفسیر ذیل آیت کے ساتھ مربوط ہے لہٰذا میرے نزدیک یہی تفسیر سیاق آیت کے مطابق ہے۔

۳۔ فَسَوۡفَ يَكُوۡنُ لِزَامًا: اس تکذیب کی وجہ سے تم اللہ کے حتمی قانون کی زد میں آ جاتے ہو۔ وہ ہے عذاب ابدی۔ اب عذاب تم پر لازم ہو گیا۔

اہم نکات

۱۔ حق کے داعی کی آواز پہچاننے سے انسان کو اللہ کے نزدیک قیمت مل جاتی ہے۔

---

[1] ۴ نساء: ۱۴۷

سُورَةُ الشُّعَرَاءِ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۃ الشعرآء آیت نمبر ۲۲۴ میں شعراء کا ذکر آیا ہے۔ اسی مناسبت سے اس سورۃ المبارکۃ کا نام الشعرآء ہے۔

یہ سورہ ۲۲۷ آیات پر مشتمل ہے اور کوفی قرآئت کے مطابق طٰسٓمّٓ ایک آیت ہے۔کوفی قرائت کی سند امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام تک منتہی ہے اس لیے یہ قرائت مستند ہے۔

فضلیت: ابی بن کعب راوی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جو سورۃ الشعراء کی تلاوت کرتا ہے اسے نوح، ھود، شعیب، صالح، ابراہیم، عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق و تکذیب کرنے والوں کی تعداد کے دس گنا نیکیاں عنایت فرمائے گا۔

(مجمع البیان)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ بنام خدائے رحمٰن رحیم

طٰسٓمّٓ ① ١۔ طا سین میم۔

تفسیر آیات

حروف مقطعات کے بارے میں تشریح سورہ بقرہ اور سورہ مریم کی ابتدا میں ہو گئی ہے۔

تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ② ٢۔ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں۔

تفسیر آیات

١۔ تِلۡکَ: اس سورے میں نازل ہونے والی آیات اس کتاب یعنی قرآن کا حصہ ہیں جو مبین، حق و باطل کو کھول کر بیان کرنے والی ہے۔ مبین سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب خود بیان کر رہی ہے کہ میں کلام مخلوق نہیں ہوں۔

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ اَلَّا یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ③ ٣۔ شاید اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کھو دیں گے۔

تشریح کلمات

بخع: (ب خ ع) کے معنی غم سے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالنا کے ہیں۔

تفسیر آیات

سیاق کلام سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی زندگی کے اواسط سے متعلق ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ تبلیغ رسالت کے مشکل ترین مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ آپؐ کی رسالت کو نہ صرف یہ کہ پذیرائی نہیں مل رہی بلکہ تکذیب و ایذاء اور اہانت کا سلسلہ تیز ہو جاتا ہے۔ مشرکین کی بڑھتے ہوئے سازشوں سے رسول اللہ ﷺ کا بار رسالت سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ اس حد تک سنگینی کہ اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمائے: ان مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے شاید آپ اپنی جان کھو دیں۔

ایک اور اعتبار سے بھی اس آیت کو سمجھنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں پر کس قدر مہربان تھے کہ ان کے ایمان نہ لانے اور جہنمی بن جانے پر اس قدر دکھ ہوتا کہ اپنی جان کھو دیں۔

اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَۃً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُہُمۡ لَہَا خٰضِعِیۡنَ ﴿۴﴾

۴۔ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایسی نشانیاں نازل کر دیں جس کے آگے ان کی گردنیں جھک جائیں۔

تفسیر آیات

رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لیے فرمایا: آپؐ کی ذمے داری یہ نہیں ہے کہ وہ ہر صورت میں ایمان لے آئیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم ایک ایسی نشانی آسمان سے نازل کرتے جس کے بعد وہ قہراً تسلیم ہو جاتے۔

ایسا کرنا اللہ کے لیے مشکل نہ تھا لیکن اللہ کو جبری ایمان منظور نہیں، نہ ہی جبری ایمان کی کوئی قیمت ہے۔ جبری ایمان تو فرعون نے بھی قبول کیا تھا۔ جب غرق ہو رہا تھا تو کہا تھا: میں ایمان لاتا ہوں اس خدا پر جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے۔

اللہ کو جبری ایمان اس لیے قبول نہیں ہے کیونکہ ایمان وہ ہے جس میں ذات الٰہی کی معرفت حاصل کرنے کے بعد اس کی محبت دل میں اتر جائے پھر اسے قبول کرے۔

اَعۡنَاقُہُمۡ لَہَا خٰضِعِیۡنَ: خاضعات نہیں فرمایا چونکہ خضوع عقلاء کی صفت ہے۔ خضوع (جھک جانا) صاحبان عقل کے لیے وصف بن سکتا ہے ورنہ عنق گردن از خود، قصداً نہیں جھکتی۔ بعض نے یہاں سے کہا ہے: اصحاب مضاف محذوف ہے اور خاضعین اصحاب کی خبر ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان وہ ہے جس کے سامنے دل جھک جائے، نہ گردن۔

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ۝٥

۵۔اور ان کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو بھی تازہ نصیحت آتی ہے تو یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ نصیحت بھی ایسی ذات کی طرف سے آئی ہو جو رحمٰن ہے، پھر بھی منہ موڑ لیں بڑی بدنصیبی ہے۔

۲۔ مُحْدَثٍ: جدید تازہ کو کہتے ہیں۔ یہاں کلام اللہ کے مخلوق، غیر مخلوق ہونے میں ایک کلامی بحث ہے جو ہماری اس تفسیر کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝٦

۶۔ یہ تکذیب کر بیٹھے ہیں تو جس چیز کا یہ لوگ مذاق اڑاتے تھے اب عنقریب اس کی خبریں آنے والی ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَقَدْ كَذَّبُوا: منہ موڑا تکذیب کی اور استہزاء تک نوبت پہنچی ہے۔آگے کا مرحلہ ہے تکذیب و استہزا کرنے والوں کو اپنی استہزاء کا بدلہ ملنے کا۔ اس آیت میں پیشگوئی فرمائی کہ یہ مرحلہ اب آنے والا ہے۔ دنیا کا عذاب بدر میں پیش آیا اور آخرت کا عذاب ان کا مقدر ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ۝٧

۷۔کیا انہوں نے کبھی زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں کتنی وافر مقدار میں ہر قسم کی نفیس نباتات اگائی ہیں؟

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝٨

۸۔اس میں یقیناً ایک نشانی ضرور ہے مگر ان میں سے اکثر نہیں مانتے۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝٩ ع

۹۔اور یقیناً آپ کا رب ہی بڑا غالب آنے ولا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جو لوگ اللہ کی مدبریت پر ایمان نہیں لاتے اور غیر اللہ کو مدبر و مدبر مانتے ہیں وہ ایک نگاہ زمین

کی طرف نہیں ڈالتے کہ خلاقیت اور ربوبیت دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ چنانچہ زمین سے ہر عمدہ چیز کا اگانا یا ہر جفت کا اگانا جہاں اللہ کی خلاقیت پر دلالت کرتا ہے وہاں اللہ کی ربوبیت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ کائنات کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً: زمین سے اُگانے میں اس بات پر کہ اللہ ہی مدبر ہے ایک نشانی ہے چونکہ مشرکین اللہ کو خالق سمجھتے ہیں، رازق نہیں سمجھتے۔ زمین سے اُگانے میں اس بات پر ایک واضح دلیل موجود ہے کہ رزق دینا تخلیق سے جدا عمل نہیں ہو سکتا۔ رزق دینا بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ اللہ دانے کا سینہ چاک کر کے زمین سے ہر قسم کا سبزہ اگا کر رزق دیتا ہے جو ایک تخلیق ہے۔

۳۔ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ: اے رسول آپ کا رب ہی بالا دست ہے۔ تخلیق و تدبیر دونوں پر قادر اور رحیم ہے۔ وہی رازق ہے۔

اہم نکات

۱۔ تخلیق اور تدبیر دو جدا چیزیں نہیں ہیں۔

وَ اِذۡ نَادٰی رَبُّکَ مُوۡسٰۤی اَنِ ائۡتِ الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰﴾

قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۰۔ اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے موسیٰ کو پکارا (اور کہا) کہ آپ ظالم لوگوں کے پاس جائیں،

۱۱۔ (یعنی) فرعون کی قوم کے پاس، کیا وہ ڈرتے نہیں؟

تفسیر آیات

۱۔ حضرت موسیٰ کا ذکر پھر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک ظالم طاقت کے سامنے اپنی دعوت رسالت پیش کرنے کا حکم دیا۔ اَلَا یَتَّقُوۡنَ وہ دعوت بچاؤ کی دعوت تھی۔ بچاؤ کی صورت یہ تھی کہ ظلم اور شرک سے ہاتھ اٹھاؤ اور بنی اسرائیل کو آزاد کرو۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ ﴿۱۲﴾

وَ یَضِیۡقُ صَدۡرِیۡ وَ لَا یَنۡطَلِقُ لِسَانِیۡ فَاَرۡسِلۡ اِلٰی ہٰرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۲۔ موسیٰ نے عرض کی: پروردگارا! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ میری تکذیب کریں گے۔

۱۳۔ اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان نہیں چلتی سو تو ہارون کو (پیغام) بھیج (کہ میرا ساتھ دیں)۔

تفسیر آیات

ا۔ خوف تکذیب، ضیق صدر اور زبان کی کندی، تین ایسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو شریک رسالت کرنے کی درخواست کی۔ فَاَرۡسِلۡ اِلٰی ہٰرُوۡنَ ہارون علیہ السلام کی طرف بھی وحی کا فرشتہ بھیج دیا۔

۳۔ اِنِّیۡۤ اَخَافُ: خوف، تکذیب رسالت تھا، خوف بہ نفس نہ تھا۔

۴۔ وَ یَضِیۡقُ صَدۡرِیۡ: ضیق صدر کا مسئلہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کو بھی پیش آیا تھا۔ فرمایا:

وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ۙ﴿۹۷﴾[1] اور بتحقیق ہمیں علم ہے کہ یہ جو کچھ کہ رہے ہیں اس سے آپ یقیناً دل تنگ ہو رہے ہیں۔

۵۔ وَلَا یَنۡطَلِقُ لِسَانِیۡ: تشریح سورہ طٰہ آیت ۲۷ میں ہوگئی ہے۔

وَ لَہُمۡ عَلَیَّ ذَنۡۢبٌ فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ ﴿ۚ۱۴﴾ ۱۴۔ اور ان لوگوں کے لیے میرے ذمے ایک جرم (کا دعویٰ) بھی ہے لہٰذا مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

ا۔ عَلَیَّ ذَنۡۢبٌ: میرے ذمے ایک جرم ہے۔ قبطی کے غیر عمدی قتل کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ ایک فرعونی شخص ایک اسرائیلی سے لڑ رہا ہے تو اسے ایک گھونسا مارا جس سے وہ مر گیا۔ فرعون کو اس کا پتہ چلا تو اس نے بدلہ لینے کا ارادہ کر لیا جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ مدین کی طرف نکل گئے۔ آج جب واپس فرعون کے دربار میں اعلان رسالت کے لیے جانے کا حکم مل رہا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خدشہ قدرتی ہے کہ وہ مجھے اس قتل کے الزام میں پھنسا دیں گے، اعلان رسالت کی شاید نوبت ہی نہ آئے۔ اسے جرم فرعونیوں کے نظریے کے مطابق کہا ہے کہ وہ اسے گناہ تصور کرتے ہیں۔ سورہ قصص میں تفصیل آنے والی ہے۔

قَالَ کَلَّا ۚ فَاذۡہَبَا بِاٰیٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَکُمۡ مُّسۡتَمِعُوۡنَ ﴿۱۵﴾ ۱۵۔ فرمایا: ہرگز نہیں! آپ دونوں ہماری نشانیاں لے کر جائیں کہ ہم آپ کے ساتھ سنتے رہیں گے۔

تفسیر آیات

ا۔ قَالَ کَلَّا: یعنی وہ ہرگز آپ کو قتل نہیں کر سکیں گے۔

---

[1] ۱۵ حجر: ۹۷

۲۔ فَاذۡهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ : ہماری نشانیاں یعنی معجزات لے کر اس کے پاس جائیں۔

۳۔ اِنَّا مَعَكُمۡ : وہاں آپ دونوں اکیلے فرعون کے رحم و کرم پر نہیں ہوں گے ہم آپ کے ساتھ ہوں گے۔ آپ کے اور فرعون کے درمیان ہونے والے مکالمے سن رہے ہوں گے۔

فَاۡتِيَا فِرۡعَوۡنَ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ آپ دونوں فرعون کے پاس جائیں اور (اس سے) کہیں: ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔

اَنۡ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔

تفسیر آیات

۱۔ فرعون کے پاس جا کر پہلے تو اپنی رسالت کا اعلان کرو اور تعبیر یہ اختیار کرو کہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔ اس تعبیر میں فرعون کے مشرکانہ مذہب کی رد اور توحید کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو صدیوں سے غلام بنائے رکھا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنیادی مقصد بنی اسرائیل کو فرعون کی اسارت سے نجات دلانا تھا۔

۳۔ اِنَّا رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ : اِنَّا جمع اور رسول مفرد ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ دونوں کی رسالت بھی ایک اور بھائی ہونے کی وجہ سے یک جان دو قالب تھے۔

سورہ طٰہ میں تو فرمایا:

فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّكَ ...[1]

اور کہیں: ہم دونوں تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔

قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا وَّ لَبِثۡتَ فِيۡنَا مِنۡ عُمُرِكَ سِنِيۡنَ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ فرعون نے کہا: کیا ہم نے تجھے بچپن میں اپنے ہاں نہیں پالا؟ اور تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں بسر کیے۔

وَفَعَلۡتَ فَعۡلَتَكَ الَّتِيۡ فَعَلۡتَ وَ اَنۡتَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اور تو کر گیا اپنی وہ کرتوت جو کر گیا اور تو ناشکروں میں سے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ دونوں فرعون کے دربار میں حاضر ہو کر اعلان رسالت کرتے ہیں۔ فرعون موسیٰ علیہ السلام کو پہچان لیتا اور کہتا ہے: تو وہی ہے جسے ہم نے پالا ہے اور تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں بسر کئے؟ کیا اس کا یہ

---

[1] ۲۰ طٰہ: ۴۷

صلہ ہے کہ آج ہمارے دین، عقائد اور ہماری روایات کو یکسر مسترد کر کے کوئی نیا دین، نئے عقائد لے کر آئے ہو؟ ہماری مملکت سے بغاوت کر کے کسی اور معبود کی طرف دعوت دیتے ہو؟

۲۔ وَفَعَلۡتَ: اور تو نے ہمارے بندے کو قتل کر کے بھی ہمارے احسانات کا اچھا بدلہ دیا۔

۳۔ وَ اَنۡتَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ: اور تو کفران نعمت کرنے والوں میں سے ہو گیا ہے۔ آج نبوت کا دعویٰ کرتا ہے؟ کافر، یہاں کفران نعمت کے معنوں میں ہے۔ بعض کے نزدیک دین فرعونی کے منکر ہونے کی وجہ سے فرعون کے دین کا کافر کہا ہے۔

قَالَ فَعَلۡتُہَاۤ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ موسیٰ نے کہا: ہاں اس وقت وہ حرکت مجھ سے سرزد ہو گئی تھی اور میں خطا کاروں میں سے تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی تائید پر یقین تھا اس لیے قتل کا اعتراف کر لیا مگر اس کی توجیہ فرمائی۔

۲۔ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیۡنَ: توجیہ یہ تھی کہ یہ کام مجھ سے سرزد ہوا، یہ عمدی نہ تھا بلکہ ایک خطا تھی۔ گھونسا قتل کی نیت سے نہ تھا بلکہ صرف دفاع یا تنبیہ کے لیے تھا جس کا نتیجہ قتل پر ختم ہوا۔ اس کا میں نے قصد نہیں کیا تھا۔ مِنَ الضَّآلِّیۡنَ کی تفسیر بعض نے من الجاھلین کی ہے کہ اس اقدام کے نتیجے کا مجھے علم نہ تھا۔

فَفَرَرۡتُ مِنۡکُمۡ لَمَّا خِفۡتُکُمۡ فَوَہَبَ لِیۡ رَبِّیۡ حُکۡمًا وَّ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اسی لیے جب میں نے تم لوگوں سے خوف محسوس کیا تو میں نے تم سے گریز کیا پھر میرے رب نے مجھے حکمت عنایت فرمائی اور مجھے رسولوں میں سے قرار دیا۔

تفسیر آیات

۳۔ فَفَرَرۡتُ مِنۡکُمۡ لَمَّا خِفۡتُکُمۡ: اس سے معلوم ہوا کہ جب جان کا خطرہ ہے تو ہر وسیلے سے اپنی جان بچانی چاہیے، اگر جان دینے میں اپنے مشن اور اپنی امت کی مصلحت نہ ہو۔

۴۔ فَوَہَبَ لِیۡ رَبِّیۡ حُکۡمًا: پھر میرے رب نے مجھے حکم عنایت فرمایا۔ حکم سے مراد حق اور واقع کے مطابق اٹل فیصلہ ہے۔ یعنی جو فیصلہ واقع کے مطابق ہو وہ حکم ہے۔ چنانچہ واقع بینی کو حکم

کہتے ہیں۔ حکم سے مراد نبوت نہیں ہو سکتی چونکہ قرآن میں حکم اور نبوت جدا ذکر ہوا: اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ۔۔۔۔[1]

۵۔ وَّ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ: اور مجھے مرسلین میں سے قرار دیا۔ اس تعبیر میں ضمناً یہ بتا دیا کہ میں کوئی انوکھا مرسل نہیں ہوں۔ دیگر مرسلین بھی آئے ہیں۔ میں ان میں سے ہوں۔

وَ تِلۡکَ نِعۡمَۃٌ تَمُنُّہَا عَلَیَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور تم مجھ پر اس بات کا احسان جتاتے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھا ہے؟ (یہ تو غلامی تھی احسان نہیں تھا)۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب میں الزام خود فرعون پر عائد کرتے ہیں: تیرے گھر میں پرورش پانے کی نوبت خود تیرے ظلم و ستم کی وجہ سے آئی کہ میری والدہ نے تیرے ہی خوف سے مجھے دریا میں ڈال دیا تھا ورنہ اپنے اسی گھر میں پرورش پاتا۔

۲۔ تَمُنُّہَا عَلَیَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ: یہ درحقیقت ایسا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنایا۔ اس غلام بنانے کا احسان جتاتے ہو۔ غلام بنانا ظلم ہے، احسان نہیں۔

قَالَ فِرۡعَوۡنُ وَ مَا رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ فرعون نے کہا: اور رب العالمین کیا ہے؟

تفسیر آیات

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں، فرعونیوں کے مسلمات کے خلاف تھا۔ رب العالمین ان کی ثقافت میں غیر مانوس لفظ تھا چونکہ وہ عالمین کے لیے ایک نہیں، کئی ارباب کے قائل تھے۔ عالمین کو کئی شعبوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اس لیے فرعون نے تعجب سے پوچھا وَ مَا رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ

۲۴۔ موسیٰ نے کہا: آسمانوں اور زمین اور جو کچھ

[1] ۶ انعام: ۸۹

وَمَا بَيۡنَهُمَا ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِيۡنَ ﴿۲۴﴾ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا رب، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے العالمین کی وضاحت زیادہ محسوس انداز میں فرمائی۔ عالمین میں آسمان، زمین اور جو ان دونوں کے درمیان ہیں سب شامل ہیں۔ ان سب کا ایک رب ہے۔ اس کی طرف سے آیا ہوں۔

۲۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِيۡنَ: اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ ان کو عالمین کا ایک رب ہونے پر تو یقین نہیں تھا البتہ ایک خالق ہونے پر یقین تھا اور کائنات کا نظام بھی ایک ہونے پر یقین تھا۔ فرمایا: اگر تمہیں ان باتوں پر یقین ہے تو یقین کرو رب بھی ایک ہی ہے۔

قَالَ لِمَنۡ حَوۡلَهٗۤ اَلَا تَسۡتَمِعُوۡنَ ﴿۲۵﴾ ۲۵۔ فرعون نے اپنے اردگرد کے درباریوں سے کہا: کیا تم سنتے نہیں ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب بھی ان کے لیے اجنبی اور غیر معقول تھا۔ اس لیے تمسخر کے انداز میں اپنے درباریوں سے کہا: سنتے ہو یہ کیا نامعقول بات کہہ رہا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام رب العالمین کی وضاحت میں فرعونیوں کے حساس ترین دینی، سیاسی نظریے پر حملہ آور ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

قَالَ رَبُّكُمۡ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۲۶﴾ ۲۶۔ موسیٰ نے کہا: وہ تمہارا اور تمہارے پہلے باپ دادا کا پروردگار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ خود تمہارے اور تمہارے باپ دادا کے رب کی طرف سے آیا ہوں۔ براہ راست حملہ۔ فرعون کو معبود سے اتار کر بندہ بنا دیا۔ اس کے اقتدار کی قانونی حیثیت کو چیلنج کر دیا چونکہ فرعونیوں کے عقیدے کے مطابق سورج ان کا رب اعلیٰ ہے۔ اسے وہ رع کے نام سے پکارتے تھے اور بادشاہ کو رب اعلیٰ رع کا مظہر سمجھتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب سے موجودہ فرعون اور اس کے آباء و اجداد کی باشاہت کی قانونی حیثیت پر خط بطلان کھینچ گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس تدریجی استدلال سے فرعون گھبرا گیا۔ عالمین سے شروع فرمایا اور خود فرعون کی ذات پر پہنچا دیا۔ رَبُّکُمۡ خود تمہارے رب کی طرف سے آیا ہوں جس پر فرعون کے حواس اڑ گئے کہا:

قَالَ اِنَّ رَسُوۡلَکُمُ الَّذِیۡۤ اُرۡسِلَ اِلَیۡکُمۡ لَمَجۡنُوۡنٌ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ فرعون نے (لوگوں سے) کہا: جو رسول تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ دیوانہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منطق میں موجود اثر کو کم کرنے کے لیے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ذاتی حملہ کرتا اور کہتا ہے: جو رسول تمہاری طرف بھیجا گیا (از راہ تمسخر) وہ دیوانہ ہے۔

قَالَ رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ موسیٰ نے کہا: وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کا پروردگار ہے اگر تم عقل رکھتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ خود فرعون اور اس کے آبا و اجداد کو ایک رب کے بندے اور محکوم بتانے کے بعد جغرافیائی اعتبار سے محسوس ترین علاقوں کا ذکر فرمایا کہ جس رب کی طرف سے آیا ہوں وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے: میرا رب مشرق و مغرب کا رب ہے۔ اس لیے شروق و غروب اس کے ہاتھ میں ہیں۔

۳۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ: اگر تم عقل سے کام لو تو تمہیں معلوم ہے کہ مشرق سے جس چیز کا طلوع، مغرب میں جس چیز کا غروب ہوتا ہے وہ کس کے ہاتھ میں ہے۔ کیا تمہارے ہاتھ میں ہے یا میرے رب کے ہاتھ میں؟ اس جملے سے فرعون کے ان کے رب اعلیٰ رع یعنی سورج کا نمائندہ ہونے کے نظریے پر کاری ضرب لگائی۔

یہاں پر فرعون کی قانونی حیثیت پر بھرپور حملہ ہوا تو ہر جابر کی طرح فرعون نے بھی منطق کے مقابلے میں اپنی طاقت کے استعمال کا عندیہ دیا۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذۡتَ اِلٰـہًا غَیۡرِیۡ

۲۹۔ فرعون نے کہا: اگر تم نے میرے علاوہ کسی اور کو

لَاَجۡعَلَنَّکَ مِنَ الۡمَسۡجُوۡنِیۡنَ ﴿۲۹﴾ معبود بنایا تو میں تمہیں قیدیوں میں شامل کروں گا۔

تفسیر آیات

فرعون نے دیکھا کہ غیر اللہ کی الوہیت کا بت چور چور ہو رہا ہے جس میں سرفہرست فرعونیت ہے تو ہر طاغوت کی طرح وہی حربہ، ظلم وستم، زندان کے استعمال کا اظہار ہوا۔ منطق کے مقابلے میں جب مادی طاقت کی نوبت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے الٰہی طاقت کے مقابلے کے مظاہرے کا اظہار فرمایا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام لفظ رب استعمال کرتے ہیں۔ فرعون جواب میں لفظ اله (معبود) استعمال کرتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ رب ہی معبود ہوتا ہے۔

قَالَ اَوَلَوۡ جِئۡتُکَ بِشَیۡءٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ۚ۳۰﴾ ۳۰۔ موسیٰ نے کہا: اگر میں تیرے پاس واضح چیز (معجزہ) لے آؤں تو؟

اس بات سے فرعون کو پریشانی ہوئی ہوگی چونکہ وہ سرعام اس چیلنج کو رد نہیں کرسکتا تھا۔

قَالَ فَاۡتِ بِہٖۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۳۱﴾ ۳۱۔ فرعون نے کہا: اگر تم سچے ہو تو اسے لے آؤ۔

اگر تو دعوائے رسالت میں سچا ہے یا معجزہ پیش کرنے پر قادر ہونے کے دعویٰ میں سچا ہے۔

فَاَلۡقٰی عَصَاہُ فَاِذَا ہِیَ ثُعۡبَانٌ مُّبِیۡنٌ ﴿ۚۖ۳۲﴾ ۳۲۔ پس موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو وہ دفعتاً نمایاں اژدھا بن گیا۔

وَّ نَزَعَ یَدَہٗ فَاِذَا ہِیَ بَیۡضَآءُ لِلنّٰظِرِیۡنَ ﴿٪۳۳﴾ ۳۳۔ اور (گریبان سے) اپنا ہاتھ نکالا تو وہ تمام ناظرین کے لیے چمک رہا تھا۔

قَالَ لِلۡمَلَاِ حَوۡلَہٗۤ اِنَّ ہٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیۡمٌ ﴿ۙ۳۴﴾ ۳۴۔ فرعون نے اپنے گرد و پیش کے درباریوں سے کہا: یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔

یُّرِیۡدُ اَنۡ یُّخۡرِجَکُمۡ مِّنۡ اَرۡضِکُمۡ بِسِحۡرِہٖ ٭ۖ فَمَاذَا تَاۡمُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾ ۳۵۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے ذریعے تمہیں تمہاری سرزمین سے نکال باہر کرے تو اب تم کیا مشورہ دیتے ہو؟

تفسیر آیات

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو عظیم معجزے دیکھے تو فرعون بدحواس ہو گیا اور اپنی فرعونیت کے باوجود اپنے درباریوں کی طرف رجوع کیا اور رعونت چھوڑ کر مشورہ طلب کیا۔ مشورہ یہ ملا: جادو کے ذریعہ ہی اس معجزے کو باطل قرار دیا جا سکتا ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف آیت ۱۱۰۔

یُّرِیۡدُ اَنۡ یُّخۡرِجَکُمۡ: فرعون کہتا ہے: موسیٰ ہمیں مصر کی سرزمین سے نکالنا چاہتا ہے۔ جب کہ حضرت موسیٰ کا یہ مطالبہ تھا: ہمیں مصر کی سرزمین سے نکلنے، اپنے وطن جانے کی اجازت دو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے کہا: اس کائنات کا ایک ہی رب ہے جس کا میں نمائندہ ہوں تو فرعون کی بادشاہت کی قانونی حیثیت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو سورج دیوتا کا نمائندہ سمجھتا تھا اور سورج ان کے مذہب میں اقتدار کا رب تھا۔

قَالُوۡۤا اَرۡجِہۡ وَ اَخَاہُ وَ ابۡعَثۡ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ وہ کہنے لگے: اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دو اور شہروں میں ہرکارے بھیج دو۔

یَاۡتُوۡکَ بِکُلِّ سَحَّارٍ عَلِیۡمٍ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ کہ وہ تمام ماہر جادوگروں کو تمہارے پاس لے آئیں۔

قَالُوۡۤا اَرۡجِہۡ: تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف: ۱۱۲

فَجُمِعَ السَّحَرَۃُ لِمِیۡقَاتِ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ چنانچہ مقررہ دن کے مقررہ وقت پر جادوگر جمع کر لیے گئے۔

تفسیر آیات

مقررہ دن سے مراد فرعونیوں کے تہوار کا دن تھا۔ بغوی نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اتفاق سے وہ دن نوروز اور شنبہ کا دن تھا۔ (تفسیر طبری) بنابر صحت روایت حضرت موسیٰ کی فتح کا دن، نوروز کا دن تھا۔

وَّ قِیۡلَ لِلنَّاسِ ہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّجۡتَمِعُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اور لوگوں سے کہا گیا کیا تم جمع ہو جاؤ گے؟

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَۃَ اِنۡ

۴۰۔ شاید ہم جادوگروں کے پیچھے چلیں اگر یہ

كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝۴۰ — لوگ غالب رہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے لوگوں کے جذبات کو کس طرح ابھارا ہو گا اور سرکاری اعلان عام اور پروپیگنڈہ کے ذریعے اس روز کو عظیم سے عظیم تر بنانے کی کوشش کی گئی ہو گی کیونکہ ان کے زعم میں یہ روز ان کی فتح کا روز تھا۔

۲۔ نَتَّبِعُ السَّحَرَۃَ: تاکہ ہم جادوگروں کی پیروی کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار فرعون میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے فرعونی مذہب میں تزلزل آیا تھا۔

اپنے دین کے استحکام کے لیے ان کی ساری امیدیں جادوگروں سے وابستہ تھیں۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَۃُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝۴۱

۴۱۔ جب جادوگر آ گئے تو فرعون سے کہنے لگے: اگر ہم غالب رہے تو ہمارے لیے کوئی صلہ بھی ہو گا؟

قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝۴۲

۴۲۔ فرعون نے کہا: ہاں! اور اس صورت میں تو تم مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔

ان آیات کی تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں الاعراف: آیت ۱۱۴۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝۴۳

۴۳۔ موسیٰ نے ان سے کہا: تمہیں جو پھینکنا ہے پھینکو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باطل کو اپنا تیر چلانے کا موقع دیا۔ جب باطل اپنا ترکش خالی کر دے تو اس فریب کا پردہ چاک کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ وَ قَالُوْا بِعِزَّۃِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۴۴

۴۴۔ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں اور کہنے لگے: فرعون کے جاہ و جلال کی قسم بے شک ہم ہی غالب آئیں گے۔

تفسیر آیات

چنانچہ ان ساحروں نے اپنے جادو کا بھرپور مظاہرہ کیا جسے الاعراف میں وَجَآءُوۡ بِسِحۡرٍ عَظِیۡمٍ [۱] فرمایا اور سورہ طٰہ میں فرمایا:

فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی ○ [۲] پس موسیٰ نے اپنے اندر خوف محسوس کیا۔

کہ موسیٰ علیہ السلام کو خوف لاحق ہوا کہ کہیں باطل کا غلبہ نہ ہو جائے۔ اس آیت میں اس جادو کا مظاہرہ عظیم ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ جادو دیکھ کر وہ کہنے لگے: فرعون کی جاہ و جلالت کی قسم ہم جیت گئے۔

اہم نکات

۱۔ باطل ہمیشہ وقتی اوچھل کود کو اپنی جیت قرار دیتا ہے۔

فَاَلۡقٰی مُوۡسٰی عَصَاہُ فَاِذَا ہِیَ تَلۡقَفُ مَا یَاۡفِکُوۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ پھر موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو اس نے دفعتاً ان کے سارے خود ساختہ دھندے کو نگل لیا۔

تشریح کلمات

تَلۡقَفُ: (ل ق ف) لقف کے معنی کسی چیز کو ہوشیاری سے لینے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ تَلۡقَفُ: نگلنے کے معنوں میں ہے جسے لسان العرب نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

سورۃ الاعراف میں ہم نے بیان کیا ہے کہ بعض حضرات کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ عصائے موسیٰ، لاٹھیوں اور رسیوں کو نگلا نہیں تھا بلکہ ان کے حقیقت پر مبنی نہ ہونے اور جادو ہونے کو ظاہر کیا تھا۔ آگے وہ اس بات کی وضاحت نہیں کر سکے کہ ایک عصا سے یہ کام کیسے لیا گیا۔ اگر آپ معجزات کو طبیعاتی قوانین کے مطابق سمجھنا چاہتے ہیں تو عصائے موسیٰ سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ جادو اور حقیقت میں فرق نمایاں کرے۔

فَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیۡنَ ﴿ۙ۴۶﴾

۴۶۔ اس پر تمام جادوگر سجدے میں گر پڑے۔

قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ۴۷﴾

۴۷۔ کہنے لگے: ہم عالمین کے پروردگار پر ایمان لے آئے،

رَبِّ مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔

---

[۱] ۷ اعراف: ۱۱۶ [۲] ۲۰ طٰہ: ۶۷

ا۔ حقیقی رب کی معرفت کا لازمی نتیجہ سجدہ ہے۔ پھر رب العالمین کا اقرار توحید کا اقرار ہے اور رب موسیٰ، رسالت کا اقرار ہے۔

قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَهٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيۡرُكُمُ الَّذِىۡ عَلَّمَكُمُ السِّحۡرَ ۚ فَلَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ لَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۞

۴۹۔ فرعون نے کہا: میری اجازت سے پہلے تم موسیٰ کو مان گئے؟ یقیناً یہ (موسیٰ) تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے ابھی تمہیں (تمہارا انجام) معلوم ہو جائے گا، میں تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مخالف سمتوں سے ضرور کٹوا دوں گا اور تم سب کو ضرور سولی پر لٹکا دوں گا۔

تفسیر آیات

ا۔ جب عبادت گاہوں کے کاہنوں (جادوگروں) کی طرف سے ایمان کا اعلان ہوا تو فرعون کی شہنشاہیت کی قانونی حیثیت متزلزل ہوگئی کیونکہ وہ اپنے آپ کو سورج دیوتا کا شرعی اور قانونی نمائندہ تصور کرتا تھا۔

میری اجازت سے پہلے ایمان کیوں لائے۔ موسیٰ تمہارا بڑا جادوگر ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا۔

یہ دونوں باتیں رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لیے ہیں ورنہ کسے نہیں معلوم کہ یہ جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام شاگرد نہیں تھے۔ ان کا تعلق موسیٰ علیہ السلام سے نہیں خود فرعون سے تھا۔ نہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں میں کوئی سابقہ ربط رہ چکا تھا۔

۳۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ: یہ دھمکی اس غرض سے دی گئی کہ وہ اپنے اس ایمان سے تائب ہو جائیں اور یہ اقرار کر لیں کہ ہمیں یہ سب کچھ موسیٰ نے پڑھایا تھا لیکن فرعون اس میں کامیاب نہیں ہوا۔

قَالُوۡا لَا ضَيۡرَ ۫ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ ۞

۵۰۔ وہ بولے کوئی حرج نہیں ہم اپنے رب کے حضور لوٹ جائیں گے۔

ا۔ کوئی پرواہ نہیں! خواہ ہاتھ پاؤں کٹ جائیں یا سولی چڑھ جائیں۔ جس کا نتیجہ رب کے پاس پہنچ جانا ہو اس موت سے ڈرا نہیں کرتے بلکہ موت کی تمنا کی جاتی ہے۔

اِنَّا نَطۡمَعُ اَنۡ يَّغۡفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ

۵۱۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری خطاؤں

اَنۡ کُنَّاۤ اَوَّلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۱﴾ ع ۳/۱۸ سے درگزر فرمائے گا کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لائے ہیں۔

تفسیر آیات

۲۔ قوم فرعون میں اول المؤمنین ہونے کا شرف حاصل ہوا اور اول المؤمنین ہونے کی وجہ سے ایثار و ایمان کی مثال قائم ہو جاتی ہے جسے آنے والی نسلیں مشعل راہ بناتی ہیں۔ اس لیے مغفرت کی امید کا اظہار ہوا۔

اہم نکات

۱۔ ایمان و ایثار کے بعد مغفرت کی امید رکھنی چاہیے۔

اس واقع کے بعد سے لے کر بنی اسرائیل کے خروج تک کے واقعات سورۃ الاعراف میں بیان ہوئے ہیں۔

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡۤ اِنَّکُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو لے کر رات کو نکل پڑیں یقیناً آپ کا تعاقب کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

واقعہ سحر میں کامیابی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک عرصہ مصر میں گزارا۔ بنی اسرائیل، اس واقعہ کے بعد حضرت موسیٰ پر علیہ السلام ایمان لے آئے اور فرعون کی اسیری سے نجات کے لیے ساری امیدیں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وابستہ رکھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملتا ہے کہ رات کے وقت نکل پڑیں اور ساتھ یہ خبر بھی دی کہ فرعون تمہارا تعاقب کرنے والا ہے۔

فَاَرۡسَلَ فِرۡعَوۡنُ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ (ادھر) فرعون نے شہروں میں ہرکارے بھیج دیے،

۱۔ فرعون بنی اسرائیل کے تعاقب کے لیے شہروں سے فوجیں بلاتا ہے اور ساتھ یہ اعلان بھی کرتا ہے:

اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ لَشِرۡذِمَۃٌ قَلِیۡلُوۡنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ (ان کے ساتھ یہ کہلا بھیجا) کہ بے شک یہ لوگ چھوٹی سی جماعت ہیں۔

۲۔ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں۔ ان کی سرکوبی ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل پوری قوم فرعون کے لشکر کے مقابلے میں چھوٹی جماعت تھی۔ اس سے یہ روایت قرین واقع معلوم نہیں ہوتی جس میں کہا گیا ہے بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ سے زائد تھی۔

وَ اِنَّهُمۡ لَنَا لَغَآئِظُوۡنَ ﴿۵۵﴾ ۵۵۔ اور انہوں نے ہمیں بہت غصہ دلایا ہے۔

۳۔ فرعون کو غصہ اس بات نے دلایا کہ ہماری مرضی کے خلاف ہمارے ہاتھ سے نکلنا چاہتے ہیں۔ ہماری غلامی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ہماری اسیری سے بھاگنا چاہتے ہیں۔

وَ اِنَّا لَجَمِیۡعٌ حٰذِرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ ۵۶۔ اور اب ہم سب پوری طرح مستعد ہیں۔

۴۔ حٰذِرُوۡنَ : کے معنی مستعد سے کیے ہیں کہ اب ہم انہیں اپنی اسیری میں دوبارہ واپس لانے اور انہیں اس جرم کی سزا دینے کے لیے پوری طرح مستعد ہیں۔

فَاَخۡرَجۡنٰهُمۡ مِّنۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۵۷﴾ ۵۷۔ چنانچہ ہم نے انہیں باغوں اور چشموں سے نکال دیا ہے۔

وَّ کُنُوۡزٍ وَّ مَقَامٍ کَرِیۡمٍ ﴿۵۸﴾ ۵۸۔ اور خزانوں اور بہترین رہائش گاہوں سے بھی۔

تفسیر آیات

چنانچہ اس الٰہی تدبیر کے نتیجے میں فرعون اور فرعونی اپنے باغات، چشموں، خزانوں اور عمدہ رہائش گاہوں (مَقَامٍ کَرِیۡمٍ) کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں نکل آئے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ نہ صرف بنی اسرائیل کو اپنی غلامی میں واپس نہیں لے سکیں گے بلکہ وہ اپنے عیش و نوش میں بھی واپس نہیں جا سکیں گے۔

کَذٰلِکَ ؕ وَ اَوۡرَثۡنٰهَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۵۹﴾ ۵۹۔ اس طرح ہم نے بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا۔

تفسیر آیات

فرعونیوں کو ان کے باغات اور چشموں سے نکالنے کے بعد بنی اسرائیل کو فلسطین میں ان جیسے

باغات اور چشموں کا وارث بنایا، خود انہیں چیزوں کا نہیں کیونکہ فرعون کے غرق آب ہونے کے بعد بنی اسرائیل مصر واپس نہیں گئے۔ اس پر قرآنی تصریحات موجود ہیں کہ یہ قوم سمندر عبور کر کے وادی سینا کی طرف نکل گئی، پھر فلسطین میں آباد ہو گئی۔ موجودہ توریت کی بھی تصریح یہی ہے۔ کسی تاریخ میں بھی ان کے مصر واپس جانے کا ذکر نہیں ملتا۔

فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِيۡنَ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی (فرعون کے) لوگ ان کے تعاقب میں نکل پڑے۔

ا۔ صبح طلوع آفتاب کے ساتھ یہ لوگ بنی اسرائیل کے تعاقب میں نکلے۔ مُّشۡرِقِيۡنَ کے معنی بعض نے یہ کیے ہیں کہ فرعونیوں نے بنی اسرائیل کا مشرق کی طرف پیچھا کیا۔ چونکہ بیت المقدس مصر سے مشرق کی طرف ہے۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الۡجَمۡعٰنِ قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤى اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ جب دونوں گروہ ایک دوسرے کو دکھائی دینے لگے تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا: ہم تو پکڑے جانے والے ہیں۔

۲۔ قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤى: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابیوں نے کہا: ہم تو پکڑے جانے والے ہیں۔ ظاہری صورت تو یہی تھی۔ ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف لشکر فرعون کا سمندر ہے۔ فرعون، جو ان کی اولاد کو قتل کرتا رہا، ان پر اس وقت مظالم کرتا رہا جب بنی اسرائیل اس کی اسیری میں پر امن تھے۔ اب تو ہم ان کی زد میں آنے والے ہیں۔ اصحاب موسیٰ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فادار اصحاب تھے تاہم رازداں نہیں تھے۔ ظاہری حالات دیکھ کر گھبرانا قدرتی بات ہے مگر صرف رازداں کو علم تھا کہ کون کس کی زد میں آنے والا ہے۔

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ موسیٰ نے کہا: ہرگز نہیں! میرا پروردگار یقیناً میرے ساتھ ہے، وہ مجھے راستہ دکھا دے گا۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: مَعِىَ رَبِّىۡ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ یہ نصرت اور حمایت کی معیت ہے۔ ابتدائے رسالت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا: اِنَّنِىۡ مَعَكُمَاۤ ....[1] میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔

[1] ۲۰ طٰہ: ۴۶

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی خصوصی معیت پر بھروسہ تھا کہ اس مشکل سے نکلنے کا راستہ وہی بتا دے گا۔

فَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡبَحۡرَ ؕ فَانۡفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرۡقٍ کَالطَّوۡدِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ پھر ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی اپنا عصا سمندر پر ماریں چنانچہ دریا پھٹ گیا اور اس کا ہر حصہ عظیم پہاڑ کی طرح ہو گیا۔

تشریح کلمات

انفلق: (ف ل ق) الفلق کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے اور اس کے ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ کرنے کے ہیں۔

الطود: (ط و د) الطود بلند پہاڑ۔

تفسیر آیات

بنی اسرائیل جب مشکل ترین صورت حال میں دوچار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو حکم دیا اپنا عصا سمندر پر ماریں۔ بنی اسرائیل کو ایک واضح معجزے کے ذریعہ نجات دلانا ارادہ الٰہی سے مربوط ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہے کہ یہ نجات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمل سے مربوط ہو۔

چنانچہ عصائے موسیٰ مارنے سے سمندر شق ہو گیا اور دونوں طرف پانی بلند پہاڑوں کی شکل میں کھڑا ہو گیا۔ نہ صرف سمندر شق ہو گیا بلکہ راستہ خشک بھی ہو گیا تھا۔ سورہ طٰہ میں فرمایا:

فَاضۡرِبۡ لَہُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا ...[1] ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنا دیں۔

لہٰذا اس واضح عبارت اور صراحت کے خلاف یہ کہنا کہ بنی اسرائیل ساحل سمندر سے بہ سلامت گزر گئے اور فرعونیوں کو سمندر سے اٹھنے والے ایک طوفان نے غرق کر دیا یا سمندر کے مدوجزر سے غرق ہو گیا، قرآن کی صراحت کو مسترد کر دینے کے مترادف ہے۔

وَ اَزۡلَفۡنَا ثَمَّ الۡاٰخَرِیۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اور وہاں ہم نے دوسرے گروہ کو بھی نزدیک کر دیا،

وَاَزۡلَفۡنَا: فرعونیوں کو سمندر کے اس راستے کے قریب لے آیا۔ ثَمَّ جہاں سمندر شق ہو گیا تھا وہاں تک ان کو لے آیا اور اسی راستہ پر چلا دیا۔

وَ اَنۡجَیۡنَا مُوۡسٰی وَ مَنۡ مَّعَہٗۤ

۶۵۔ پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے تمام ساتھیوں

---

[1] ۲۰ طٰہ: ۷۷

اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۶۵﴾ کو بچا لیا۔

ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ﴿۶۶﴾ ۶۶۔ اس کے بعد دوسروں کو غرق کر دیا۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۷﴾ ۶۷۔ اس واقعے میں ایک نشانی ہے پھر بھی ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائے۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتھیوں کو نجات دینے اور فرعون و فرعونیوں کو غرق کرنے میں اس بات کی نشانی اور دلیل تھی کہ اللہ ہی رب العالمین ہے۔ نجات دینا، عذاب دینا، موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے، فرعون اور فرعونیوں کے خود ساختہ خداؤں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ: ان تمام معجزات اور دلائل کے باوجود اکثر لوگوں نے اللہ کو رب العالمین تسلیم نہیں کیا، اپنے موہوم ارباب کے ساتھ وابستہ رہے۔

ع ۸ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۶۸﴾ ۶۸۔ اور یقیناً آپ کا پروردگار ہی بڑا غالب آنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

اپنے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف خطاب کا رخ ہو گیا۔ جس میں دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی:

i۔ آپ کا رب، الۡعَزِیۡزُ ہے، بالادست ہے۔ جس طرح قوم فرعون کا انجام ہلاکت پر منتہی ہو گیا، ہر مجرم قوم کا یہی حشر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر غالب آنے والا کوئی نہیں۔

ii۔ الرَّحِیۡمُ: وہ جہاں دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے بالادست ہے وہاں اپنے بندوں کو نجات دینے کے لیے مہربان ہے۔ لہٰذا اللہ کی قہاریت کے تحت دشمن کی نابودی اور رحیمیت کے تحت دوستوں کی نجات کی توقع رکھو۔

اہم نکات

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تمام معجزے دکھائے جو اللہ ہی کے مدبر اور رب ہونے کے دلائل پر مبنی تھے۔

۲۔ اللہ اپنی قہاریت کے تحت دشمنوں کو تباہ کرتا ہے اور رحیمیت کے تحت دوستوں کو نجات دیتا ہے۔

وقف لازم وَ اتۡلُ عَلَیۡہِمۡ نَبَاَ اِبۡرٰہِیۡمَ ﴿۶۹﴾ ۶۹۔ اور انہیں ابراہیم کا واقعہ (بھی) سنا دیجیے:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾	۷۰۔ انہوں نے اپنے باپ (چچا) اور اپنی قوم سے کہا: تم کس چیز کو پوجتے ہو؟
قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾	۷۱۔ انہوں نے جواب دیا: ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور اس پر ہم قائم رہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ: قریش کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ سنا دیں۔ اول تو قریش حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں، ان کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہیں اور ان کی پیروی کرنے کے بھی مدعی ہیں۔ ثانیاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ میں ایسے نقوش ہیں جنہیں سامنے رکھنے سے جرأت اور ہمت میں اضافہ ہوتا اور ان کی سیرت میں اپنے مشن کی کامیابی کی نوید ملتی ہے۔

۲۔ مَا تَعْبُدُوْنَ: اپنے چچا اور قوم سے ایک سوال اٹھاتے ہیں جس کا مقصد گفتگو کو آگے چلانا ہے ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو علم ہے کہ وہ کس چیز کی پوجا کرتے ہیں۔

۳۔ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا: کہا: ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔

عہد ابراہیمی میں لوگ ستارہ پرست تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ روئے زمین پر گزرنے والے واقعات کا ستاروں کے ساتھ تعلق ہے اس سے وہ ستاروں کی تعظیم کرنے لگے۔ پھر وہ انہی ستاروں کو مدبر عالم کہنے لگے۔ پھر ان کی پوجا شروع ہو گئی۔ چونکہ ستارے غروب ہو کر غائب ہو جاتے ہیں اس لیے ان کی شبیہ بنانے کی رسم بھی شروع ہو گئی۔ پھر رفتہ رفتہ مدبریت کے شعبے بنائے گئے۔ ان میں سے کسی ستارے کو کسی ایک شعبہ سے مربوط سمجھا گیا۔ چنانچہ ستارہ زهره کیف و سرور کا رب ہے۔ اسے ایک جوان لڑکی کی شکل دے دی گئی۔ خون خرابہ کو مریخ کے ساتھ اور علم و حرمت کو عطارد کے ساتھ مربوط سمجھا گیا وغیرہ۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾	۷۲۔ ابراہیم نے کہا: جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں؟
اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾	۷۳۔ یا تمہیں فائدہ یا ضرر دیتے ہیں؟
قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾	۷۴۔ انہوں نے کہا: (نہیں) بلکہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے پایا ہے۔

تفسیر آیات

کسی کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندگی کرنے والے کے امور زندگی اس معبود کے ہاتھ میں ہیں، اسے راضی رکھنے کے لیے اس کی عبادت کی جائے۔ حاجت کے وقت اسے پکارا جائے تا کہ اس پکار کو سن کر وہ اس کی حاجت روائی کرے۔ یہ بت چونکہ بے شعور جامد ہوتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی تدبیری نقطے کو سامنے رکھ کر فرمایا: کیا وہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو یا وہ تمہیں نفع وضرر پہنچا سکتے ہیں؟

قَالُوۡا بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا: ان کے پاس کوئی منطق اور دلیل نہیں تھی۔ صرف اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید کا حوالہ دیا۔

قَالَ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا کُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ ابراہیم نے کہا: کیا تم نے ان کی حالت دیکھی ہے جنہیں تم پوجتے ہو؟

اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمُ الۡاَقۡدَمُوۡنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ تم اور تمہارے گزشتہ باپ دادا بھی (پوجتے رہے ہیں)۔

فَاِنَّہُمۡ عَدُوٌّ لِّیۡۤ اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ یقیناً یہ سب میرے دشمن ہیں سوائے رب العالمین کے،

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم سوچ لیا ہے کہ جنہیں پوجتے ہو، تم اور تمہارے باپ دادا میرے دشمن ہیں۔ جنہیں تم پوجتے ہو ان کی بندگی اور جن کا تم حوالہ دیتے ہو ان کی اندھی تقلید، یہ دونوں میرے لیے مہلک ہیں۔ ان سے اسی طرح بیزار ہوتا ہوں جس طرح ایک دشمن سے بیزار ہوا جاتا ہوتا ہے۔ یہ بت میری دعوت کی راہ میں رکاوٹ اور دشمنوں کی طرح میرے لیے سد راہ ہیں۔ اسی طرح یہ بت اپنی پوجا کرنے والوں کے لیے بھی سد راہ ہیں۔ اس لیے یہ ان کے بھی دشمن ہیں ورنہ بت جمادات ہیں۔ نہ دوست بن سکتے ہیں نہ دشمن۔

اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ: اس کائنات میں رب العالمین ہی میرا دوست ہے۔ اسی سے وابستہ رہتا ہوں۔ کیوں؟

الَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَہُوَ یَہۡدِیۡنِ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی مجھے ہدایت

وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۝۷۹
وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝۸۰
وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝۸۱

دیتا ہے،
۷۹۔ اور وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے،
۸۰۔ اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔
۸۱۔ اور وہی مجھے موت دے گا پھر مجھے زندگی عطا کرے گا۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام ربّ العالمین سے اپنی وابستگی کے دلائل پیش فرما رہے ہیں۔

ا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ میرا خالق ہے جسے مشرکین بھی مانتے ہیں لہٰذا وہ میرے امور زندگی کا مدبر ہے کیونکہ خلق و تدبیر ناقابل تفریق ہے۔ جو خالق ہے وہی تدبیر کر سکتا ہے اور جو خالق نہیں وہ ان امور کی تدبیر ہی نہیں کر سکتا جنہیں اس نے وجود نہیں دیا۔ ان کے رگ و پے کو وہ کیا جانے۔

۲۔ فَهُوَ يَهْدِيْنِ: ان تدبیری امور میں ایک اہم چیز ہدایت و رہنمائی ہے۔ اس دنیا کی زندگی کے ہر قدم اور آخرت کی نجات و سعادت کے لیے اس کی ہدایت کی ضرورت ہے جو اس نے میرے وجود میں ودیعت فرمائی ہے۔ فَهُوَ يَهْدِيْنِ کی فاء تفریع سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت، تخلیق کا نتیجہ ہے چونکہ وہی میرا خالق ہے پس وہی میری ہدایت کرتا ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰي كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝[1] — موسیٰ نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

اس کی طرف سے ملنے والی ہدایات میں میری بقا و ارتقا کا راز مضمر ہے۔ اس کی عطا کردہ ہدایت نہ ہوتی تو میں نہ ماں کی چھاتی چوسنے کا سلیقہ رکھتا، نہ میرا معدہ ماں کے دودھ کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا۔ اس کی عنایت کردہ ہدایت نہ ہوتی تو میرے پاس ایسا ضمیر نہ ہوتا جس سے میں اپنے خالق اپنے معبود کو پہچان سکوں۔

۳۔ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ: میرا رب وہ ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ میرے جسم کی ضرورت کی تمام چیزیں خلق فرماتا ہے اور انہیں میری دست رسی میں رکھتا ہے۔ اشارہ ہے مشرکین کے اس عقیدے کی رد کی طرف جو اپنے بعض معبودوں کو رزق کا رب سمجھتے ہیں۔

۴۔ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ: جب میں اپنی نادانی کی وجہ سے فطرت الٰہی کی خلاف ورزی کر

---

[1] ۲۰ طٰہٰ: ۵۰

بیٹھتا ہوں اور مریض ہو جاتا ہوں یا کسی ناگہانی حادثے کی وجہ سے میں مریض ہو جاتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔ مشرکین کے اس نظریے کی رد، جو شفا اپنے بعض معبودوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

۵۔ وَالَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ: میرا رب صرف اس زندگی کا مدبر نہیں ہے بلکہ کل دنیوی و اخروی زندگی کا مدبر ہے۔ موت و حیات اس کی تدبیر کا ایک اہم حصہ ہیں۔

اہم نکات

۱۔ میرا رب وہ اللہ ہے جس کے ہاتھ میں میری خلقت، ہدایت، رزق، شفا، حیات اور موت ہے اور جو میری امیدوں کا مرکز ہے۔

وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ اور میں اسی سے امید رکھتا ہوں کہ روز قیامت میری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ: میرا رب وہ ہے جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ میری خطا معاف فرمائے گا۔

واضح رہے انبیاء علیہم السلام معصوم عن الخطا ہیں۔ معصوم جب اپنی طرف کسی خطا یا گناہ کی نسبت دیتے ہیں تو یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ وہ خطا اور گناہ انہی معنوں میں ہے جن کا ہم مرتکب ہوتے ہیں۔ ہماری خطا اور گناہ مولا کی نافرمانی کے معنوں میں ہے جب کہ معصوم کی خطا اور گناہ، نافرمانی کے معنوں میں نہیں بلکہ آداب بندگی کے تحت بندگی کا حق ادا نہ ہونے کا اعتراف ہے کہ کبھی غیر عبادت میں کوئی وقت گزرا ہے۔ کھانے پینے، سونے میں۔ معصوم اسے خطا تصور کرتے ہیں یا دن رات عبادت کر کے یہ تصور کرتے ہیں کہ عبادت کا حق ادا نہ ہوا۔ وہ اللہ کی عظمتوں اور نعمتوں کے مقابلے میں اپنی عبادت کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ۔[1] ہم نے تیری اس طرح بندگی نہیں کی کہ بندگی کا حق ادا ہو جائے۔

اہم نکات

۱۔ حقیقی بندگی یہ ہے کہ ہر ممکن عبادت کر کے اسے ہیچ سمجھا جائے۔

[1] مستدرک الوسائل ۱: ۱۳۴

رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُکۡمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۳﴾

۸۳۔ پروردگارا! مجھے حکمت عطا کر اور صالحین میں شامل فرما۔

تفسیر آیات

ا۔ حُکۡمًا: حکم کے بارے میں اقوال بہت زیادہ ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کے معنی حقائق کا فہم ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام رب کی تعریف بیان کرنے کے بعد عملاً اسی سے اپنی وابستگی کا اظہار فرماتے ہیں اور اپنے لیے ایک ایسی چیز کی درخواست کرتے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اولوالعزم نبی کی نظر میں سب سے اہم ہے۔ وہ ہے: رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُکۡمًا۔ پروردگار مجھے فہم عنایت فرما کہ میں اس راز کو سمجھوں جس کے بعد میرا ہر فیصلہ صائب ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا سن لی:

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اِبۡرٰهِیۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ وَ کُنَّا بِهٖ عٰلِمِیۡنَ ۚ﴿۵۱﴾ [1]

اور تحقیق ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے کامل عقل عطا کی اور ہم اس کے حال سے باخبر تھے۔

حکم یعنی حقائق کا فہم ایک ایسی اہم چیز ہے جو انبیاء کو عنایت ہوتی ہے۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیۡنٰهُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ... [2]

اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے انہیں علم اور حکمت عطا کی۔

وَ لُوۡطًا اٰتَیۡنٰهُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ... [3]

اور لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا۔

فَفَهَّمۡنٰهَا سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ کُلًّا اٰتَیۡنَا حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ... [4]

تو ہم نے سلیمان کو اس کا فیصلہ سمجھا دیا اور ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا کیا۔

۲۔ وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ: جس صلاح کی حضرت ابراہیم علیہ السلام اول الصالحین درخواست کر رہے ہیں وہ ایسی صلاح ہے جو رہتی دنیا تک تمام عالمین کے لیے صلاح کا نمونہ ہو۔ شیخ طوسی علیہ الرحمۃ صلاح کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

و هو الاستقامة علی ما امر اللّٰه به و دعا الیه۔

صلاح، اللہ نے جس چیز کا حکم دیا اور جس چیز کی طرف دعوت دی ہے اس میں استقامت دکھانے کو کہتے ہیں۔

الصالحین سے مراد وہ انبیاء ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے گزرے ہیں۔ حضرت ابراہیم اگرچہ جلیل القدر نبی، خلیل خدا ہیں تاہم اپنے آباء و اجداد سے وابستگی کو اپنے لیے شرف سمجھتے ہیں۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۵۱ [2] ۱۲ یوسف: ۲۲ [3] ۲۱ انبیاء: ۷۴ [4] ۲۱ انبیاء: ۷۹

وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ اور آنے والوں میں مجھے حقیقی ذکر جمیل عطا فرما۔

تفسیر آیات

میرے لیے آخر میں آنے والی امتوں میں لسان صدق عطا فرما یعنی ذکر جمیل۔ یہ دعوت کے تسلسل کی دعا ہے کہ جس لسان صدق کی ابتدا انہوں نے خود کی تھی اس کا سلسلہ ان کی نسلوں میں جاری و ساری رہے۔ لسان صدق کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: آنے والوں میں مجھے سچی زبان عطا کر۔ سچی زبان توحید کی دعوت کی زبان ہے:

وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِیۡ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿﴾[۱]

اس (توحید پرستی) کو ابراہیم کی نسل میں کلمہ باقیہ قرار دیا تاکہ وہ (اللہ کی طرف) رجوع کریں۔

چنانچہ آج روئے زمین پر جتنے بھی توحید پرست لوگ ہیں وہ ابراہیم علیہ السلام کی تحریک کا نتیجہ ہیں۔

علامہ بدخشی نے مفتاح النجاۃ میں، امرتسری نے ارجح المطالب صفحہ ۷۱ پر کشفی نے مناقب مرتضوی صفحہ ۵۵ پر روایت کی ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ شیعہ مصادر میں تو متعدد راویوں سے یہ روایت موجود ہے۔

اہم نکات

۱۔ محمد و آل محمد دعائے ابراہیم ہیں: انا دعوۃ ابراھیم۔ (حدیث)[۲]

وَاجۡعَلۡنِیۡ مِنۡ وَّرَثَۃِ جَنَّۃِ النَّعِیۡمِ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں قرار دے۔

تفسیر آیات

جنت کے لیے دعا کرنا انبیاء علیہم السلام کی سیرت ہے جہاں عاشقان خدا کے لیے اللہ کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت ہو گی۔

مِنۡ وَّرَثَۃِ جَنَّۃِ: جنت کے وارثوں میں قرار دینے کی دعا میں شاید یہ نکتہ پنہاں ہے کہ انسان خواہ مقام خلیلی پر ہی فائز کیوں نہ ہو جنت کا بذات خود نہیں، از روئے وراثت مستحق ہو سکتا ہے۔ حضرت خلیل علیہ السلام کی طرف سے تواضع ہے کہ مجھے جنت کا وارث بنا دے۔ جنت کی وراثت کے بارے میں سورہ مومنون آیت

۱؎ ۴۳ زخرف: ۲۸ ۲؎ بحار الانوار ۳۸: ۶۲

۱۰ ملاحظہ فرمائیں۔

وَاغْفِرْ لِاَبِیْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۸۶﴾ ۸۶۔ اور میرے باپ (چچا) کو بخش دے کیونکہ وہ گمراہوں میں سے ہے۔

تفسیر آیات

سورہ انعام آیت ۷۴ میں اس بات کی تفصیل گزر گئی کہ آذر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو والد نہیں، چچا تھے اور یہ دعا ابتدائے رسالت کے دنوں کی ہے۔ بعد میں جب آذر کفر کی حالت میں مر گیا تو اس وقت ابراہیم نے آذر سے برائت اختیار فرمائی:

فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۔۔[۱] لیکن جب ان پر یہ بات کھل گئی کہ وہ دشمن خدا ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے۔

وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ ۸۷۔ اور مجھے اس روز رسوا نہ کرنا جب لوگ (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔

تفسیر آیات

وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیامت کی ہولناکی کا صحیح ادراک ہے۔ ابوالانبیاء ہونے کے باوجود اللہ کے حضور کس انداز سے عاجزی کرتے ہیں کہ قیامت کے دن تمام خلائق کے سامنے مجھے رسوا نہ کر۔

فرزند خلیل حضرت امام زین العابدین علیہ السلام دعا میں فرماتے ہیں:

وَ لَا تُخزِنِی یَوْمَ تَبْعَثُنِی لِلِقَائِكَ وَلَا تَفْضَحْنِی بَیْنَ یَدَیْ اَوْلِیَائِكَ۔۔۔[۲] تو جس دن مجھے اپنی ملاقات کے لیے اٹھائے گا تو مجھے رسوا نہ کر اور اپنے دوستوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کر۔

اس دعا میں بین یدی اولیائك کے جملے سے اس دعا کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ رسوائی سے مراد "اولیاء اللّٰہ کے درمیان" ہو سکتا ہے۔ اولیا اللہ کی صف میں درجات میں کمی نہ آئے۔ ان کے درمیان کمتر درجہ حاصل ہونا رسوائی تصور فرماتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قیامت سے معصوموں کو بھی خوف آتا ہے۔ بے خوف ہے تو غافل گنہگار۔

---

[۱] ۹ توبة: ۱۱۴ [۲] صحیفه سجادیه۔ ۴۷ دعائے یوم عرفة

يَوۡمَ لَا يَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ ۸۸۔اس روز نہ مال کچھ فائدہ دے گا اور نہ اولاد۔

تفسیر آیات

دنیا کی زندگی، دنیوی علل و اسباب کی زندگی ہے جس میں مال اور اولاد کام آتے ہیں۔ آخرت کی زندگی، اخروی علل و اسباب کی زندگی ہے۔ وہاں کے علل و اسباب میں مال و اولاد کا کوئی کردار نہیں ہے۔ قیامت کے دن اگر کسی کے پاس مال، اولاد زیادہ ہیں تو اس کے کام نہیں آئیں گے۔

یہ دوسری بات ہے کہ دنیا کی زندگی میں مال و اولاد کے ذریعے اعمال صالح بجا لائے جا سکتے ہیں اور اولاد باقیات الصالحات میں شمار ہوتی ہے۔ یہ تو آپ نے دنیا میں مال و اولاد کو آخرت کے لیے مفید بنایا، آیت کا نقطہ کلام یہ ہے کہ اگر مال و اولاد سے آخرت کے لیے استفادہ نہیں کیا ہے تو قیامت کے دن یہ آپ کو فائدہ نہیں دیں گے۔

اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۹﴾ ۸۹۔سوائے اس کے جو اللہ کے حضور قلب سلیم لے کر آئے۔

تفسیر آیات

آخرت میں صرف اس قلب کی قدر ہو گی جس میں غیر اللہ کا شائبہ نہ ہو، جو ہر قسم کے شرک خفی و جلی سے پاک ہو۔ حب دنیا بھی شرک خفی میں آتی ہے۔ چنانچہ قلب سلیم کے بارے میں حدیث میں آیا ہے:

هُوَ الْقَلْبُ الَّذِی سَلِمَ مِنْ حُبِّ الدُّنْيَا۔[1] قلب سلیم وہ ہے جو حب دنیا سے سالم ہو۔

دوسری حدیث میں آیا ہے:

اَلَّذِی يَلْقَی رَبَّهُ وَ لَيْسَ فِيهِ اَحَدٌ سِوَاهُ...۔[2] قلب سلیم وہ دل ہے کہ اپنے رب سے ملاقات کرے تو اس میں اپنے رب کے سوا کوئی نہ ہو۔

انسان کے اعمال و کردار اس کے شعور کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس شعور کے مطابق عزم و ارادے ہوتے ہیں۔ لہٰذا قلب ہی پر تمام اعمال و کردار کا دارومدار ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قلب سلیم ہی کردار ساز ہوتا ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۲: ۴۰ [2] الکافی ۲: ۱۶

وَ اُزۡلِفَتِ الۡجَنَّۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۹۰﴾ — ۹۰۔اس روز جنت پرہیزگاروں کے نزدیک لائی جائے گی۔

تشریح کلمات

اُزۡلِفَتِ: (ز ل ف) الزلفة کے معنی قرب اور مرتبہ کے ہیں۔

تفسیر آیات

عالم آخرت میں زمان و مکان کا وہ تصور نہ ہوگا جو عالم دنیا میں ہے۔ جنت کا نزدیک کرنا بتاتا ہے کہ وہاں مسافتوں کا وہ مفہوم نہ ہوگا جو یہاں ہے۔ لہٰذا متقین جس میدان حشر میں ہوں گے وہاں سے جنت میں داخل ہونے کے لیے کوئی مسافت طے کرنا نہیں پڑے گی۔ اُزۡلِفَتِ الۡجَنَّۃُ جنت نزدیک لائی جائے گی سے معلوم ہوتا ہے کہ متقین کو جنت کے نہیں بلکہ جنت کو متقین کے نزدیک لایا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ متقین کے جنت سے زیادہ، جنت متقین کی مشتاق ہوگی۔

وَ بُرِّزَتِ الۡجَحِیۡمُ لِلۡغٰوِیۡنَ ﴿۹۱﴾ — ۹۱۔ اور جہنم گمراہوں کے لیے ظاہر کی جائے گی۔

تشریح کلمات

غاوین: (غ و ی) الغوی، گمراہ غلط رو کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

جہنم کے بارے میں بھی مسافت کا وہ مفہوم نہ ہوگا۔ اس لیے فرمایا: جہنم ظاہر کی جائے گی۔ تعبیر کا فرق بتاتا ہے کہ جنت متقین کا استقبال کرے گی جب کہ جہنم اپنے پورے غیض و غضب کے ساتھ نمودار ہو جائے گی۔ چنانچہ جنت کے لیے اُزۡلِفَتِ قریب کرنے اور جہنم کے لیے بُرِّزَتِ ظاہر کرنے کی تعبیر اختیار فرمائی۔

وَ قِیۡلَ لَہُمۡ اَیۡنَمَا کُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿ۙ۹۲﴾ — ۹۲۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا: تمہارے وہ معبود کہاں ہے؟

مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ ہَلۡ یَنۡصُرُوۡنَکُمۡ اَوۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿ؕ۹۳﴾ — ۹۳۔ اللہ کو چھوڑ کر (جنہیں تم پوجتے تھے) کیا وہ تمہاری مدد کر رہے ہیں یا خود کو بچا سکتے ہیں؟

تفسیر آیات

عذاب کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جن معبودوں کی خاطر عمر بھر حق سے دشمنی کی ہے، جی بھر کر اس کی مخالفت کی ہے اور اپنے معبودوں کے نہ ماننے والوں کے خلاف ہر حربہ استعمال کیا ہے، ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ کامیاب، باوقار عزت وتکریم کے ساتھ ہیں اور یہ ذلت وخواری میں ناکامی کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت یہ طنز، یہ طعنہ سننے کو ملتا ہے: کہاں ہیں تمہارے معبود!! کیا وہ آج اس مشکل دن میں تمہاری مدد نہیں کریں گے؟ یا کم سے کم خود کو بچالیں۔

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾
وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾

۹۴۔ چنانچہ یہ خود اور گمراہ لوگ منہ کے بل جہنم میں گرا دیے جائیں گے۔
۹۵۔ اور سارے ابلیسی لشکر سمیت۔

تشریح کلمات

کبکبوا: (ك ب ب) الكب کے معنی کسی کو منہ کے بل گرانے کے ہیں۔ کبکب، کبَّ کی تکرار ہے برائے تاکید۔

تفسیر آیات

۱۔ چنانچہ جن بتوں کی یہ لوگ پوجا کرتے تھے ان کے ساتھ جہنم میں منہ کے بل گرا دیے جائیں گے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ...[۱] — تحقیق تم اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے تھے جہنم کا ایندھن ہیں۔

ان کے ہمراہ جہنم میں ابلیس کے سارے لشکر ہوں گے۔ اَجْمَعُوْنَ یعنی ابلیس کے جن اور انس دونوں لشکروں پر مشتمل سب ان کے ساتھ منہ کے بل گریں گے۔

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾
تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾
اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾

۹۶۔ اور وہ اس میں جھگڑتے ہوئے کہیں گے:
۹۷۔ قسم بخدا! ہم تو صریح گمراہی میں تھے۔
۹۸۔ جب ہم تمہیں رب العالمین کے برابر درجہ دیتے تھے۔

---
[۱] ۲۱ انبیاء: ۹۸

۲۔ جھگڑا اور خصومت ناکامی کا لازمہ ہے۔ چنانچہ جہنم والوں کے باہمی جھگڑوں کو ایک حقیقت کے طور پر بیان فرماتا ہے:

لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهۡلِ النَّارِ ۝[1] جہنمیوں کے باہمی جھگڑے کی حتمی بات ہے۔

اہل آتش کے باہمی جھگڑے حتمی اور حقیقت ہیں۔ چنانچہ شکست خوردہ جماعت اپنی شکست اور رسوائی کے بعد آپس میں جھگڑتی ہے جب کہ کامیابی حاصل کرنے والی جماعت خوشی کا جشن مناتی ہے۔

۳۔ اب وہ قسم کھا کر کہیں گے کہ ان خود ساختہ معبودوں کو رب العالمین کے برابر لانا کتنی بڑی گمراہی تھی۔ ایک جامد، بے روح جسم کو اس ذات کے برابر لانا جس کے ہاتھ میں کل کائنات کے خزانے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انسان جب گمراہی کی تاریکی میں جاتا ہے تو ایک جامد، حقیر اور رب العالمین میں فرق سمجھ میں نہیں آتا۔

وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۝۹۹ | ۹۹۔ اور ہمیں تو ان مجرموں نے گمراہ کیا ہے۔

فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِيۡنَ ۝۱۰۰ | ۱۰۰۔ (آج) ہمارے لیے نہ تو کوئی شفاعت کرنے والا ہے

وَلَا صَدِيۡقٍ حَمِيۡمٍ ۝۱۰۱ | ۱۰۱۔ اور نہ کوئی سچا دوست ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قیامت کے دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انہیں گمراہ کرنے والے مجرم تھے ورنہ دنیا میں ہدایت دینے والوں کو مجرم ٹھہراتے تھے۔

۲۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کی شفاعت ہوتے ہوئے دیکھ کر کہہ اٹھیں گے: فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِيۡنَ ہمارے لیے شفاعت کرنے والے نہیں ہیں؟ شاید وہ دیکھ رہے ہوں گے دوسروں کے لیے تو بہت سے شفاعت کرنے والے ہیں۔

روایات ہیں:

الشفعآء خمسة القرآن والرحم و الامانة و نبیکم واھل بیت نبیکم۔[2] شفاعت کرنے والے پانچ ہیں: قرآن، رشتہ دار، امانت، تمہارے نبی اور تمہارے نبی کے اہل بیتؑ۔

۳۔ وَلَا صَدِيۡقٍ حَمِيۡمٍ: جابر بن عبد اللہ راوی ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: جنت میں کوئی شخص یہ

[1] ۳۸ ص: ۶۴ [2] بحار الانوار ۸: ۴۳۔ کنز العمال

کہے گا: میرے دوست کے ساتھ کیا ہوا ہو گا؟ اس کا دوست جہنم میں ہو گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کے دوست کو جہنم سے نکالو تو اہل جہنم کہیں گے ہمارا تو کوئی دوست نہیں۔[1]

یہ حدیث اس آیت کے مطابق ہے:

اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ ۞[2] — اس دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے پرہیزگاروں کے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

یہ آیت ہمارے اور ہمارے شیعوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ ہم پر اور ہمارے شیعوں پر فضل و کرم فرمائے گا ہم ان کی شفاعت کریں گے یہ دیکھ کر دوسرے لوگ کہیں گے: فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِیۡنَ ہمارے لیے شفاعت کرنے والے نہیں ہیں۔[3]

فَلَوۡ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۞ — **١٠٢۔ کاش! ہمیں ایک مرتبہ پھر پلٹنے کا موقع مل جاتا تو ہم مومنین میں سے ہوتے۔**

حدیث میں آیا ہے:

الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا۔[4] — لوگ خواب غفلت میں پڑے ہوتے ہیں جب مر جاتے ہیں تو بیدار ہو جاتے ہیں۔

جب آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ تب آرزو کریں گے ایک مرتبہ پھر موقع مل جاتا تو ہم مؤمن بن جاتے۔ قرآن نے ان کا حال بتا دیا:

وَ لَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُہُوۡا عَنۡہُ ...[5] — اور اگر انہیں واپس بھیج بھی دیا جائے تو یہ پھر وہی کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

اہم نکات

١۔ آخرت سے دنیا کی طرف واپسی ناممکن ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۞ — **١٠٣۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے لیکن ان میں اکثر ایمان نہیں لاتے۔**

---

[1] مجمع البیان ٧: ٣٠٥　[2] ٤٣ زخرف: ٦٧
[3] شواھد التنزیل ١: ٥٤٦۔ تفسیر ابن ابی حاتم ٨: ٢٧٨٦۔ ملاحظہ ہو فقہ الآل ص ٢٨　[4] بحار الانوار: ٤: ٤٣　[5] ٦ انعام: ٢٨

تفسیر آیات

حیات خلیل میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر اور بتوں کے بے حقیقت ہونے پر بھی ایک وضح ثبوت موجود ہے۔ جنہوں نے ایمان نہیں لانا تھا وہ حضرت خلیل علیہ السلام کے قائم کردہ معجزات اور ثبوت سے بھی ایمان نہیں لائے۔

اہم نکات

۱۔ کافروں کا ایمان نہ لانا انبیاء علیہم السلام کی طرف سے دلیل اور معجزات کے نہ ہونے کی وجہ سے نہ تھا۔

وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۰۴﴾

کَذَّبَتۡ قَوۡمُ نُوۡحِ ۣ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾

اِذۡ قَالَ لَہُمۡ اَخُوۡہُمۡ نُوۡحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾

اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۰۷﴾

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۴۔ اور یقیناً آپ کا پروردگار ہی غالب آنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

۱۰۵۔ نوح کی قوم نے بھی پیغمبروں کی تکذیب کی۔

۱۰۶۔ جب ان کی برادری کے نوح نے ان سے کہا: کیا تم اپنا بچاؤ نہیں کرتے ہو؟

۱۰۷۔ میں تمہارے لیے ایک امانتدار رسول ہوں،

۱۰۸۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ کَذَّبَتۡ قَوۡمُ نُوۡحِ ۣ الۡمُرۡسَلِیۡنَ: لفظ قوم مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ لفظ ہے جس کا مفرد نہیں ہوتا۔ جیسے رھط وغیرہ۔[1]

۲۔ قوم نوح نے اگر حضرت نوح علیہ السلام کو شخصی اور ذاتی نبیاد پر جھٹلایا ہوتا تو یہ ایک رسول کی تکذیب تھی لیکن وہ نوع رسالت کی تکذیب کرتے تھے جس سے تمام رسولوں کی تکذیب ہوتی ہے۔

۳۔ اَخُوۡہُمۡ نُوۡحٌ: اپنی قوم کا ایک فرد ہونے کے اعتبار سے اَخُوۡہُمۡ کہا ہے۔ جیسے اخ العرب اور اردو محاورے میں برادری کہتے ہیں۔

۴۔ اَلَا تَتَّقُوۡنَ: تمہیں اپنی فکر نہیں ہے جو غیر اللہ کی پوجا اور اللہ کی عبادت ترک کر کے ابدی خطرہ مول لیتے ہو۔ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم اپنا بچاؤ کرو۔

[1] روح المعانی

۵۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم تو اپنے دین پر قائم رہ کر اپنا بچاؤ کر رہے ہیں۔ یہ کہاں سے ثابت ہے تمہاری اطاعت میں بچاؤ ہے؟ جواب میں فرمایا: میں رسول ہوں۔ میری رسالت پر معجزہ اور دلیل قائم ہے اور میں امین ہوں اس بات کو تم خود جانتے ہو۔ تمہارے ہی درمیان ایک عمر گزاری ہے۔ میرے مزاج میرا، طبیعت، کردار تمہارے سامنے ہے۔ ایک امین شخص روزمرہ کی معمولی باتوں میں امانت کو ہاتھ سے نہیں دیتا، رسالت، توحید اور آخرت کے بارے میں امانت کو ہاتھ سے دے سکتا ہوں؟

۶۔ عقل و منطق کا تقاضا ہے کہ میری باتوں کو مان لو اور غیر اللہ کی پرستش ترک کرو۔

وَمَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۱۰۹

۱۰۹۔ اور اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف رب العالمین پر ہے۔

اس رسالت کے ساتھ میرا کوئی مفاد وابستہ نہیں چنانچہ تم سے کوئی معاوضہ بھی طلب نہیں کرتا ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ۱۱۰

۱۱۰۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

پس اس بے لاگ رہنمائی کو قبول کرنا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ مذہبی قیادت کے لوگوں سے مادی مفادات وابستہ نہیں ہونے چاہییں۔

قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الۡاَرۡذَلُوۡنَ ۱۱۱

۱۱۱۔ انہوں نے کہا: ہم تم پر کیسے ایمان لے آئیں جب کہ ادنیٰ درجے کے لوگ تمہارے پیروکار ہیں۔

تفسیر آیات

ادنیٰ درجے سے مراد مادی اور مالی اعتبار سے ہے کیونکہ فقیر اور نادار لوگ ہمیشہ دعوت انبیاء پر لبیک کہتے اور پہل کرتے ہیں۔ جن کے دلوں پر مال و دولت کا پردہ اور خواہشات کی میل کچیل نہیں ہوتی وہی دعوت انبیاء کو قبول کرتے ہیں۔ جب کہ خوشحال لوگ ہمیشہ اس دعوت کے مخالف رہے ہیں کیونکہ انبیاء کی دعوت عدل کی دعوت ہے اور مجرم لوگ عدل کے حق میں نہیں ہوتے اس لیے اس دعوت پر نادار لوگ لبیک کہتے ہیں یا نوجوان لوگ جنہوں نے ابھی مفادات کے میدان میں قدم نہیں رکھا ہے۔

اہم نکات

۲۔ جن کے دلوں پر مال و دولت کے پردے پڑے ہوتے ہیں ان پر ایمان کا اثر نہیں ہوتا۔

قَالَ وَ مَا عِلۡمِیۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

۱۱۲۔ نوح نے کہا: مجھے علم نہیں وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

اِنۡ حِسَابُہُمۡ اِلَّا عَلٰی رَبِّیۡ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳۔ ان کا حساب تو صرف میرے رب کے ذمے ہے، کاش تم اسے سمجھتے۔

وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾

۱۱۴۔ اور میں مومنوں کو دھتکار نہیں سکتا۔

اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔ میں تو صرف صاف اور صریح انداز میں تنبیہ کرنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ بعض نے کہا ہے: کافروں کا مقصد یہ کہنا تھا کہ یہ لوگ پیشے کے ساتھ کردار میں بھی کمتر درجے کے ہیں۔ اس توجیہ سے آیات میں ربط معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ایمان لانے سے پہلے وہ کیا کرتے رہے ہیں؟ اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ ان کا حساب اللہ کے پاس ہے۔ یعنی ایمان سے ان کے سابقہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

۲۔ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: ایمان لانے کے بعد کوئی رسول کسی کو اپنی درگاہ سے نہیں دھتکارتا۔ چنانچہ قریش نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی مطالبہ کیا تھا کہ اگر ایمان لائیں بھی تو ہم عمار، بلال اور صہیب جیسے لوگوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں سورہ انعام آیت ۵۲ میں رسول اللہ کے لیے یہ حکم آیا:

وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ ...

اور جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں ان کو اپنے سے دور نہ کریں۔

قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہِ یٰنُوۡحُ لَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمَرۡجُوۡمِیۡنَ ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ ان لوگوں نے کہا: اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں ضرور سنگسار کر دیا جائے گا۔

۳۔ الۡمَرۡجُوۡمِیۡنَ: اگر تم باز نہ آئے تو رجم ہونے والوں میں ہو جاؤ گے۔ اس کے دو معنی ہیں: ایک سنگسار دوسرے معنی میں پھٹکارے ہوئے۔ اہل لغت نے یہ دونوں معنی کیے ہیں۔ میں ان میں پہلے معنی کو ترجیح دیتا ہوں چونکہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اور ان کے معبودوں کو مسترد کرنے کی وجہ سے ان مشرکین کی نظر میں پہلے ہی پھٹکارے ہوئے لوگوں میں سے تھے۔ باز نہ آنے کی صورت میں کوئی سنگین تر

قدم اٹھانے کی دھمکی ہو سکتی ہے، وہ سنگسار ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوۡمِیۡ کَذَّبُوۡنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافۡتَحۡ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَہُمۡ فَتۡحًا وَّ نَجِّنِیۡ وَ مَنۡ مَّعِیَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۸﴾

۱۱۷۔ نوح نے کہا: اے میرے پروردگار! تحقیق میری قوم نے میری تکذیب کی ہے۔

۱۱۸۔ پس تو ہی میرے اور ان کے درمیان حتمی فیصلہ فرما اور مجھے اور جو میرے ساتھ مؤمنین ہیں ان کو نجات دے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ قوم نے نوح علیہ السلام کی تکذیب کی ہے لیکن از راہ شکوہ اس کا ذکر فرما رہے ہیں۔

۲۔ فَافۡتَحۡ: فیصلہ کن حکم کے ذریعے حقیقت کا چہرہ کھول دے۔

۳۔ وَ مَنۡ مَّعِیَ: مجھے اور جو میری معیت میں ہیں انہیں نجات دے۔ قرآن انبیاء علیہم السلام کے ساتھیوں کو ''معیت'' کے ساتھ تعبیر فرماتا ہے جو ہر قدم پر ساتھ دینے کے معنوں میں ہے۔ جیسا کہ اللہ ہر قدم پر ساتھ ہوتا ہے تو کہتے ہیں:

اِنَّ مَعِیَ رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ ۞ [۱] — میرا پروردگار یقیناً میرے ساتھ ہے، وہ مجھے راستہ دکھا دے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ... [۲] — یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ ... [۳] — محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت گیر اور آپس میں مہربان ہیں۔

ان لوگوں کا ذکر ہے جو ہر قدم پر ساتھ دیتے ہیں۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ فتح آیت ۲۹۔

اہم نکات

۱۔ نجات، ہر قدم رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی معیت میں رہنے والوں کے لیے ہے۔

فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَ مَنۡ مَّعَہٗ فِی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ ﴿۱۱۹﴾

۱۱۹۔ چنانچہ ہم نے انہیں اور جو ان کے ہمراہ بھری کشتی میں سوار تھے سب کو بچا لیا۔

---

[۱] ۲۶ شعراء: ۶۲ [۲] ۹ توبۃ: ۴۰ [۳] ۴۸ فتح: ۲۹

حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کی معیت میں جو مؤمنین تھے انہیں اس کشتی کے ذریعے نجات دی جو انسانوں اور دیگر حیوانات سے بھری ہوئی تھی:

قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡہَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ [1] تو ہم نے کہا: (اے نوح!) ہر جوڑے میں سے دو دو کشتی پر سوار کرو....

ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا بَعۡدُ الۡبٰقِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾ ۱۲۰۔اس کے بعد ہم نے باقی سب کو غرق کر دیا۔

مؤمنین کو نجات دینے کے بعد ہم نے باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔

حضرت شیخ محمد حسین کاشف الغطاء اپنی کتاب الارض والتربۃ الحسینیۃ میں فرماتے ہیں:

طوفان نوح شاید آسمان سے ایک چھوٹا سا سیارہ سمندر میں گرا ہو گا جس سے یہ طوفان آ گیا۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ بہت بڑے سونامی کی وجہ سے طوفان آیا ہو۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۲۱﴾ ۱۲۱۔یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔

اس واقعہ میں اس بات پر واضح دلیل اور نشانی تھی کہ اس کائنات کی تدبیر اللہ تعالیٰ کے دست قدرت سے ہو رہی ہے۔ اللہ نجات دیتا اور غرق کرتا ہے۔ اس واضح نشانی کو دیکھنے کے بعد بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے کہ اللہ ہی رب العالمین ہے۔

ع ۱۸ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۲﴾ ۱۲۲۔ اور یقیناً آپ کا رب ہی بڑا غالب آنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

کائنات کی تدبیر اس ذات کے ہاتھ میں ہے جو بالادست ہونے کے باوجود مہربان ہے۔

کَذَّبَتۡ عَادُ ۣ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۲۳﴾ ۱۲۳۔قوم عاد نے پیغمبروں کی تکذیب کی۔

تفسیر آیات

کَذَّبَتۡ کی تانیث اس وجہ سے ہو سکتی ہے کہ عاد سے مراد قبیلہ عاد ہے۔ یہ قوم بھی اللہ کی طرف سے کسی مرسل کے آنے کا عقیدہ نہیں رکھتی تھی لہٰذا وہ تمام مرسلین کی تکذیب کے ضمن میں حضرت ھود علیہ السلام

[1] ۱۱ ھود: ۴۰

کی تکذیب کرتی تھی۔

اِذۡ قَالَ لَہُمۡ اَخُوۡہُمۡ ہُوۡدٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾ ۱۲۴۔ جب ان کی برادری کے ہود نے ان سے کہا: کیا تم اپنا بچاؤ نہیں کرتے؟

اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۲۵﴾ ۱۲۵۔ میں تمہارے لیے ایک امانتدار رسول ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۲۶﴾ ۱۲۶۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۲۷﴾ ۱۲۷۔ اور اس کام پر میں تم سے اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف رب العالمین پر ہے۔

تفسیر آیات

انبیاء علیہم السلام کی دعوت، منطق، سیرت ایک ہی ہے۔ سب کی دعوت کا مرکزی محور توحید ہے۔ امانت تمام انبیاء علیہم السلام کا شیوہ ہے۔ لوگوں کو ہلاکت سے بچانا ان کی منزل ہے۔ اپنی دعوت کسی مادی مفاد کے ساتھ وابستہ نہ رکھنا ان کی سیرت ہے۔

اَتَبۡنُوۡنَ بِکُلِّ رِیۡعٍ اٰیَۃً تَعۡبَثُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾ ۱۲۸۔ کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک بے سود یادگار بناتے ہو؟

تشریح کلمات

رِیۡعٍ : (ر ی ع) سطح مرتفع۔ بلند جگہ کو کہتے ہیں جو دور سے ظاہر ہو۔

تفسیر آیات

یادگار عمارت صرف اس غرض سے بنانا کہ اپنی شان و شوکت کا اظہار ہو اپنی مہارت اور تمدن پر فخر و مباہات کرنا مقصود ہو، اس کے علاوہ کوئی معقول مصرف نہ ہو تو ایسی عمارتوں کا بنانا عبث ہے۔ جیسا کہ آج کل رائج ہے کہ ایک غریب اور مقروض ملک جس کے بچوں کو تعلیم اور شہریوں کو پینے کا صاف پانی نہیں ملتا وہاں کروڑوں روپے کی یادگار عمارتیں بنائی جاتی ہیں جن کا کوئی مصرف نہیں ہے۔

وَ تَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمۡ ۱۲۹۔ اور تم بڑے محلات بناتے ہو گویا تم نے ہمیشہ

تَخۡلُدُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾ رہنا ہے۔

تشریح کلمات

مَصَانِعَ : (ص ن ع) معزز، پر رعب مقامات کو مصانع کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

قصور اور محلات ایسے بناتے ہو گویا کہ تم نے یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ ان عمارتوں کی بناوٹ، ان کے استحکام، ان پر صرف ہونے والے سرمایے اور محنت میں سے کسی ایک میں ایسی کوئی نشانی نہیں ہے کہ اسے چند دن زندہ رہنے والے نے بنایا ہے۔

قوم عاد کے بارے میں قرآنی آیات سے جو معلومات سامنے آتی ہیں ان سے اس قوم کے تمدن، طاقت وقوت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ ارم ذات العماد، ستونوں والی ارم کی عمارت اس قوم نے بنائی:

الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُہَا فِی الۡبِلَادِ ۪ۙ[1] جس کی نظیر کسی ملک میں نہیں بنائی گئی۔

دنیا میں اونچے ستونوں والی عمارت بنانا پہلی بار اس قوم نے شروع کیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ عمارت کسی مقدس نظریے اور موقف کی شناخت کے لیے نہ ہو صرف فخر و مباہات کے لیے ہو تو اسراف اور قابل مذمت ہے۔

وَ اِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِیۡنَ ﴿۱۳۰﴾ ۱۳۰۔ اور جب تم (کسی پر) حملہ کرتے ہو تو نہایت جابرانہ انداز میں حملہ آور ہوتے ہو۔

تفسیر آیات

جب کسی کمزور قوم پر حملہ کرتے ہو تو تمام قدروں کو پامال کرتے ہو۔ آج کل کی استعماری طاقتیں من وعن یہی کرتی ہیں۔ اپنے ملکوں میں لایعنی قسم کی عظیم یادگاریں بناتی ہیں اور جب کسی کمزور قوم پر ہاتھ ڈالتی ہیں، جَبَّارِیۡنَ کا صحیح مصداق بن جاتی ہیں اور تمام انسانی و اخلاقی قدریں پامال کرتی ہیں۔

اہم نکات

۲۔ کسی پر حملہ دفاع کرنے کے لیے نہ ہو تو جَبَّارِیۡنَ ہے۔

---

[1] ۸۹ فجر: ۸

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۳۱﴾ ۱۳۱۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

تفسیر آیات

ان جرائم کو ترک کر کے عدل الٰہی سے بچو۔ بچنے کا واحد راستہ میری اطاعت ہے۔

وَ اتَّقُوا الَّذِیۡۤ اَمَدَّکُمۡ بِمَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ ۱۳۲۔ نیز اس سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمہاری مدد کی جن کا تمہیں (بخوبی) علم ہے۔

اَمَدَّکُمۡ بِاَنۡعَامٍ وَّ بَنِیۡنَ ﴿۱۳۳﴾ ۱۳۳۔ اس نے تمہیں جانوروں اور اولاد سے نوازا۔

وَ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۱۳۴﴾ ۱۳۴۔ نیز باغات اور چشموں سے مالا مال کر دیا۔

تفسیر آیات

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ کی ان نعمتوں کی طرف متوجہ کرا رہے ہیں جن کے تحت وہی ذات معبود ہو سکتی ہے جس نے ان نعمتوں سے نوازا ہے اور وہی ذات تمہاری زندگی کو چلاتی ہے جس نے تمہیں باغات اور چشموں، چوپاؤں اور اولاد سے نوازا ہے۔

اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۳۵﴾ ۱۳۵۔ بلاشبہ مجھے تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

تفسیر آیات

غیر اللہ کو اپنا معبود بنا کر تم نے بہت بڑے عذاب سے اپنے آپ کو دوچار کیا ہے۔ میں تمہیں اس عذاب سے بچنے کی نصیحت کرتا ہوں۔

قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَکُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِیۡنَ ﴿۱۳۶﴾ ۱۳۶۔ انہوں نے کہا: تم نصیحت کرو یا نہ کرو ہمارے لیے یکساں ہے۔

تفسیر آیات

وہ اپنی سرشت کا خود اعتراف کر رہے ہیں کہ ہمارے دلوں پر تمہاری نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

حقیقت بھی یہی ہے جو لوگ ہدایت لینا ہی نہیں چاہتے تو ان کے دلوں پر نہ نصیحت اثر کرتی ہے نہ معجزہ۔

جب لوگ اللہ کے پیغام کو بے اثر قرار دیتے ہیں اور اثر پذیری کا امکان ختم ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ دو کاموں میں سے ایک کام انجام دیتا ہے: یا تو ان پر فوری عذاب نازل کرتا ہے یا ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتا اور ڈھیل دیتا ہے۔ واضح رہے ڈھیل دینا بدتر عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۳۷﴾ ۱۳۷۔ یہ تو بس پرانے لوگوں کی عادات ہیں۔

وَ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۱۳۸﴾ ۱۳۸۔ اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔

تفسیر آیات

یہ ڈرانا پرانے لوگوں کی عادت ہے اس قسم کی باتیں پہلے بھی بہت سے لوگ کرتے رہے ہیں۔ یہ تمہاری کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی طرف اس سے پہلے بھی متعدد پیغمبران مبعوث ہوئے ہیں۔

اس کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے: جس دین پر ہم قائم ہیں وہ ہمارے پرانے لوگوں کی عادت اور روایات ہیں۔ ہم اس پر کاربند ہیں۔

وَ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ: ہم پر عذاب نہیں آئے گا۔ کافر باطل پر یقین رکھتا ہے یا ناامید ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کا انجام بد ہوا کرتا ہے۔ جب کہ مؤمن کی علامت یہ ہے کہ وہ خوف و رجاء اور بیم و امید کے درمیان مستعد اور ہوشیار رہتا ہے۔

فَکَذَّبُوۡہُ فَاَہۡلَکۡنٰہُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۳۹﴾

۱۳۹۔ (اس طرح) انہوں نے ہود کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں ہلاکت میں ڈال دیا، یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہ تھے۔

۱۔ فَکَذَّبُوۡہُ: وہ تکذیب پر مصر رہے۔

۲۔ فَاَہۡلَکۡنٰہُمۡ: پھر اللہ نے ان کو ہلاک و تباہ کر دیا:

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُہۡلِکُوۡا بِرِیۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِیَۃٍ ...[1] اور عاد کو ایک سرکش طوفانی آندھی سے ہلاک کر دیا گیا۔

---

[1] ۶۹ حاقہ: ۶

۳۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً: اگر سمجھنے کے لیے کوئی دل ہوتا تو ان واقعات میں اللہ کے رب العالمین ہونے پر ایک بین ثبوت موجود ہے۔

وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۴۰﴾ ع ۱۸

۱۴۰۔ اور تحقیق آپ کا پروردگار ہی بڑا غالب آنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔

۴۔ وَ اِنَّ رَبَّکَ: اگر وہ اللہ کے مقام رحیمی سے استفادہ کرتے تو اللہ کی قہاریت کی زد میں نہ آتے۔

کَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۴۱﴾

۱۴۱۔ (قوم) ثمود نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔

اِذۡ قَالَ لَہُمۡ اَخُوۡہُمۡ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۴۲﴾

۱۴۲۔ جب ان کی برادری کے صالح نے ان سے کہا: کیا تم اپنا بچاؤ نہیں کرتے؟

اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۴۳﴾

۱۴۳۔ میں تمہارے لیے ایک امانتدار رسول ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۴۴﴾

۱۴۴۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۴۵﴾

۱۴۵۔ اور اس بات پر میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف رب العالمین پر ہے۔

تفسیر آیات

تمام انبیاء علیہم السلام کی منزل ایک ہے تو راستہ ایک ہے۔ ہدف ایک ہے تو طرز کلام ایک ہے۔ مقصد ایک ہے تو منطق ایک ہے۔ نیت ایک ہے تو سیرت ایک ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں سورۃ الاعراف آیات ۷۳ تا ۷۹ سورہ ہود اور سورہ بنی اسرائیل میں ذکر ہو چکا ہے۔

اَتُتۡرَکُوۡنَ فِیۡ مَا ہٰہُنَاۤ اٰمِنِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾

۱۴۶۔ کیا تم لوگ یہاں پر موجود چیزوں (نعمتوں) میں یوں ہی بے فکر چھوڑ دیے جاؤ گے؟

فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۱۴۷﴾

۱۴۷۔ باغوں اور چشموں میں،

وَّ زُرُوۡعٍ وَّ نَخۡلٍ طَلۡعُہَا ہَضِیۡمٌ ﴿۱۴۸﴾

۱۴۸۔ اور کھیتیوں اور کھجوروں میں جن کے نرم خوشے ہیں،

تشریح کلمات

هَضِیۡمٌ : (ہ ض م) الھضم کے اصلی معنی کسی نرم چیز کو کچلنا کے ہیں۔

تفسیر آیات

حضرت صالح علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ کیا تم سے کوئی حساب نہیں لیا جائے گا؟ کیا جن نعمتوں میں تم اب امن و سکون سے زندگی گزار رہے ہو ہمیشہ اسی میں رہو گے۔ یہ امن و سکون، باغات، چشمے، لہلہاتے کھیت اور نرم یا گھنے خوشوں پر مشتمل نخلستان ہمیشہ رہیں گے؟

وَ تَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا فٰرِہِیۡنَ ﴿۱۴۹﴾

۱۴۹۔ اور تم پہاڑوں کو بڑی مہارت سے تراش کر گھر بناتے ہو۔

تشریح کلمات

وَ تَنۡحِتُوۡنَ : (ن ح ت) نَحت کے معنی لکڑی، پتھر یا اس قسم کی سخت چیزوں کو تراشنے کے ہیں۔

فٰرِہِیۡنَ : (ف ر ہ) اترانے نیز مہارت کے معنوں میں آتا ہے۔

تفسیر آیات

کیا تمہیں پہاڑوں کو تراش کر بڑی مہارت سے گھر بناتے رہنے دیا جائے گا۔ ان گھروں سے تمہارے جنازے نہیں اٹھیں گے؟ قوم ثمود کی ان تراشیدہ عمارتوں کے آثار آج بھی نمایاں طور پر مدینے اور تبوک کے درمیان العلا اور الحجر کے مقامات پر موجود ہیں۔

کھوج لگانے والوں کو الحجر کے علاقوں میں بہت سے آثار اور کتبے ملے جن سے اس قوم کے تمدن کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف الاسلامیہ مترجم ۷:۳۱۹

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۵۰﴾ۚ

۱۵۰۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

وَ لَا تُطِیۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾ۙ

۱۵۱۔ اور حد سے تجاوز کرنے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو۔

الَّذِیۡنَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا یُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۲﴾

۱۵۲۔ جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

تفسیر آیات

جب تمہیں اس عیش و آرام کی حالت میں نہیں رکھا جائے گا اور ایک دن تمہیں یہ باغات و اشجار چھوڑ کر جانا ہیں تو اس کا ایک حل پیش کرتا ہوں کہ میری اطاعت کرو اور اسراف پسند لوگوں کی اطاعت چھوڑ دو تو تمہیں دنیا کے باغات و چشموں سے جدائی کی حسرت نہ ہو گی چونکہ آخرت کی ابدی زندگی ان چیزوں سے بدرجہا بہتر ہے۔

اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ: امر سے مراد خود امر کرنے والا ہے اور مسرفین سے مراد حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ چنانچہ بعد کی آیت میں مسرفین کی تشریح مفسدین سے کی ہے۔

قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾

مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۚۖ فَاۡتِ بِاٰیَۃٍ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۵۴﴾

۱۵۳۔ لوگوں نے کہا: تم تو بلاشبہ سحرزدہ آدمی ہو۔

۱۵۴۔ اور تم ہم جیسے بشر کے سوا اور کچھ نہیں ہو، پس اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی (معجزہ) پیش کرو۔

تفسیر آیات

قوم صالح نے اس نصیحت کا یہ جواب دیا: اے صالح تم سحر زدہ آدمی ہو. جس پر جادو کیا گیا ہو وہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔

جب کہ تم ہماری طرح کے ایک انسان ہی تو ہو۔ تمہیں اللہ نے کیسے نبی بنادیا۔ فَاۡتِ بِاٰیَۃٍ پھر بھی اگر تم سچے ہو تو کوئی معجزہ پیش کرو۔ دیکھتے ہیں تمہارا دعویٰ کہاں تک سچائی پر مبنی ہے۔

قَالَ ہٰذِہٖ نَاقَۃٌ لَّہَا شِرۡبٌ وَّ لَکُمۡ شِرۡبُ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۱۵۵﴾ۚ

وَ لَا تَمَسُّوۡہَا بِسُوۡٓءٍ فَیَاۡخُذَکُمۡ عَذَابُ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۵۶﴾

۱۵۵۔ صالح نے کہا: یہ ایک اونٹنی ہے، ایک مقررہ دن اس کے پانی پینے کی باری ہو گی اور ایک مقررہ دن تمہارے پانی پینے کی باری ہو گی۔

۱۵۶۔ اور اسے بری نیت سے نہ چھونا ورنہ ایک بڑے (ہولناک) دن کا عذاب تمہیں گرفت میں لے لے گا۔

تفسیر آیات

طلب معجزہ کے جواب میں فرمایا: هٰذِهٖ نَاقَةٌ یہ اونٹنی ہے اور سورۃ الاعراف میں آیت ۷۳ میں فرمایا:

قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ .... تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل آ چکی ہے، یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے ایک نشانی ہے....

اس میں صراحت کے ساتھ فرمایا کہ یہ ناقہ ایک معجزہ ہے۔ آیۃ کا لفظ قرآنی اصطلاح میں معجزے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بعض کے نزدیک اس ناقہ کا معجزہ اس کے پہلو میں تھا کہ اگر اس کو تکلیف دی اور اس کے ساتھ کوئی برا سلوک ہوا تو عذاب نازل ہوگا۔

بعض مفسرین معجزے کا یہ پہلو نکالتے ہیں کہ ان کو یہ حکم ہوا تھا کہ ایک دن ناقہ پانی پیئے اور ایک دن بستی والے۔ یہاں پانی کی قلت تھی اور کنویں کا سارا پانی ایک اونٹنی پی جاتی تھی۔ یہی ان کے لیے ایک امتحان تھا۔

قرآنی تصریحات کے مطابق اس اونٹنی کے بارے میں درج ذیل معلومات سامنے آتی ہیں:

i۔ قوم صالح کی طرف سے معجزہ کے طلب کے جواب میں اونٹنی بطور معجزہ ظاہر ہوئی: فَاۡتِ بِاٰيَةٍ ۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ ....۔ (ہود ۱۱: ۶۴)

ii۔ اونٹنی اور بستی والے باری باری پانی لیتے تھے: لَّهَا شِرۡبٌ وَّلَكُمۡ شِرۡبُ ....۔

iii۔ اس اونٹنی کو تکلیف پہنچانے کی صورت میں عذاب آئے گا۔

iv۔ چنانچہ اس اونٹنی کی کونچیں انہوں نے کاٹ ڈالیں تو عذاب آ گیا۔

ان نکات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ناقہ معجزانہ طور پر وجود میں آئی تھی۔

اہم نکات

۱۔ ناقہ صالح ایسا معجزہ ہے جو لوگوں کے مطالبے پر دیا گیا تھا اس لیے انکار پر عذاب آیا۔

فَعَقَرُوۡهَا فَاَصۡبَحُوۡا نٰدِمِيۡنَ ۟ۙ﴿۱۵۷﴾

فَاَخَذَهُمُ الۡعَذَابُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۵۸﴾

۱۵۷۔ تو انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں پھر وہ ندامت میں مبتلا ہوئے۔

۱۵۸۔ چنانچہ عذاب نے انہیں گرفت میں لے لیا، یقیناً اس میں ایک نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر آیات

اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے بعد ندامت اس وقت ہوئی ہو گی جب عذاب سامنے آیا۔ کونچیں تو ایک آدمی نے کاٹی تھیں مگر نسبت سب کی طرف دی گئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دیگر لوگ اس عمل پر راضی تھے۔

چنانچہ نہج البلاغۃ خطبہ ۲۰۱ میں ارشاد ہے:

اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا یَجْمَعُ النَّاسَ الرِّضَا وَ السُّخْطُ وَ اِنَّمَا عَقَرَ نَاقَۃَ ثَمُودَ رَجُلٌ وَاحِدٌ فَعَمَّھُمُ اللّٰہُ بِالْعَذَابِ لَمَّا عَمُّوہُ بِالرِّضَا۔۔۔۔

اے لوگو! (افعال و اعمال چاہے مختلف ہوں مگر) رضا و ناراضگی کے جذبات تمام لوگوں کو ایک حکم میں لے آتے ہیں۔ آخر قوم ثمود کی اونٹنی کو ایک ہی شخص نے پے کیا تھا لیکن اللہ نے عذاب سب پر کیا کیونکہ وہ سارے کے سارے اس پر رضامند تھے۔

فَاَخَذَھُمُ الۡعَذَابُ: چنانچہ کونچیں کاٹنے کے بعد انہیں تین دن کی مہلت دی گئی۔ اس کے بعد عذاب نازل ہوا:

فَعَقَرُوۡھَا فَقَالَ تَمَتَّعُوۡا فِیۡ دَارِکُمۡ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ ۔۔۔[1]

پس انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صالح نے کہا: تم لوگ تین دن اپنے گھروں میں بسر کرو۔

ع ۹ | وَ اِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۵۹﴾

۱۵۹۔ اور بے شک آپ کا پروردگار ہی بڑا غالب آنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔

ان لوگوں نے اللہ کی رحیمیت سے دوری اختیار کی تو قہاریت کی زد میں آ گئے۔

کَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطِ ۣالۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۶۰﴾ۚۖ

۱۶۰۔ قوم لوط نے (بھی) رسولوں کی تکذیب کی۔

اِذۡ قَالَ لَھُمۡ اَخُوۡھُمۡ لُوۡطٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾ۚ

۱۶۱۔ جب ان کی برادری کے لوط نے ان سے کہا: کیا تم اپنا بچاؤ نہیں کرتے؟

اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۶۲﴾ۙ

۱۶۲۔ میں تمہارے لیے ایک امانتدار رسول ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۶۳﴾ۚ

۱۶۳۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۴﴾

۱۶۴۔ اور میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر تو بس رب العالمین پر ہے۔

---

[1] ۱۱ھود: ۶۵

تفسیر آیات

وہی الٰہی پیغام جو تمام انبیاء علیہم السلام کا پیغام ہے۔ پیغام کی وحدت، پیغام دہندہ کی وحدت کی دلیل ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی رب کی طرف سے آئے ہیں۔

اَتَاۡتُوۡنَ الذُّکۡرَانَ مِنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۵﴾

۱۶۵۔ کیا ساری دنیا میں سے تم (شہوت رانی کے لیے) مردوں کے پاس ہی جاتے ہو؟

اس آیت کی دو تشریح متصور ہیں:

i۔ کیا ساری دنیا میں صرف تم مردوں سے ہم جنس بازی کرتے ہو۔

ii۔ کیا ساری دنیا کی عورتوں کو چھوڑ کر تم مردوں سے ہم جنس بازی کرتے ہو۔

پہلی تشریح پر دوسری آیت مؤید ہو سکتی ہے:

مَا سَبَقَکُمۡ بِہَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ۞ [1] کیا تم ایسی بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو کہ تم سے پہلے دنیا میں کسی نے اس کا ارتکاب نہیں کیا۔

دوسری تشریح کے لیے اگلی آیت تشریح بن سکتی ہے:

وَ تَذَرُوۡنَ مَا خَلَقَ لَکُمۡ رَبُّکُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ عٰدُوۡنَ ﴿۱۶۶﴾

۱۶۶۔ اور تمہارے رب نے جو بیویاں تمہارے لیے خلق کی ہیں انہیں چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم تو حد سے تجاوز کرنے والی قوم ہو۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی بقا کے لیے جو دو صنف، مرد و زن خلق فرمائے ہیں، ہم جنس بازی اس غرض خلقت اور فطرت مرد و زن کی خلاف ورزی ہے۔ مرد و زن کی خلقت خود گواہ ہے کہ مرد، زن کے لیے اور زن مرد کے لیے ہے اور ان دونوں میں جو کشش ہے، اسی میں نوع انسانی کی بقا مضمر ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہم جنس بازی، فطرت سے بغاوت ہے۔

---

[1] ۷ اعراف: ۸۰

قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہِ یٰلُوۡطُ لَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُخۡرَجِیۡنَ ﴿۱۶۷﴾

۱۶۷۔ وہ کہنے لگے: اے لوط! اگر تو باز نہ آیا تو تجھے بھی ضرور نکال دیا جائے گا۔

تفسیر آیات

حضرت لوط علیہ السلام کے باشندہ نہ تھے۔ آپؑ اپنے چچا حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمراہ اپنے وطن عراق سے ہجرت کر کے اردن کی اس سرزمین کی طرف آئے تو انہیں اس قوم کی طرف مبعوث فرمایا اور اس خلاف فطرت عمل زشت سے روکنے کا حکم ہوا تو اس قوم نے ان کو اپنے ہاں سے ملک بدر کرنے کی دھمکی دی کہ تو ایک اجنبی شخص یہاں آ کر ہمیں اپنی خواہشات پر عمل کرنے سے روکنے والا کون ہے؟

قَالَ اِنِّیۡ لِعَمَلِکُمۡ مِّنَ الۡقَالِیۡنَ ﴿۱۶۸﴾

۱۶۸۔ لوط نے کہا: میں تمہارے اس کردار کے سخت دشمنوں میں سے ہوں۔

تشریح کلمات

القلی : (ق ل ی) شدۃ البغض کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

ملک سے اخراج کی دھمکی کو اعتنا میں نہیں لاتے بلکہ اپنی نفرت کا برملا اظہار فرماتے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ منکرات کو اگر عملاً روکنا ممکن نہ ہوا تو قلباً اس سے نفرت کرنی چاہیے۔

رَبِّ نَجِّنِیۡ وَ اَہۡلِیۡ مِمَّا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

۱۶۹۔ پروردگارا! مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کے (برے) کردار سے نجات عطا فرما۔

چونکہ پوری آبادی میں حضرت لوط علیہ السلام گھر کے علاوہ کوئی شخص دائرہ ایمان میں داخل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ فرمایا:

فَمَا وَجَدۡنَا فِیۡہَا غَیۡرَ بَیۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۝[1]

وہاں ہم نے ایک گھر کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

فَنَجَّیۡنٰہُ وَ اَہۡلَہٗۤ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۷۰﴾

۱۷۰۔ چنانچہ ہم نے انہیں اور ان کے تمام اہل خانہ

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۳۶

اِلَّا عَجُوۡزًا فِی الۡغٰبِرِیۡنَ ﴿۱۷۱﴾ | کو نجات دی۔
ثُمَّ دَمَّرۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ﴿۱۷۲﴾ | ۱۷۱۔ سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں رہ گئی۔
وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿۱۷۳﴾ | ۱۷۲۔ پھر ہم نے باقی سب کو تباہ کر کے رکھ دیا۔
۱۷۳۔ اوران پر ہم نے بارش برسائی، پس تنبیہ شدہ لوگوں پر یہ بہت بری بارش تھی۔

تفسیر آیات

۱۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کے خانوادے کے افراد کو اللہ نے بچا لیا چونکہ یہی ایک گھر مسلمان تھا لہٰذا وَ اَهۡلَهٗۤ اہل بیت میں دوسرے مؤمنین کو شامل سمجھنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ اِلَّا عَجُوۡزًا: اس عورت سے مراد خود حضرت لوط علیہ السلام کی زوجہ ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف، النمل اور الحجر میں اس کی صراحت موجود ہے کہ یہ عورت ایک نبی کی زوجہ ہونے کے باوجود بدکار قوم کی حامی تھی۔

۳۔ ثُمَّ دَمَّرۡنَا: تدمیر تباہ کر دینے کے معنوں میں ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کے اہل بیت کو بچانے کے بعد باقی پوری قوم کو تباہ کر دیا گیا۔

۴۔ وَ اَمۡطَرۡنَا: اس قوم پر بارش برسائی گئی۔ بارش سے مراد پانی کی نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے جیسا کہ سورۃ الحجر آیت ۷۴ میں فرمایا:

وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ؕ اور ہم نے ان پر کنکر یلے پتھر برسائے۔

چنانچہ ایک آتش فشانی دھماکے سے ان پتھروں کی بارش ہوئی ہوگی۔ فاخذتهم الصحیة مشرقین سورج نکلتے وقت انہیں خوفناک آواز نے گرفت میں لے لیا۔ یہ آتش فشانی کے دھماکے کی آواز ہو سکتی ہے۔

طبقات الارضی ماہرین کے مطابق اردن کے بحر مردار میں بہت سی بستیاں غرق ہیں۔ اس بحیرہ کے قرب و جوار میں بعض قلعوں کی بقایا کا پتہ چلا ہے اور اس کے ساتھ وہ مذبحہ بھی ہے جہاں قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ (ظلال القرآن)

ماہرین کا خیال ہے کہ وادی سدیم بحر مردار میں غرق ہے جس میں قوم لوط کی بڑی بڑی بستیاں آباد تھیں۔ ایک زلزلے میں یہ وادی دھنس گئی۔ اس پر بحر مردار کا پانی جمع ہو گیا۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ | ۱۷۴۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے لیکن ان میں

اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٤﴾ سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔

تفسیر آیات

اگر سمجھنا چاہتے تو اس واقعہ میں ایک مکمل ثبوت اور دلیل موجود تھی لیکن ان کا ایمان نہ لانا دلیل و ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں تھا۔ اس لیے وہ ان معجزوں کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٧٥﴾ ۱۷۵۔ اور یقیناً آپ کا رب ہی بڑا غالب آنے والا ، بڑا رحم کرنے والا ہے۔

اگر یہ لوگ اللہ کے مقام عزت و غلبہ اور مقام رحمت کو سمجھتے تو یہ دن دیکھنے کو نہ ملتے۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧٦﴾ ۱۷۶۔ ایکہ والوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔

تفسیر آیات

حضرت شعیب علیہ السلام مدین اور ایکہ دونوں کے باشندوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ چنانچہ سورہ اعراف میں فرمایا: وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا اور اس سورہ میں فرمایا: اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ لیکن یہاں یہ اختلاف موجود ہے کہ کیا مدین اور ایکہ دو مختلف علاقے اور قومیں ہیں یا یہ دونوں ایک ہی قوم کے دو نام ہیں؟ بعض اہل تحقیق کے مطابق یہ دونوں ایک قوم اور دو قبیلے تھے۔

قرآنی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے حضرت شعیب علیہ السلام کا تعلق اصحاب مدین سے تھا چونکہ قرآن نے فرمایا: وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا اور ایکہ کے بارے میں اَخَاهُمْ نہیں فرمایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾ ۱۷۷۔ جب شعیب نے ان سے کہا: کیا تم اپنا بچاؤ نہیں کرتے؟

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٧٨﴾ ۱۷۸۔ میں تمہارے لیے ایک امانتدار رسول ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٧٩﴾ ۱۷۹۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

وَمَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٨٠﴾ ۱۸۰۔ اور اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف رب العالمین پر ہے۔

ان آیات کی تشریح ہو چکی ہے۔

اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِیۡنَ ﴿۱۸۱﴾
۱۸۱۔ تم پیمانہ پورا بھرو اور نقصان پہنچانے والوں میں سے نہ ہونا۔

وَ زِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ ﴿۱۸۲﴾
۱۸۲۔ اور سیدھی ترازو سے تولا کرو۔

وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۸۳﴾
۱۸۳۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

وَ اتَّقُوا الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الۡجِبِلَّۃَ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۸۴﴾
۱۸۴۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس نے تمہیں اور گزشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔

تفسیر آیات

حضرت شعیب علیہ السلام ایکہ کے معاشرے میں جن تجارتی بے ایمانیوں کی نشاندہی فرمائی عیناً انہی تجارتی بے ایمانیوں کی نشاندہی قوم مدین کے بارے میں فرمائی۔ چنانچہ سورۃ الاعراف آیت ۸۵ میں فرمایا:

فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ الۡمِیۡزَانَ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ ... لہٰذا تم ناپ اور تول پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دو۔

اس سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں علاقے ایک قسم کی بے ایمانی میں مبتلا تھے۔ چنانچہ ان علاقوں کے تجارتی شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ لوگ رہزنی کی وارداتیں بھی کرتے تھے۔ چنانچہ سورۃ اعراف آیت ۸۶ میں اس کی صراحت آ گئی:

وَ لَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ ... ہر راستے پر (راہزن بن کر) نہ بیٹھا کرو۔

چونکہ علاقے بھی باہم متصل تھے اور قوم بھی ایک تھی اس لیے ان دونوں کی طرف ایک ہی رسول حضرت شعیب مبعوث ہوئے۔ مدین اور ایکہ حجاز اور شام کے درمیان تجارت کی ایک اہم منڈیاں تھیں۔ اس لیے یہاں سے تجارتی قافلوں کا گزر ہوتا تھا۔ حجاز والے شام سے اور شام والے حجاز سے آنے والی اشیاء خریدتے ہوں گے۔ اس سلسلے میں جو بے ایمانیاں ہوتی تھیں ان کے لیے حکم ہوا: اول پیمانہ پورا بھرو۔ دوم سیدھی ترازو تولا کرو۔ سوم دھوکہ دہی سے باز آ جاؤ کہ لوگوں کو مطلوبہ چیزوں کی جگہ ناقص چیزیں دے کر نقصان میں ڈالو: لَا تَبۡخَسُوا....

چہارم یہ کہ زمین میں فساد مت پھیلایا کرو۔ تجارت میں بے ایمانیاں کرنا فساد فی الارض ہے: لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اقتصادی بے ایمانیوں سے زمین میں فساد پھیلتا ہے۔ صدق اللّٰہ العلی العظیم۔ آج کے استحصالیوں نے اقتصادی ذرائع سے زمین کو فساد سے پر کیا ہے۔

وَاتَّقُوا الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ : اس اللہ کی عدالت سے بچے رہو جس نے تمہیں اور تمہاری آبا و اجداد کو خلق فرمایا ہے۔ الۡجِبِلَّۃَ ، الحلقۃ یعنی الخلق الاولین جن گزشتہ نسلوں کی یہ لوگ اندھی تقلید کرتے ہیں اللہ ان کا بھی خالق ہے۔

قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِیۡنَ ﴿۱۸۵﴾ ۱۸۵۔ انہوں نے کہا: تم تو بس سحرزدہ ہو۔

وَ مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا وَ اِنۡ نَّظُنُّکَ لَمِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۱۸۶﴾ ۱۸۶۔ اور تم تو بس ہم جیسے انسان ہو نیز ہمارا خیال ہے کہ تم جھوٹے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ تمام انبیاء علیہم السلام پر جادو کا الزام اس لیے لگاتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام اپنے ساتھ معجزات لے کر آتے تھے۔ ان معجزوں کو وہ جادو کہہ کر ٹھکراتے اور بشر اور انسان کو رسالت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔

فَاَسۡقِطۡ عَلَیۡنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۸۷﴾ ۱۸۷۔ پس تم سچے ہو تو آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دو۔

۲۔ عذاب کی نوعیت کا بھی خود تعین کرتے ہیں کہ آسمان سے ٹکڑے ہم پر برسائے جائیں۔

قَالَ رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾ ۱۸۸۔ شعیب نے کہا: میرا پروردگار تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔

۳۔ عذاب نازل کرنا میرے رب کا کام ہے جس کے علم میں تمہاری تمام حرکتیں ہیں۔ وہی جانتا ہے کہ تم عذاب کے مستحق ہو۔

فَکَذَّبُوۡہُ فَاَخَذَہُمۡ عَذَابُ یَوۡمِ الظُّلَّۃِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۸۹﴾ ۱۸۹۔ انہوں نے شعیب کو جھٹلا ہی دیا، چنانچہ سائبان والے دن کے عذاب نے انہیں گرفت میں لے لیا بیشک وہ بہت بڑے (ہولناک) دن کا عذاب تھا۔

تشریح کلمات

الظُّلَّۃِ : (ظ ل ل) چھتری۔ سائبان۔

تفسیر آیات

چنانچہ انہیں سائبان کے دن کے عذاب نے گرفت میں لے لیا۔ اس جگہ مزید تشریح، آیات اور مستند احادیث سے نہیں ملتی۔ ممکن ہے جیسے ان لوگوں نے مطالبہ کیا تھا کہ آسمان سے ان پر ٹکڑا گرے، اسی سائبان سے ان پر بڑا عذاب آگ کے ٹکڑوں کی شکل میں گرا ہو۔

ایکہ اور مدین کے علاقے مختلف ہونے پر ایک قرینہ یہ ہے کہ ان دونوں علاقوں پر آنے والے عذاب مختلف تھے۔ مدین والوں پر عذاب دھماکے کی شکل میں آیا: فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ ..[1] اور ایکہ والوں پر یَوۡمِ الظُّلَّةِ کا عذاب آیا۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۹۰﴾

۱۹۰۔ اس میں یقیناً ایک نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہ تھے۔

اگر معجزے سے ایمان لانے والے ہوتے تو ان بڑے بڑے معجزوں سے ایمان لے آتے۔

وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۹۱﴾ ع ۱۲/۱۲

۱۹۱۔ اور یقیناً آپ کا پروردگار ہی بڑا غالب آنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔

وَ اِنَّہٗ لَتَنۡزِیۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۹۲﴾ؕ

۱۹۲۔ اور بتحقیق یہ (قرآن) رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔

نَزَلَ بِہِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ﴿۱۹۳﴾ۙ

۱۹۳۔ جسے روح الامین نے اتارا،

عَلٰی قَلۡبِکَ لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾ۙ

۱۹۴۔ آپ کے قلب پر تاکہ آپ تنبیہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں،

تفسیر آیات

۱۔ وَاِنَّہٗ لَتَنۡزِیۡلُ: یہ قرآن رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ سات انبیاء علیہم السلام کے ذکر کے بعد قرآن کا ذکر شروع ہوا کہ جس طرح ان کو مبعوث فرمایا، ان کی تکذیب کی گئی اور تکذیبی قومیں تباہ ہوئیں بالکل اسی طرح یہ قرآن آپؐ کی طرف نازل ہو رہا ہے۔ اسی یکتا رب کی طرف سے جو عالمین کا رب ہے۔

۲۔ نَزَلَ بِہِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ: اس قرآن کو روح الامین یعنی جبرئیل نے قلب رسولؐ پر نازل فرمایا ہے۔ یہاں جبرئیل کا نام لینے کی جگہ روح الامین فرمایا یہ باور کرانے کے لیے کہ اس قرآن کو نازل ایسے فرشتے کے ذریعے کیا ہے کہ جس میں خواہشات کا میلان نہیں ہے۔ مادی خواہشات کا اس میں وجود تک نہیں

[1] ۷ اعراف: ۷۸

ہے۔ خالص روح اور امین ہے۔

عَلٰی قَلْبِكَ : قرآن قلب رسولؐ پر نازل ہوا ہے۔ نزول وحی کے بارے میں مقدمہ اور سورہ بقرۃ آیت ۹۷ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قلب سے مراد صنوبری شکل کا عضو نہیں ہے بلکہ قلب اس مرکزی قوت کا نام ہے جو نفس اور روح کے ماوراء میں موجود ہے۔ قلب رسولؐ پر وحی نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رسول کریمؐ وحی کا ادراک علم حضوری کے طور پر اپنے پورے وجود سے کرتے تھے، نہ محسوسات کی طرح حواس خمسہ سے۔

چنانچہ رسول کریم ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ لوگوں کے درمیان تشریف فرما ہوتے اور غشی طاری ہوتی تو آپؐ فرشتہ وحی کو دیکھ لیتے اور آواز سن لیتے تھے جب کہ گرد و پیش کے لوگ نہ کوئی آواز سنتے تھے، نہ کسی کو دیکھتے تھے۔ اگر عام حواس کے ذریعہ وحی ہوتی تو دوسرے لوگ بھی سن لیتے۔

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ : رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ بشیر و نذیر ہیں لیکن بشارت پر نذارت یعنی تنبیہ کو قرآن زیادہ اہمیت دیتا ہے: اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔[۱] چونکہ انسانی کردار میں انحراف کا خطرہ زیادہ ہے اور خواہشات کا غلبہ انسان پر ہر وقت ہو سکتا ہے جس سے انسان بنیادی طور پر منحرف واقع ہوا ہے اس لیے تنبیہ کو بشارت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کو کردار سازی میں انحراف پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾　　۱۹۵۔ صاف عربی زبان میں۔

تفسیر آیات

عربی زبان کا ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو نہایت واضح اور دل نشین ہو۔ لحن کلام ایسا ہے کہ سننے کو دل چاہتا ہے اور دل میں عناد رکھنے والا بھی اس کلام کی طرف کھنچ جاتا ہے تاکہ کوئی یہ عذر پیش نہ کرے کہ کلام مبہم واضح المعنی نہ ہونے کی وجہ سے ہم سمجھ نہ سکے۔

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾　　۱۹۶۔ اور اس (قرآن) کا ذکر (انبیائے) ما سلف کی کتب میں بھی ہے۔

توحید، رسالت، آخرت کی تعلیمات پر مشتمل یہ قرآن کوئی انوکھی کتاب نہیں ہے۔ یہی تعلیمات تمام

---

[۱] ۱۳ رعد: ۷

انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں موجود ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی رسالت کی اساس انہی تعلیمات پر مبنی ہے۔ خاص کر رد شرک کہ تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے ساتھ شرک کے مسئلے پر نبرد آزما رہے ہیں۔

اَوَلَمۡ یَکُنۡ لَّہُمۡ اٰیَۃً اَنۡ یَّعۡلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۹۷﴾

۱۹۷۔ کیا یہ قرآن ان کے لیے ایک نشانی (معجزہ) نہیں ہے کہ اس بات کو بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں۔

تفسیر آیات

اہل مکہ خود تو سابقہ آسمانی کتابوں سے واقف نہ تھے لیکن انہیں یہ علم تھا کہ بنی اسرائیل کے علماء جو تعلیمات بتاتے ہیں وہ بھی انہی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ مکہ والوں نے علمائے بنی اسرائیل سے مختلف مناسبتوں میں سن لیا تھا کہ یہ تعلیمات وہی ہیں جو ہماری کتاب میں ہیں۔

چنانچہ حضرت جعفر طیارؓ کی دعوت پر بیس افراد پر مشتمل ایک وفد مکہ آیا اور کفار قریش کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپؐ کیا تعلیمات لائے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں چند قرآنی آیات تلاوت فرمائیں۔ یہ آیات سن کر ان کی آنکھیں اشکبار ہوئیں اور ایمان لے آئے۔[1]

اس قسم کے دیگر واقعات سے مکہ والوں کو علم ہو گیا تھا کہ قرآنی تعلیمات آسمانی تعلیمات کا ایک تسلسل ہے۔

وَ لَوۡ نَزَّلۡنٰہُ عَلٰی بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِیۡنَ ﴿۱۹۸﴾

۱۹۸۔ اور اگر ہم اس قرآن کو کسی غیر عربی پر نازل کرتے،

فَقَرَاَہٗ عَلَیۡہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۹۹﴾

۱۹۹۔ اور وہ اسے پڑھ کر انہیں سنا دیتا تب بھی یہ اس پر ایمان نہ لاتے۔

تشریح کلمات

اعجم: (ع ج م) غیر فصیح اور جو اپنے ما فی الضمیر کو بیان نہ کر سکے۔

تفسیر آیات

یہ قرآن جو عربی میں واضح البیان ہے اگر کسی غیر عربی زبان میں نازل کرتے تو یہ کہہ کر اسے رد

[1] سیرت ابن ھشام۔ مجمع البیان

کرتے کہ اس پر ہم کیسے ایمان لے آئیں اس کی زبان ہمارے لیے قابل فہم نہیں ہے۔
بعض اس آیت کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں:

ہم نے قرآن کو عربی زبان میں عربی بولنے والے شخص پر نازل کیا تو تم نے کہا: یہ اس نے خود تصنیف کیا ہے لیکن اگر ہم یہ قرآن عربی زبان میں کسی غیر عرب پر نازل کرتے اور وہ تم کو پڑھ کر سناتا تو بھی تم یہ کہہ کر ایمان لانے سے انکار کرتے کہ یہ صریح جادو ہے کیونکہ غیر عرب عربی میں بات کر رہا ہے۔

یہ تفسیر سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۴۴ کی روشنی میں قابل قبول نہیں ہے جس میں ارشاد فرمایا:

وَلَوۡ جَعَلۡنٰہُ قُرۡاٰنًا اَعۡجَمِیًّا لَّقَالُوۡا لَوۡلَا فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ ...	اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی زبان میں قرار دیتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیات کو کھول کر بیان کیوں نہیں کیا گیا؟

غیر عربی ہونے کی وجہ سے ان کے لیے مبہم ہوتا اور اسی کو بہانہ بنا کر رد کرتے۔ جب کہ اب یہ قرآن فصیح اور واضح البیان عربی میں ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

اہم نکات

۱۔ جن لوگوں نے ایمان نہیں لانا ہوتا ان کے لیے عذر بنانا مشکل نہیں ہوتا۔

کَذٰلِکَ سَلَکۡنٰہُ فِیۡ قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۲۰۰﴾	۲۰۰۔ اس طرح (کے دلائل دے کر) ہم نے اس قرآن کو ان مجرموں کے دلوں میں سے گزارا ہے۔
لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ﴿۲۰۱﴾	۲۰۱۔ پھر بھی وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب دیکھ نہ لیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مجرمین جب کلام الٰہی سن لیتے ہیں تو اہل ایمان کی طرح ان آیات کو دل کی گہرائیوں میں نہیں اتارتے بلکہ وہ اپنے دلوں سے غور و خوض کیے بغیر گزار لیتے ہیں۔ کلام الٰہی کے سامنے وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہرتے، دلوں کو چھوئے بغیر گزار لیتے ہیں۔ انہیں ایسی حالت سے دوچار اللہ نے کیا ہے۔ یعنی جب یہ لوگ ایمان کے اہل ثابت نہ ہوئے تو اللہ نے ان سے ایمان کی توفیق سلب کر لی۔ چنانچہ وہ عذاب سر پر آنے تک ایمان نہیں لائیں گے۔

فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝٢٠٢

۲۰۲۔ پس یہ عذاب ناگہاں اور بے خبری میں ان پر واقع ہوگا۔

فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ۝٢٠٣

۲۰۳۔تو وہ کہیں گے: کیا ہمیں مہلت مل سکے گی؟

تفسیر آیات

۲۔ چنانچہ ایسے مجرمین پر عذاب دفعتہً آ جاتا ہے۔ عذاب دیکھ فوراً اپنی گزشتہ زندگی سامنے آئے گی اور جرائم یاد آئیں گے۔ فوراً ذہنوں میں ایک ارمان ابھرے گا کہ کاش گزشتہ زندگی پلٹ آئے یا ایک موقع اور دیا جاتا تو اس عذاب سے بچنے کا سامان کر لیتے۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝٢٠٤

۲۰۴۔ کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے لیے عجلت کر رہے ہیں؟

تفسیر آیات

۳۔ کیا منکرین اس عذاب کے لیے عجلت کر رہے ہیں جو ہم نے ان کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور وہ ہماری سنت وطریق کار کے بارے میں شک کر رہے ہیں کہ وہ عذاب کب آئے گا؟

اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ۝٢٠٥

۲۰۵۔ یہ تو بتلاؤ کہ اگر ہم انہیں برسوں سامان زندگی دیتے رہیں،

ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝٢٠٦

۲۰۶۔ پھر ان پر وہ عذاب آ جائے جس کا ان کے ساتھ وعدہ ہوا تھا،

مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ۝٢٠٧

۲۰۷۔ تو وہ (سامان زندگی) ان کے کسی کام نہ آئے گا جو انہیں دیا گیا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَرَءَيْتَ: پہلے بھی بیان ہوا کہ اَفَرَءَيْتَ کی ترکیب اخبرنی یہ تو بتلاؤ کے معنی میں آتی ہے۔ فرمایا: یہ تو بتلاؤ تم جس عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہو وہ ابھی نہیں آتا بلکہ تمہیں ڈھیل دی جاتی ہے لیکن جب یہ عذاب دفعتاً آ جائے گا تو یہ ڈھیل تمہارے کس کام کی ہوگی۔ اس ڈھیل سے تمہیں کیا فائدہ ملے گا بلکہ اس ڈھیل میں ان لوگوں نے اپنے جرائم میں اضافہ کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مہلت سے مؤمن اپنے حسنات اور کافر اپنے جرائم میں اضافہ کرتا ہے۔

وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ۞ ۲۰۸۔ اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس بستی کو تنبیہ کرنے والے تھے۔

ذِكۡرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ۞ ۲۰۹۔ یاددہانی کے لیے، اور ہم کبھی ظالم نہ تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ پہلے وہ اپنی طرف سے رسول بھیجتا ہے۔ وہ رسول اپنی رسالت کی حقانیت پر دلیل و معجزہ لے کر آتے اور اپنی قوم کو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ رسول قوم کی طرف سے ہونے والی اذیتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جب ناقابل ہدایت ہوتی ہے تو اس پر عذاب نازل ہوتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں نوسو پچاس سال تبلیغ کی۔ اس کے بعد طوفان کی شکل میں عذاب آیا۔

۲۔ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ: اللہ فرماتا ہے کہ ہم ظالم نہ تھے۔ یعنی اگر حجت پوری کرنے سے پہلے ان پر عذاب نازل کرتے تو ہم ظالم ہوتے۔

واضح رہے مسلمانوں کے ایک کلامی مکتب کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ جو کام بھی کرے گا وہ ظلم نہ ہو گا۔ اس نظریے کے تحت اللہ کا فرمان ہم ظالم نہیں ہیں کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے ظلم صادر ہی نہیں ہو سکے گا۔ جو کام بھی ہم سے صادر ہو گا وہ ظلم نہ ہو گا۔ خواہ تمام مؤمنین کو جہنم میں اور کافروں کو جنت میں ڈال دیں۔

شیعہ امامیہ کا نظریہ یہ ہے کہ ظلم قبیح ہے اور اللہ کی ذات قبائح سے پاک و منزہ ہے۔ لہٰذا اللہ ظلم نہیں کرتا، نہ یہ کہ ظلم کر نہیں سکتا۔ دوسری بات یہ کہ اگر اللہ مؤمن کو ثواب اور کافر کو عذاب نہ دے تو یہ ظلم اور ناانصافی ہو گی، غرض خلقت کی نفی اور خلقت عبث ہو جائے گی اور اللہ عبث کاری سے پاک ہے۔ لہٰذا اللہ سے ظلم صادر نہیں ہو سکتا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف سے ظلم کا خطرہ نہیں، رحمت کی امید ہوتی ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتۡ بِهِ الشَّيٰطِيۡنُ ۞ ۲۱۰۔ اور اس قرآن کو شیاطین نے نہیں اتارا۔

وَ مَا یَنۡۢبَغِیۡ لَهُمۡ وَ مَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ﴿۲۱۱﴾

۲۱۱۔ اور نہ یہ کام ان سے کوئی مناسبت رکھتا ہے اور نہ ہی وہ استطاعت رکھتے ہیں۔

اِنَّهُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ ﴿۲۱۲﴾

۲۱۲۔ وہ تو یقیناً (وحی کے) سننے سے بھی دور رکھے گئے ہیں۔

تفسیر آیات

کفار قریش کا سب سے بڑا الزام یہ تھا: محمد کاہن ہے دوسرے کاہنوں کی طرح۔ محمد کا شیاطین سے رابطہ قائم ہوا ہے اور یہ شیاطین اس قسم کا کلام بنا کر لاتے ہیں۔

جواب میں فرمایا: یہ شیاطین کا کلام نہیں ہے پھر اس کی وجوہات بیان فرمائیں:

اول: یہ کہ وَمَا یَنۡۢبَغِیۡ لَهُمۡ اس کلام اور شیاطین میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ کہاں یہ ملکوتی کلام اور کہاں شیاطین۔ قرآنی تعلیمات، افکار، اخلاق، حقائق، رموز، اسرار اور شیاطین کی شرارت، خرافات اور فسادات میں کوئی تناسب نہیں ہے۔ خود وقت کے کاہن بھی تو گواہی دیتے تھے کہ اس قرآن کی کاہن کے کلام کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے۔

دوم: یہ کہ وَمَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ شیاطین کی قدرت میں نہیں ہے کہ وہ اس قسم کا کلام پیش کریں۔ اگر ممکن ہوتا تو خود مشرکین، کاہنوں کے ذریعے جنات و شیاطین سے رابطہ کر کے قرآن کا مقابلہ کرتے اور شیاطین کے ذریعے قرآن جیسا کلام پیش کرتے۔

سوم: یہ کہ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ شیاطین آسمانی خبریں سننے سے دور رکھے گئے ہیں۔ اب وہ لپکتے شعلوں کی زد میں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ خود کلام الٰہی میں ایسے شواہد موجود ہیں کہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہوسکتا۔

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۲۱۳﴾

۲۱۳۔ پس آپ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکاریں ورنہ آپ بھی عذاب پانے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔

تفسیر آیات

خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اور اس خطاب کے ذریعے ایک حقیقت بیان کرنا مقصود ہے کہ

اگر بفرض محال خود رسول اللہ ﷺ کسی غیر خدا کو معبود بنا لیتے ہیں تو وہ بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ رسولؐ کا معصوم ہونا اپنی جگہ درست ہے۔ معصوم سے شرک سرزد نہ ہوگا تاہم معصوم بھی شرک سے بچنے کے مکلّف ضرور ہیں۔ عصمت کی وجہ سے غیر مکلّف نہیں ہوتے۔ قرآن میں اس کی دیگر مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً فرمایا:

لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ ...[1]　اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضرور حبط ہو جائے گا۔

وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴿۲۱۴﴾　۲۱۴۔ اور اپنے قریب ترین رشتے داروں کو تنبیہ کیجیے۔

تشریح کلمات

عشیرۃ: عشیرۃ الرجل قرابتہ: عشیرۃ سے مراد قریبی رشتے دار ہیں چونکہ قریبی رشتہ دار باہم معاشرت کرتے ہیں اس لیے عشیرہ کہا گیا ہے۔

تفسیر آیات

انبیا علیہم السلام تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ اپنے قرابتداروں سے شروع فرماتے ہیں۔ الۡاَقۡرَبِیۡنَ میں بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب شامل ہیں۔ (جلالین)

الۡاَقۡرَبِیۡنَ قریبی ترین رشتہ داروں سے دعوت کی ابتدا اس لیے بھی ہو رہی ہے کہ رسولؐ کی حیات میں یہی لوگ سب سے زیادہ رسولؐ کے حامی ہوں گے اور رسولؐ کی حیات کے بعد تبلیغ کا بوجھ اٹھانے والے یہی ہوں گے۔

نیز دعوت اپنے قریبی ترین رشتہ داروں سے شروع کرنے میں یہ راز بھی ہے کہ اگر قریبی لوگوں کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کو دعوت دیتے تو ذہنوں میں ایک سوال اٹھ سکتا تھا کہ اپنے قریبی رشتہ دار چونکہ محمدؐ کو قریب سے جانتے ہیں، اگر یہ دعوت حق پر مبنی ہوتی تو رشتہ داروں کو پہلے دعوت دینا چاہیے تھا۔ رسول اللہؐ کی دعوت یا خود رسول اللہؐ میں کوئی کمزوری ہوتی تو قریب سے جاننے والوں سے پرہیز کرتے۔

الۡاَقۡرَبِیۡنَ: قریبی ترین رشتہ دار۔ بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب قریبی ترین شامل ہیں جیسا کہ لفظ عشیرۃ کی تاکید اور مزید وضاحت کے لیے اقربین فرمایا۔

لہٰذا وہ روایات جن میں کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے قریش کے تمام قبائل کو بلایا۔ قرآنی صراحت کے خلاف ہے۔ ساتھ ان روایات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس دعوت کے موقع پر تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ[2] نازل ہوئی ہے اس کے مطابق لازم آتا ہے سورہ شعراء، سورہ تبت سے پہلے نازل ہوا ہو جب کہ ترتیب نزول میں سورہ تبت چھٹا سورہ ہے اور سورہ شعراء ۴۷ واں سورہ ہے۔

---

[1] ۳۹ زمر: ۶۵　[2] ۱۱۱ مسد: ۱

شان نزول: عبد اللہ بن عباس حضرت علی علیہ السلام روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:
جب رسول اللہؐ پر آیہ وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے مجھے بلایا فرمایا:
یا علی! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں قریبی ترین رشتہ داروں کی تنبیہ کروں۔ اس حکم سے میرا دل تنگ ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ میں جب یہ کام شروع کروں گا تو ان کا ردعمل نامناسب ہو گا۔ میں نے خاموشی اختیار کی تو جبرئیل نازل ہوئے اور کہا:
اے محمد! اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو اللہ آپ کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔
لہٰذا اے علی! ایک صاع کھانا تیار کرو۔ ایک بھیڑ کی ران اور ایک پیالہ دودھ سے بھر دو۔ پھر عبد المطلب کے خاندان کے افراد کو جمع کرو کہ میں ان سے بات کروں اور جس چیز کا مجھے حکم ملا ہے وہ ان تک پہنچا دوں۔
میں نے حکم کی تعمیل کی اور سب کو بلایا جو چالیس افراد بنتے تھے۔ ایک کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ ان میں ان کے چچا عباس، حمزہ، ابوطالب، ابولہب شامل تھے۔ جب یہ سب لوگ جمع ہو گئے تو مجھ سے کھانا پیش کرنے کے لیے فرمایا۔ جب میں نے پیش کیا تو رسول اللہؐ نے گوشت کا ایک ٹکڑا لیا اور اپنے دانتوں سے اس کو چیرا پھر اسے برتنوں کے کناروں پر ڈال دیا پھر فرمایا:
لے لو بسم اللہ۔
چنانچہ سب نے کھایا اور سب سیر ہو گئے۔ جب کہ اس اللہ کی قسم! جس کے قبضے میں علی کی جان ہے جو کھانا میں نے پیش کیا تھا وہ ان کا ایک آدمی کھا سکتا تھا۔ پھر فرمایا:
ان کو پلاؤ۔
پھر میں نے وہ پیالہ پیش کیا تو سب نے پیا اور سب سیراب ہو گئے جب کہ قسم بخدا ان کا ایک آدمی یہ سارا پی سکتا تھا۔ رسول اللہؐ نے بات شروع کرنا چاہی تو ابولہب نے پہل کی اور کہا:
تمہارے اس ساتھی نے تو پہلے بھی ایسے جادو کیے ہیں۔
جس سے لوگ متفرق ہو گئے۔ دوسرے دن رسول اللہؐ نے فرمایا:
اے علی! اس شخص نے پہل کی۔ میرے بات کرنے سے پہلے لوگ متفرق ہو گئے۔ تم پہلے کی طرح ان کے لیے کھانا تیار کرو۔
میں نے ایسا کیا اور سب کو جمع کیا۔ گذشتہ کل کی طرح کھانا پیش کیا۔ سب نے سیر ہو کر کھایا اور سیراب ہو کر پیا۔

پھر رسول اللہ نے بات شروع کی۔ فرمایا:

اے عبد المطلب کی اولاد! میں کسی عرب جوان کو نہیں جانتا جو اپنی قوم کی طرف اس چیز سے بہتر لے کر آیا ہو جو میں لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ لوگوں کو اسی بھلائی کی طرف دعوت دوں۔

آپ میں سے کون ہے جو اس سلسلے میں میرا ہاتھ بٹائے کہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ بن جائے۔

سب رک گئے میں نے کہا:

حالانکہ میں ان سب میں کم سن، آشوب چشم والا، ابھرے شکم والا، نازک پنڈلی والا تھا۔

یا نبی اللہ! میں آپ کا ہاتھ بٹانے والا ہوں گا۔

رسول اللہؐ نے میری گردن پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

ان هذا اخی و وصیی و خلیفتی فیکم فاسمعوا له واطیعوا۔

یہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ ہے۔ اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔

اس پر لوگ ہنستے ہوئے کھڑے ہوئے اور ابوطالب سے کہا:

تجھے اپنے بیٹے کی بات سننے اور اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہ حدیث درج بالا الفاظ کے ساتھ طبری نے اپنی تاریخ، **تاریخ الامم و الملوک ۲: ۳۱۹** میں اور **ابوجعفر اسکافی** نے **نقض العثمانیة ۳۰۳** میں روایت کی ہے اور کہا ہے:

انه روی فی الخبر الصحیح۔

اور **شهاب الدین خفاجی** نے **شرح الشفا ۳: ۳۵** میں نقل کیا ہے اور آخر میں کہا ہے:

و قد ذکر دلائل البیهقی وغیره بسند صحیح۔

۲۔ دوسرے الفاظ میں یہ حدیث اس طرح آئی ہے:

فایکم یبایعنی علی ان یکون اخی وصاحبی و وارثی۔ تم میں کون ہے جو میری اس بات پر بیعت کرے کہ وہ میرا بھائی، میرا ساتھی اور میرے وارث ہو۔

تین بار ان جملوں کی تکرار فرمائی۔ آخر میں علی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ان الفاظ میں **امام احمد بن حنبل** نے اپنی **مسند ۲: ۳۵۷** میں روایت کی ہے اور اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ **امام نسائی** نے **الخصائص** اور **السنن الکبری ۵: ۱۲۵** میں روایت کی ہے۔

ملاحظہ ہو الغدیر ۲: ۳۹۹۔

۳۔ تیسرے الفاظ میں یہ حدیث اس طرح آئی ہے:

من يبايعني على ان يكون اخى و صاحبى و وليكم بعدى۔ فمددت يدى و قلت انا ابايعك۔

کون میرے ہاتھ اس بات پر بیعت کرے گا کہ وہ میرا بھائی، میرا ساتھی اور میرے بعد تمہارا ولی ہو تو میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا: میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔

ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے حافظ ابن مردويه نے جس کا سیوطی نے جمع الجوامع میں ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کنز العمال ۱۳: ۱۷۴

۴۔ چوتھے الفاظ میں یہ حدیث اس طرح منقول ہے:

فقال اجلس فانت اخى و وزيرى و وصيى و وارثى و خليفتى من بعدى۔

فرمایا: علی بیٹھ جاؤ۔ تو میرا بھائی، میرا وزیر، میرا وصی، میرا وارث اور میرے بعد میرا خلیفہ ہے۔

حافظ ابو حاتم اور حافظ بغوی نے ان الفاظ میں راویت کی ہے۔ ملاحظه هو السيرة الحلبية ۱: ۲۸۶

۵۔ پانچویں الفاظ میں یہ حدیث اس طرح منقول ہے۔

ثم قال: من يواخينى و يوازرنى و يكون وليى و وصيى بعدى و خليفتى فى اهلى يقضى دينى۔

پھر فرمایا: کون میرا بھائی اور وزیر ہوگا کہ میرے بعد میرا ولی اور وصی اور میرے اہل بیت میں میرا خلیفہ بن جائے اور میرا قرض ادا کرے۔

الکشف والبیان ثعلبی ۷: ۱۸۲ نے یہ روایت بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو کفایة الطالب گنجی صفحہ ۲۰۴۔

مصر کے مقتدر ادیب اور شاعر عبدالمسیح انطاکی نے اپنے اشعار میں اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔ آخر میں کہتے ہیں:

كذاك حيدرة ماشى النبوة مذ نادى بها المصطفى لبى مناديها
وشارك المصطفى من يوم ان وضع الا ساس حتى انتهت عليا مبانيها

اس طرح حیدر نبوت کے ساتھ چلتے رہے۔ جب بھی مصطفیٰ نے ندا دی آپ نے لبیک کہا۔ جس دن محمد مصطفیٰ نے اس دین کی بنیاد رکھی ہے اس دن سے لے کر اس عمارت کی تکمیل تک آپ مصطفیٰ کے شریک رہے۔

حدیث کی تحریف: طبری نے یہ حدیث اپنی تاریخ میں مکمل بیان کی ہے لیکن اپنی تفسیر میں اس حدیث میں تحریف کر ڈالی۔ چنانچہ على ان يكون اخى و وصيى وخليفتى فيكم کے الفاظ میں سے

وصیی و خلیفتی فیکم کی جگہ و کذا و کذا لکھ دیا۔ حدیث کے آخر میں بھی ان ھذا اخی کے بعد وصی اور خلیفتی کی جگہ و کذا و کذا لکھ دیا۔

ابن کثیر اپنے مصادر میں تاریخ طبری کو سرفہرست رکھتے ہیں لیکن اس حدیث کی نقل میں تاریخ طبری کی جگہ تفسیر طبری کی تحریف شدہ روایت انہیں زیادہ پسند آئی اور اپنی تاریخ البدایۃ و النہایۃ ۳: ۵۳ میں اور تفسیر میں وصیی و خلیفتی کی جگہ و کذا و کذا لکھ دیا۔

آیت میں تحریف: صحیح مسلم میں ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ آیت اس طرح نازل ہوئی:

و انذر عشیرتك الاقربین و رھطك منھم المخلصین۔ کہتے ہیں پھر نسخ ہو گئی۔

شاید آیت پہلے نازل ہوئی پھر اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی پھر اس کا ایک حصہ سورہ شعراء میں دوبارہ نازل ہوا ہے۔[1]

تفسیر قرطبی میں کہا ہے:

وظاھر ھذا انہ کان قرانا یتلی و انہ نسخ۔	اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (و رھطك منھم المخلصین) قرآن کا حصہ تھا اور تلاوت بھی ہوتی تھی جو بعد میں نسخ ہو گیا۔

اس قسم کی روایات کے تحت اس قسم کی عبارتوں کو اہل سنت کے علماء قرآن کا حصہ تسلیم کرتے ہیں۔ پھر نظریہ نسخ تلاوت کے ذریعہ منسوخ فرض کرتے ہیں۔

ہم نے مقدمہ میں وضاحت سے لکھا ہے کہ اس قسم کی روایات میں اہل تشیع اور اہل سنت کے موقف میں بنیادی فرق یہ رہا ہے کہ شیعہ ایسی روایات کے تحت اس قسم کی عبارتوں کو قرآن کا حصہ نہیں سمجھتے اور ان عبارتوں کو قرآن تسلیم کرنے سے پہلے توجیہ تاویل یا مسترد کرتے ہیں۔ اہل سنت ایسی عبارتوں کو قرآن کا حصہ تسلیم کرنے کے بعد ایک متنازعہ نظریے کے تحت منسوخ سمجھتے ہیں۔ وہ متنازعہ نظریہ نسخ تلاوت ہے۔ پہلے بھی ذکر ہو چکا نسخ تلاوت ایک مفروضہ ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ نسخ تلاوت ثابت نہ ہونے کی صورت میں اس قسم کی عبارتیں قرآن کا حصہ رہتی ہیں۔ اس سے تحریف قرآن لازم آتی ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اعتراض: کیا ایک نابالغ بچے کو وصی، وارث اور خلیفہ بنایا جاتا ہے؟ کیا بزرگوں کو دعوت دینے کے لیے ایک بچے سے کام لیا جاتا ہے؟ کیا رسول اللہ ایک بچے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس سے بیعت لے سکتے ہیں؟

جواب: کیا حضرت علی علیہ السلام غیر مکلّف، غیر عاقل تھے؟ تو کیا رسول اللہؐ نے ایک غیر مکلّف اور غیر عاقل کو ایمان کی دعوت دی؟ کیا رسول اللہؐ نے علی علیہ السلام ایمان کو قبول نہیں کیا؟ اگر دعوت دی ہے تو

---

[1] التحریر و التنویر ۱۹: ۲۰۵

کیا یہ دعوت بحکم خدا تھی یا ذاتی خواہش پر؟

چونکہ رسول اللہ نے علی علیہ السلام کے علاوہ کسی بچے کو اسلام کی دعوت نہیں دی لہٰذا علی علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہیں کہ وجود میں آنے کے فوراً بعد ایمان لے آئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح کہ ابھی ایک دن کے تھے، اپنی نبوت کا اعلان کیا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی طرح ہیں جنہیں طفولیت میں حکمت دے دی گئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح ہیں جو گیارہ سال کی عمر میں حضرت داود علیہ السلام کا جانشین ہوئے۔

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۱۵﴾

۲۱۵۔ اور مومنین میں سے جو آپ کی پیروی کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آئیں۔

تشریح کلمات

وَاخۡفِضۡ: (خ ف ض) الخفض جھکنے کے معنوں میں ہے۔

جَنَاحَكَ: (ج ن ح) الجناح پرندے کا بازو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ: کا لفظی ترجمہ پروں کا نیچے رکھنا ہے۔ یہ محاورہ ہے نرمی برتنے، مہر و محبت کا اظہار کرنے کے لیے چونکہ پرندے زمین پر اترتے ہوئے پروں کو نیچے کر دیتے ہیں اور مہر و محبت کے پر اپنے چوزوں کے لیے پھیلا کر نیچے کر دیتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم مل رہا ہے کہ جو چند افراد اس وقت مؤمن بن گئے ہیں ان کی مہر و محبت کے ساتھ حفاظت کرو۔

چنانچہ سورہ توبۃ آیت ۱۲۸ میں فرمایا:

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ○

تحقیق تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے تمہیں تکلیف میں دیکھنا ان پر شاق گزرتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کا نہایت خواہاں ہے اور مومنین کے لیے نہایت شفیق، مہربان ہے۔

وہ تمہاری بھلائی کا نہایت خواہاں ہے اور مؤمنین کے لیے نہایت شفیق مہربان ہے۔ من المؤمنین سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ دعوت ذوالعشیرۃ سے پہلے چند افراد مؤمن تھے۔ وہ حضرت خدیجہ (س) کے گھر کے تمام افراد مؤمن تھے۔

اہم نکات

۱۔ رحیم و مہربان رب کا نمائندے اللہ کی رحمت و مہربانی کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّىْ بَرِىْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۲۱۶

۲۱۶۔ اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو ان سے کہد یجیے کہ میں تمہارے کردار سے بیزار ہوں۔

تفسیر آیات

ان قریبی رشتے داروں میں سے جو لوگ مؤمن ہیں اور آپؐ کی اتباع کرتے ہیں۔ ان کے لیے مہر ومحبت اور تواضع کریں اور جو لوگ آپؐ کی دعوت کی نافرمانی کرتے ہیں اور ابولہب کی طرح اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں تو ان سے بیزاری کا اظہار کیجیے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ وَلِیَّ مُحَمَّدٍ مَنْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَ اِنْ بَعُدَتْ لُحْمَتُہُ وَ اِنَّ عَدُوَّ مُحَمَّدٍ مَنْ عَصَی اللّٰہَ وَ اِنْ قَرُبَتْ قَرَابَتُہُ۔[1]

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوست وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کرے اگرچہ ان سے کوئی قرابت نہ ہو اوران کا دشمن وہ ہے جو اللہ کی نافرمانی کرے اگرچہ قریبی نزدیکی قرابت رکھتا ہو۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن اگر حضورؐ کی مکی زندگی جیسے حالات میں ہے تو لوگوں کے برے اعمال سے بیزاری کرنا چاہیے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝۲۱۷

۲۱۷۔ اور بڑے غالب آنے والے مہربان پر بھروسہ رکھیں۔

الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝۲۱۸

۲۱۸۔ جو آپ کو اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب آپ (نماز کے لیے) اٹھتے ہیں۔

وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝۲۱۹

۲۱۹۔ اور سجدہ کرنے والوں میں آپ کی نشست و برخاست کو بھی۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۲۲۰

۲۲۰۔ وہ یقیناً بڑا سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

اس دعوت کے بعد پیش آنے والی مشکلات کے لیے اس ذات پر بھروسہ کرو جس کے یہ اوصاف ہیں:

---

[1] الوسائل الشیعۃ ۱۵: ۲۳۸۔ نہج البلاغۃ حکمت: ۹۶

۱۔ الۡعَزِیۡزِ : بالا دست غالب آنے والا ہے۔ ہر سازش، ہر طاقتور دشمن کی دشمنی پر غالب آنے والا ہے۔

۲۔ الرَّحِیۡمِ : وہ غالب آنے والا ہونے کے ساتھ مہربان بھی ہے۔ اس ذات پر بھروسہ کرنے میں لطف آنا چاہیے جو عین طاقت ہونے کے ساتھ مہربان بھی ہے ورنہ طاقتور بے رحم ہوا کرتے ہیں۔

۳۔ الَّذِیۡ یَرٰىکَ : جو آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے:

الف: حِیۡنَ تَقُوۡمُ : جب آپ تہجد کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو رات کی تاریکی میں وہی مہرباں ذات ہے جو آپ کو دیکھ رہی ہے یا رسالت کا بوجھ اٹھا کر قیام کرتے ہیں تو اللہ آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ آپ اللہ کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔

ب: وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیۡنَ : بعثت کے ابتدائی دنوں کی بات معلوم ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے تائید و حوصلہ دیا جا رہا ہے کہ آپؐ اپنی تبلیغ رسالت میں اللہ پر بھروسہ کریں۔ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے خواہ آپ اکیلے نماز پڑھ رہے ہوں یا سجدہ گزاروں میں ہوں یعنی ہر حالت میں آپ ہماری نگرانی میں ہیں۔

اس آیت کی ایک تفسیر تو یہی ہے کہ ساجدین سے مراد نماز گزار لوگ ہیں جن میں رسول کریم ﷺ نشست و برخاست فرماتے تھے۔

دوسری تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ روایت میں آیا ہے:

جب تہجد کی نماز کا وجوب منسوخ ہو گیا تو اس رات رسول کریم ﷺ اپنے اہل ایمان کے گھروں کو ان کا حال دیکھنے تشریف لے گئے تو ذکر و تلاوت کی آواز اس طرح آرہی تھی جیسے شہد کی مکھیوں کی آوازیں ہیں۔

اس روایت کے تحت آیت کا یہ مفہوم بنتا ہے کہ اللہ آپؐ کی رفت و آمد کو بھی دیکھ رہا ہے جو آپؐ سجدہ گزاروں کے درمیان کرتے ہیں۔

تیسری تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ اللہ آپ کے سجدہ گزار آباء و اجداد میں منتقل ہونے کو دیکھ رہا تھا۔ اس تفسیر کے مطابق شیعہ و سنی مصادر میں روایات موجود ہیں۔

تفسیر قرطبی اور الدر المنثور میں ابن عباس کی یہ روایت ہے:

ھی فی اصلاب الاباء آدم و نوح و ابراھیم حتی اخرجه نبیاً۔	یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے آباء آدم، نوح، ابراہیم علیہم السلام کے بارے میں ہے یہاں تک آپ ﷺ کو نبی بنا کر (اپنے پدر کے صلب سے) پیدا کیا۔

شیعہ امامیہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آباء و اجداد سب مومن موحد تھے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنے رسول کو اپنی خاص نگرانی میں رکھتا ہے۔

هَلۡ اُنَبِّئُکُمۡ عَلٰی مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیۡنُ ﴿۲۲۱﴾ ۲۲۱۔ کیا میں تمہیں خبر دوں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں؟

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۲۲﴾ ۲۲۲۔ ہر جھوٹے بدکار پر اترتے ہیں۔

یُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ وَ اَکۡثَرُہُمۡ کٰذِبُوۡنَ ﴿۲۲۳﴾ ۲۲۳۔ وہ کان لگائے رکھتے ہیں اور ان میں اکثر جھوٹے ہیں۔

تشریح کلمات

اَفَّاکٍ : (ا ف ك) الافك ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔

اَثِیۡمٍ : (ا ث م) الاثم وہ اعمال و افعال ہیں جو ثواب سے روکنے والے ہوں جس کا ترجمہ ''گناہ'' سے کیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

هَلۡ اُنَبِّئُکُمۡ : آیت ۲۱۰ میں فرمایا کہ یہ قرآن شیاطین کی طرف سے نہیں ہو سکتا۔ شیاطین اور قرآن میں کوئی تناسب نہیں ہے۔

اس آیت میں فرمایا: شیاطین کا تناسب کن لوگوں کے ساتھ ہے۔ شیاطین کے افکار ان کاہنوں کے ساتھ ملتے ہیں جو دروغ بافی کرتے ہیں۔ اَفَّاکٍ ہیں، خودساختہ باتیں کرتے ہیں۔ اَثِیۡمٍ ہیں، جرائم پیشہ ہیں۔ لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کو غیب کی باتیں کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں۔

یُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ : القاء السمع کان لگا کر سننے کو کہتے ہیں۔ فرمایا: یہ لوگ کان لگا کر سنتے ہیں۔ کون لوگ کس سے سنتے ہیں؟ دو رائے ہیں: ایک یہ کہ یہ کاہن شیاطین کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں پھر ان باتوں کو حقیقت کا روپ دے کر لوگوں سے بیان کرتے ہیں جو بیشتر جھوٹی ہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ شیاطین کان لگائے بیٹھتے ہیں کہ فرشتوں سے کوئی معلومات ہاتھ آئیں۔ اگر کوئی ایک آدھ جملہ ہاتھ آ جائے تو اسے کاہنوں کو بتا دیتے ہیں۔ ان میں بھی اکثر جھوٹ پر مبنی ہیں۔

سیاق آیت کے مطابق پہلی رائے قابل ترجیح ہے چونکہ اَکۡثَرُہُمۡ کٰذِبُوۡنَ کاہنوں کے بارے میں ہے۔ اس جملے سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ان کاہنوں کی ایک آدھ بات صحیح نکل آتی ہے جس کی بنیاد پر ان کے جھوٹ کے لیے مارکیٹ بن جاتی ہے۔

وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُہُمُ الۡغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ ۲۲۴۔ اور شاعروں کی پیروی تو گمراہ لوگ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

کفار کا ایک الزام یہ تھا کہ محمدؐ شاعر ہیں:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ۝ [۱]	کیا یہ لوگ کہتے ہیں: یہ شاعر ہے، ہم اس کے بارے میں گردش زمانہ (موت) کے منتظر ہیں؟

اس آیت میں فرمایا الشُّعَرَاۗءُ کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔

الشُّعَرَاۗءُ: قرآن کن لوگوں کو شعراء کہتا ہے؟ بعض کے نزدیک شعراء ان جنات کو کہتے ہیں جو وحی کی باتیں سن کر کاہنوں کو بتاتے ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا:

ھم القصاص۔ [۲]	شعراء سے مراد قصہ گو لوگ ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے۔ فرمایا:

ھل رأیت شاعراً یتبعہ احد انما ھم قوم تفقھوا لغیر الدین فضلوا واضلوا۔ [۳]	کیا تو نے کسی شاعر کو دیکھا ہے اس کی کوئی پیروی کر رہا ہو۔ یہاں شاعر سے مراد وہ قوم ہے جو غیر مذہبی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے پھر وہ گمراہ ہوتی اور گمراہ کرتی ہے۔

لہٰذا آیت میں شعراء سے مراد وہ لوگ ہیں جو حقائق اور واقع نفس الامری سے دور خیالات اور تصورات کی ایک موہوم دنیا کی باتیں کرتے ہیں۔ شاعری سے مراد وہ معنی نہیں ہو سکتے جو ہمارے درمیان متعارف ہیں چونکہ مشرکین قرآن کو شعر اور رسول کو شاعر کہتے تھے۔ ان لوگوں کے مطابق قرآنی آیات حقائق کی نشاندہی نہیں کرتیں بلکہ یہ خیالات و تصورات کی باتیں ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّـھُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ۝۲۲۵	۲۲۵۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

تفسیر آیات

کیا آپ نہیں دیکھتے یہ شعراء لوگ قرآن کی طرح ایک منزل، ایک مقصد اور ایک ہدف کی طرف نہیں جاتے بلکہ وہ ہر وادی میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ کبھی حق کو باطل اور باطل کو حق دکھایا۔ کبھی بزدل کو بہادر اور بہادر بزدل بنایا۔ کبھی بخیل کو سخی اور سخی کو بخیل ظاہر کیا۔ وہ ہر حق و حقیقت سے دور و ہمیات کی وادیوں

۱۔ ۵۲ طور: ۳۰ ۲۔ الوسائل ۱۷: ۱۵۴ ۳۔ تفسیر البرھان ۴: ۱۹۴

میں بے مقصد سر گرداں ہوتے ہیں۔

وَ اَنَّهُمۡ یَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲۲۶﴾ ۲۲۶۔ اور جو کہتے ہیں اسے کرتے نہیں۔

شاعروں کی ایک علامت یہ ہے کہ ان کے اقوال ان کی سیرت و کردار کے مطابق نہیں ہوتے۔ خود بخیل ہوتے ہیں، سخاوت کی تعریف کرتے ہیں۔ خود بزدل ہوتے ہیں، بہادری کی تعریف کرتے ہیں جب کہ رسول اللہ ﷺ جو بات بھی ارشاد فرماتے ہیں اس کا اعلیٰ ترین نمونہ ان کی ذات میں پایا جاتا ہے:

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ ...[1] تحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے....

اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا وَّ انۡتَصَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا ؕ وَ سَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۲۲۷﴾ ع ۱۱/۲۶/۱۵

۲۲۷۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل بجا لائے اور کثرت سے اللہ کو یاد کریں اور مظلوم واقع ہونے کے بعد انتقام لیں اور ظالموں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام کو پلٹ کر جائیں گے۔

تفسیر آیات

البتہ اسلام فن شعری کے خلاف نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً وَ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْراً۔[2] کبھی شعر حکمت پر مشتمل ہوتا ہے اور بیان میں جادو ہوتا ہے۔

۱۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اگر شعراء ایمان اور عمل صالح والے ہیں تو ان میں وہ تین باتیں نہ ہوں گی جو غیر مؤمن شعراء میں ہیں۔ وہ عمل صالح بجا لانے والے ہوں گے۔ اس لیے اپنے اشعار کو وہ عمل صالح کے لیے استعمال کریں گے۔

۲۔ وَ ذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا: ان کے اشعار ان کو ذکر خدا سے غافل کرنے کا سبب نہیں بنتے بلکہ ذکر خدا کا سبب بنتے ہیں کہ وہ اپنے اشعار کو اللہ کی رضا کے لیے مختص کرتے ہیں۔

۳۔ وَّ انۡتَصَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا: اپنے اشعار کو ظالموں سے انتقام لینے کا ذریعہ بنائیں۔

---
[1] ۳۳ الاحزاب: ۲۱ [2] الفقیہ ۴: ۳۷۹

مظلوم واقع ہونے کے بعد اگر ضرب سنان ممکن نہ ہو تو ضرب لسان بہترین ذریعہ ہے ظالموں سے انتقام لینے کا:

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الۡجَہۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ ...[1] — اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی (کسی کی) برملا برائی کرے، مگر یہ کہ مظلوم واقع ہوا ہو

چنانچہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام ان شعراء کی قدر کرتے تھے جو اہل بیت کی مدح اور دشمنان اہل بیت کی ہجو میں شعر کہتے تھے۔ چنانچہ لوگ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے فضائل میں شعر کہتے ہیں اور ان کے مصائب کے سلسلے میں مرثیہ کہتے ہیں۔ وہ سب وَّانۡتَصَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا کے مصداق میں شامل ہوں گے البتہ ایمان و عمل صالح اور ذکر خدا کے ساتھ ہوں، ان کی جگہ نہ ہوں جیسا کہ بعض ناداں خیال کرتے ہیں۔

۴۔ وَسَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا: اس میں عصر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مشرکین کے بارے میں اور بعد میں آنے والے ہر ظالم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ایک کلی قانون کی طرف اشارہ ہے کہ ظالم کا انجام بہت برا ہو گا:

یَوۡمُ الۡمَظۡلُوۡمِ عَلَی الظَّالِمِ اَشَدُّ مِنۡ یَوۡمِ الظَّالِمِ عَلَی الۡمَظۡلُوۡمِ۔[2] — مظلوم کا ظالم سے انتقام کا دن ظالم کے مظلوم پر ظلم کے دن سے زیادہ شدید ہو گا۔

بعض شیعہ روایات میں اس آیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

سیعلم الذین ظلموا (حق آل محمد) ای منقلب ینقلبون.

درمیان میں حق آل محمد روایت کا حصہ ہے جو مصداق بیان کرنے کے سلسلے میں ہے۔ قرآن کا حصہ نہیں ہے۔ اس بات پر دوسرے بہت سے یقینی دلائل کے ساتھ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے دوسرے مقامات پر جب اس آیت کی تلاوت فرمائی تو ''حق آل محمد'' کے بغیر تلاوت فرمائی ہے۔

---

[1] ۴ نساء: ۱۴۸ [2] نہج البلاغۃ حکمت: ۲۴۱

سُورَةُ النَّمۡلِ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ المبارکہ کی آیات کی تعداد کوفہ کے قاریوں کے مطابق ۹۳ آیت، بصرہ کی قرآئت کے مطابق ۹۴ آیت اور حجاز والوں کی قرائت کے مطابق ۹۵ آیت ہے۔

کوفہ کی قرائت چونکہ قاری عاصم نے قاری ابوعبدالرحمٰن سلمی سے انہوں نے حضرت علی سے اخذ کیا ہے۔ اس لیے قاری عاصم کی قرائت زیادہ مستند ہے۔ یہ سورۃ بالاتفاق مکی ہے دیگر سورہ ہائے قرآن کی طرح اس سورۃ کی کسی آیت کے بارے میں نہیں کہا گیا یہ مدنی ہے۔

تفسیر خازن کے مطابق یہ سورۃ المبارکہ ایک ہزار تین سوسترہ (۱۳۱۷) کلمات اور چار ہزار سات سونوے (۴۷۹۰) حروف پر مشتمل ہے۔

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ بنام خدائے رحمن رحیم

طٰسٓ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۱﴾ ۱۔ طا، سین، یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں۔

ہُدًی وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ ۲۔مومنین کے لیے ہدایت و بشارت ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ طٰسٓ: حروف مقطعات کے بارے میں سورہ بقرہ اور سورہ مریم میں ذکر ہو چکا ہے۔

۲۔ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡقُرۡاٰنِ: اس سورہ میں پیش نظر آیات، قرآن کی آیات ہیں جو کتاب مبین ہے۔ قرآن اور کتاب مبین دونوں ایک ہیں۔

مجمع البیان میں فرمایا:

> دو صفات اس لیے بیان ہوئی ہیں تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ " قرآن" قرائت اور " کتاب" کتابت کے ذریعے ظاہر ہو گا اور مبین اس لیے فرمایا یہ قرآن ایک ناطق کی طرح ہے جو امر و نہی، حلال و حرام، وعدہ اور وعید کو بیان کرتا ہے۔

۳۔ ہُدًی: یہ قرآن مؤمنین کے لیے ہدایت اور بشارت ہے اگرچہ یہ تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے ہے: ہُدًی لِّلنَّاسِ ....[1] تاہم اس سے عملاً ہدایت لینے والے صرف مؤمنین ہیں۔ لہٰذا نتیجتاً یہ صرف مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔

۴۔ وَّ بُشۡرٰی: یہ بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو ہدایت سے مستفید ہوتے ہیں یا یہ معنی بھی ہو

[1] ۲ بقرۃ: ۱۸۵

سکتے ہیں: ہدایت تو سب کے لیے ہے لیکن بشارت صرف مؤمنین کے لیے۔

الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ۝۳

۳۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

تفسیر آیات

قرآن ہمیشہ ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر فرماتا ہے۔ یہاں عمل صالح کی جگہ نماز اور زکوۃ کا ذکر فرمایا کہ اعمال صالحہ کے اولین مصداق نماز اور زکوۃ ہیں۔ ساتھ اس بات کی بھی وضاحت ہو جائے کہ قرآن کی بشارت صرف ایمان کے دعویٰ سے نہیں ملتی، جب تک اس کے ثبوت کے لیے نماز و زکوۃ جیسے گواہ موجود نہ ہوں۔

وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ: اگر اعمال صالحہ کے ساتھ آخرت پر ایمان نہیں ہے یہ اعمال حبط ہو جاتے ہیں جیسا کہ:

وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآءِ الۡاٰخِرَۃِ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ ...[1]

اور جنہوں نے ہماری آیات اور آخرت کی پیشی کی تکذیب کی ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ زَیَّنَّا لَہُمۡ اَعۡمَالَہُمۡ فَہُمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ۝۴

۴۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یقیناً ان کے لیے ہم نے ان کے افعال خوشنما بنا دیے ہیں پس وہ سرگرداں پھرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ عقیدہ آخرت، دنیوی زندگی کو معقولیت اور خواہشات کو لگام دیتا ہے جب کہ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے لیے یہی زندگی سب کچھ ہے اور انہیں کسی جوابدہی کا خوف نہیں ہے۔ اس لیے ان کی خواہشات کو لگام نہیں لگتی، جس کے نتیجے میں ان سے اطمینان و سکون سلب ہو جاتا ہے: فَہُمۡ یَعۡمَہُوۡنَ۔

۲۔ زَیَّنَّا لَہُمۡ اَعۡمَالَہُمۡ: ان کے اعمال ہم نے خوشنما بنا دیے۔ آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے زندگی کی تمام رعنائیاں دنیاوی خواہشات میں مجتمع اور منحصر ہو جاتی ہیں۔ مؤمن کے لیے دنیا کی زندگی وسیلہ

---

[1] ۷ اعراف: ۱۴۷

آخرت ہے جب کہ منکر کے لیے دنیا کی زندگی خود مقصد ہے۔ لہٰذا دنیا پرستی پر مبنی ان کے اعمال کا ان کے لیے خوشنما ہونا قدرتی بات ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ وَ ہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ہُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ﴿۵﴾

۵۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں ہوں گے۔

۳۔ منکرین قیامت جو خسارہ اٹھانے والے ہیں اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ چونکہ جب یوم آخرت آ جائے گا تو منکر کو علم ہو گا کہ میں کسی وقتی مسئلے میں نہیں ابدی زندگی کے مسئلے میں خسارے میں ہوں: ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ ﴿﴾ [۱]

اہم نکات

۱۔ سب سے بڑا خسارہ، آخرت کی زندگی کا خسارہ ہے۔

وَ اِنَّکَ لَتُلَقَّی الۡقُرۡاٰنَ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ عَلِیۡمٍ ﴿۶﴾ الثلثۃ

۶۔ اور (اے رسول) یہ قرآن آپ کو یقیناً ایک حکیم، دانا کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔

تفسیر آیات

ابتدائے بعثت میں حضور ﷺ کو جن حوصلہ شکن مشکلات کا سامنا تھا ان کے تناظر میں اس آیت کی تلاوت کی جائے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے:

یہ قرآن ایک حکیم و علیم ذات کے پاس سے آپ کو عطا کیا جا رہا ہے اور آپ کو مشکلات کا سامنا کرنے کا جو حکم دیا ہے، یہ حکم دینے والے میں حکمت کا فقدان ہے اور نہ علم کی کمی ہے۔

لَتُلَقَّی الۡقُرۡاٰنَ: تلقی کوئی چیز وصول کرنے کو کہتے ہیں۔ القاء کسی بات کا ذہن میں ڈال دینا، تعلیم دینا۔ اسی سے تلقین ہے: اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ۔ [۲]

یہ لفظ اس صورت کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ وصول اور عطا کرنے کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو۔ چنانچہ ارسال ایصال اور انزال میں واسطہ ہو نہ ہو، دونوں صورتوں کے لیے ہے۔

---

[۱] ۲۲ حج: ۱۱۔ (ترجمہ) یہی کھلا نقصان ہے۔ [۲] ۷۳ مزمل: ۵۔ عنقریب آپ پر ہم ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں۔

مِنۡ لَّدُنۡ: یہ لفظ عِنۡد کے معنوں میں ہے یعنی پاس سے۔ اس میں واسطہ کی نفی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ وحی، قلب رسول پر اللہ کی طرف سے براہ راست نازل ہوتی ہے اور جبرائیل امین واسطہ یا حائل نہیں ہیں۔ صرف آواز کی طرح کا ایک ذریعہ ہیں۔

اس کے بعد ذکر ہونے والے قرآنی قصے اس وحی کی عملی صورت کا بیانا ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قرآن خدائے حکیم و دانا کی طرف سے رسول کے لیے ایک عطیہ ہے۔

اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِاَہۡلِہٖۤ اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ اَوۡ اٰتِیۡکُمۡ بِشِہَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۷﴾

۷۔ (اس وقت کا ذکر کرو) جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا: میں نے ایک آگ دیکھی ہے، میں جلد ہی اس میں سے کوئی خبر لے کر تمہارے پاس آتا ہوں یا انگارا سلگا کر تمہارے پاس لاتا ہوں تاکہ تم تاپو۔

تشریح کلمات

شھاب: (ش ہ ب) الشھاب کے معنی شعلہ کے ہیں۔

قَبَسٍ: (ق ب س) آگ کا شعلہ یا اس کی چنگاری جو شعلے سے لی جائے۔

اٰنَسۡتُ: (ا ن س) الْاُنس کے معنی کسی چیز سے اُنس پانا یا دیکھنا کے ہیں۔

تفسیر آیات

مدین میں چند سال گزارنے کے بعد مصر واپس جاتے ہوئے صحرائے سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ واقعہ پیش آیا۔

۱۔ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِاَہۡلِہٖۤ: حضرت موسیٰ علیہ السلام افراد خاندان کے ساتھ تھے۔ اس لیے جمع کا صیغہ سَاٰتِیۡکُمۡ استعمال فرمایا۔

۲۔ اٰنَسۡتُ نَارًا: میں نے آگ دیکھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نظر آئی ہے۔ ہم نے پہلے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام سے رابطہ عام بشری حواس کے ذریعہ نہیں فرماتا بلکہ ان تمام حواس سے بالاتر ذریعہ سے رابطہ فرماتا ہے جو دوسروں کے لیے قابل درک نہیں ہوتا۔ نہ دوسروں کو نظر آتا ہے، نہ سنائی دیتا ہے۔

٣۔ سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ: اس سے ظاہر ہوتا ہے رات کی تاریکی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا راستہ بھول گئے تھے مگر منزل پر پہنچ گئے تھے۔ یعنی نبوت کی منزل پر۔

٤۔ بِشِہَابٍ قَبَسٍ: موسم بھی سردیوں کا تھا۔ تاپنے کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔

فَلَمَّا جَآءَہَا نُوۡدِیَ اَنۡۢ بُوۡرِکَ مَنۡ فِی النَّارِ وَ مَنۡ حَوۡلَہَا ؕ وَ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸﴾

٨۔ جب موسیٰ آگ کے پاس پہنچے تو ندا دی گئی: بابرکت ہو وہ (جس کا جلوہ) آگ کے اندر ہے اور (بابرکت ہو) وہ جو اس کے پاس ہے اور پاکیزہ ہے سارے جہاں کا پروردگار اللہ۔

تفسیر آیات

١۔ اَنۡۢ بُوۡرِکَ مَنۡ فِی النَّارِ: حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچ جاتے ہیں تو ندا آتی ہے: بابرکت ہو وہ جو آگ میں ہے۔ جس کی تجلی آگ میں ہے۔ وہ نہ خود آگ میں ہے، نہ آگ کے گرد و پیش میں۔ وہ کسی مکان میں نہیں ہو سکتا۔

٢۔ وَ مَنۡ حَوۡلَہَا: اور بابرکت ہے وہ جو آگ کے گرد و پیش میں ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام، وہ ذات جو ندا دے رہی ہے اور وہ جو یہ ندا سن رہا ہے، دونوں بابرکت ہیں۔ البتہ اللہ بذات خود بابرکت ہے اور موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے بابرکت ہو گئے۔ پہلے برکت دینے اور لینے والے کی بات ہو گئی۔ چونکہ جب اللہ تعالیٰ انسانوں کی سعادت کے لیے کسی نبی کو مبعوث اور ہدایت کے لیے کسی کتاب و شریعت کو نازل فرماتا ہے تو اللہ مقام خیر و برکت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۱﴾ [1]

بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل فرمایا تاکہ وہ سارے جہاں والوں کے لیے انتباہ کرنے والا ہو۔

سُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: اس جملے سے اللہ کے جسم و جسمانیات سے پاک ہونے کی وضاحت فرمائی۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے درخت میں حلول کیا یا درخت کو اپنا مستقر بنایا ہو یا اس کا وجود روشنی کی شکل میں کسی حاسہ بصر میں سمویا گیا ہو۔ ان تمام مخلوقات کی صفات سے پاک ذات ہے۔

یٰمُوۡسٰۤی اِنَّہٗۤ اَنَا اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ

٩۔ اے موسیٰ! یقیناً میں ہی غالب آنے والا، حکمت

---

[1] ٢٥ فرقان: ١

الۡحَکِیۡمُ ۙ﴿۹﴾ والا اللہ ہوں۔

تفسیر آیات

تمہیدی کلمات کے بعد اصل وحی اور توحید کا تعارف شروع ہو جاتا ہے کہ میں اللہ ہوں اور دو اوصاف: عزیز و حکیم کا مالک ہوں۔ عزیز یعنی بالادست غالب آنے والا اور حکمت کا مالک ہوں۔ کسی طاقت سے دبنے اور حقائق سے دور والے کی نہیں، خدائے عزیز و حکیم کی یہ آواز ہے۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء علیہم السلام کا مبعوث ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور برکات کا ایک اہم مظہر ہے۔

وَ اَلۡقِ عَصَاکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰہَا تَہۡتَزُّ کَاَنَّہَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدۡبِرًا وَّ لَمۡ یُعَقِّبۡ ؕ یٰمُوۡسٰی لَا تَخَفۡ ۟ اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور آپ اپنا عصا پھینک دیں، جب موسیٰ نے دیکھا کہ عصا سانپ کی طرح جنبش میں آ گیا ہے پیٹھ پھیر کر پلٹے اور پیچھے مڑ کر (بھی) نہ دیکھا (ندا آئی) اے موسیٰ! ڈریے نہیں، بے شک میرے حضور مرسلین ڈرا نہیں کرتے۔

اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًۢا بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ البتہ جس نے ظلم کا ارتکاب کیا ہو پھر برائی کے بعد اسے نیکی میں بدل دیا ہو تو یقیناً میں بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہوں۔

تشریح کلمات

جَآنٌّ: (ج ن ن) چھوٹے سانپ کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

سورہ طٰہٰ آیت بیس (۲۰) میں اس مطلب کی تشریح ہو گئی کہ عصا کا سانپ بن جانا معجزہ ہے اور معجزہ عام طبیعیاتی قوانین کے مطابق نہیں ہوا کرتے۔

۱۔ کَاَنَّہَا جَآنٌّ: گویا یہ چھوٹا سانپ ہے۔ یعنی جنبش اور حرکت کی تیزی میں چھوٹے سانپ کی طرح تھا۔ لہٰذا یہ تعبیر دوسری آیات میں موجود تعبیر کے ساتھ متصادم نہیں جن میں کبھی ثُعبان سے کہا جو بڑے اژدھے کو کہتے ہیں۔ کبھی حیۃ سانپ کہا ہے۔ بعض اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ عصا پہلی مرتبہ چھوٹے

سانپ کی شکل میں آیا تھا اور فرعون کے دربار میں اژدھے کی شکل میں آیا تھا۔

۲۔ وَّلّٰی مُدۡبِرًا: پیٹھ پھیر کر پلٹ گئے۔ یہ خوف ایک قدرتی امر تھا جس کی تشریح سورہ طٰہ میں ہو گئی ہے۔

۳۔ لَا تَخَفۡ: ''خوف نہ کرو'' فراہمی امن کے اظہار کے لیے ہے۔ چنانچہ سورۃ القصص آیت ۳۱ میں آئے گا جہاں فرمایا: وَلَا تَخَفۡ ۟ اِنَّکَ مِنَ الۡاٰمِنِیۡنَ۔

۴۔ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ: پیغمبروں کو اللہ کی بارگاہ میں جو قرب حاصل ہے اس کے تحت امن حاصل رہے گا۔ موسیٰ علیہ السلام کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ آپؑ اللہ کی بارگاہ میں ہیں۔ جو اللہ کی بارگاہ میں ہوتا ہے وہ ڈرا نہیں کرتا۔

۵۔ اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ: خوف اسے لاحق ہونا چاہیے جو اپنے نفس اور دوسروں پر ظلم کر کے میری بارگاہ میں آئے۔ ایسے ظالم کو میری عدالت سے خوف ہونا چاہیے۔

۶۔ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًا: حتیٰ کہ جس نے ظلم کیا ہے اس کے لیے بھی چارہ کار موجود ہے کہ وہ میری بارگاہ میں اطمینان سے آئے۔ وہ چارہ کار یہ ہے کہ وہ اپنے ظلم کو نیکی سے بدل دے تو میں اس کے گناہ کو بخش دوں گا۔ ظلم کو نیکی سے بدلنے کی دو صورتیں متصور ہیں: ایک یہ کہ توبہ کر لے۔ دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ظلم کو ترک کر کے اس کی جگہ نیکیاں کرنا شروع کرے تو اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ...[1] نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں جیسے شرک چھوڑ ایمان لے آئے تو ظلم نیکی میں بدل جاتا ہے۔

وَ اَدۡخِلۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ ۟ فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ قَوۡمِہٖ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور اپنا ہاتھ تو اپنے گریبان میں ڈالیے بغیر کسی عیب کے چمکتا ہوا نکلے گا، یہ ان نو نشانیوں میں سے ہے جنہیں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف (آپ کو جانا ہے) بے شک وہ بڑے فاسق لوگ ہیں۔

تشریح کلمات

جَیۡبِکَ: (ج ی ب) جیب گریبان کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دوسرا معجزہ ید بیضاء چمکتا ہاتھ ہے۔ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ یہ چمک عیب کی وجہ سے نہیں

[1] ۱۱ ہود: ۱۱۴

ہے۔عیب معجزہ نہیں، نقص ہوتا ہے۔اس جملے سے توریت کی رد منظور ہے جو کہتی ہے: یہ چمک برص کی بیماری کی وجہ سے تھی۔

فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ: عصا اور ید بیضاء، ان نو معجزات میں سے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے:

i۔عصا کا اژدہا بن جانا۔

ii۔ ید بیضاء۔

iii۔ جادوگروں کو شکست دینا۔

iv۔طوفان۔

v۔ٹڈی دل سے فصلوں کی تباہی۔

vi۔سرسریوں کی آفت،غلوں کی نابودی۔

vii۔مینڈک۔ دریائے نیل سے اتنی مقدار میں ان کی نسل بڑھی کہ ان کا گھروں میں زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

viii۔خون۔ دریائے نیل کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا۔

ix۔قحط سالی۔

اہم نکات

۱۔ عناد میں آنے والے کافر معجزوں سے ایمان نہیں لاتے۔

فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰیٰتُنَا مُبۡصِرَۃً قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۳﴾

۱۳۔جب ہماری نشانیاں نمایاں ہو کر ان کے پاس آئیں تو انہوں نے کہا: یہ تو صریح جادو ہے۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نمایاں سے نمایاں تر ہونے کے باجود وہ ایمان نہیں لائے۔

تمام انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں یہ بات اپنی جگہ واضح ہے کہ جن لوگوں نے ایمان لانا ہوتا ہے وہ انبیاء کے ساتھ آنے والے ابتدائی معجزے پر ایمان لے آتے ہیں چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام شروع ہی میں اپنی حقانیت کے لیے معجزہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد جن لوگوں نے انکار کیا ان کے سامنے جتنے بھی معجزے رکھے گئے، ایمان نہیں لائے۔فرعون اور فرعونیوں کی مثال سامنے ہے۔

اہم نکات

۱۔ لوگ معجزے کے مطالبہ ایمان کے لیے نہیں، بہانہ جوئی کے لیے کرتے ہیں۔

وَجَحَدُوۡا بِہَا وَ اسۡتَیۡقَنَتۡہَاۤ اَنۡفُسُہُمۡ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۴﴾ ع

۱۴۔ وہ ان نشانیوں کے منکر ہوئے حالانکہ ان کے دلوں کو یقین آ گیا تھا، ایسا انہوں نے ظلم اور غرور کی وجہ سے کیا، پس اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

تشریح کلمات

جَحَدُوۡا: (ج ح د) جحد دل میں قبول، زبان سے انکار یا دل میں انکار، زبان سے قبول کرنے کو کہتے ہیں۔ (راغب)

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو معجزے انبیاء علیہم السلام کو دیے جاتے ہیں ان میں کسی قسم کا نقص نہیں ہوتا کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت پر پوری طرح دلیل نہ بنیں اور شک و شبہ کے لیے کوئی گنجائش چھوڑ دیں۔

وہ ان معجزات کو قلباً تسلیم کر لینے کے باوجود ایمان نہیں لاتے۔ اس کے دو محرکات ہیں:

i۔ ظُلۡمًا: ایک عناد اور دشمنی کی بنیاد پر جسے قرآن نے ظلم سے تعبیر کیا ہے۔

ii۔ وَّ عُلُوًّا: دوسرا محرک ان کا احساس برتری اور تکبر ہے۔ کہتے ہیں: اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا ...[1] کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔ مکہ کے کفار کہتے تھے: کیا ہم عبداللہ کے یتیم کی بالادستی قبول کریں؟

اہم نکات

۱۔ ایمان نہ لانا، دلیل میں نقص کی وجہ سے نہیں، عناد و تکبر کی وجہ سے ہے۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا ۚ وَ قَالَا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّنۡ عِبَادِہِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور بتحقیق ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا اور ان دونوں نے کہا: ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عنایت فرمائی۔

[1] ۲۳ مؤمنون: ۴۷

تفسیر آیات

۱۔ حضرت داود و سلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے علم کا ایک خاص مقام عنایت فرمایا۔ مفسرین اس علم کے تعین کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ آیت میں مطلق رکھا ہے جس کا اطلاق ہر قسم کے علم پر ہوتا ہے۔ اگر علم پر الف لام ہوتا تو سوال پیدا ہوتا کہ کس علم کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ فَضَّلَنَا: یہ تفضیل ان دو ہستیوں کو بہت سی باتوں میں ملی ہے۔ چنانچہ داؤد علیہ السلام کو پہاڑوں اور پرندوں کی تسخیر اور بادشاہت کا مقام بھی دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جنات، وحشیوں، پرندوں اور ہوا کو مسخر کیا اور پرندوں کی بولی کی بھی تعلیم دی۔

وَوَرِثَ سُلَيۡمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمۡنَا مَنۡطِقَ الطَّيۡرِ وَاُوۡتِيۡنَا مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡفَضۡلُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۶﴾	۱۶۔ اور سلیمان داؤد کے وارث بنے اور بولے: اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی کی تعلیم دی گئی ہے اور ہمیں سب طرح کی چیزیں عنایت ہوئی ہیں، بے شک یہ تو ایک نمایاں فضل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَوَرِثَ سُلَيۡمٰنُ دَاوٗدَ: حضرت سلیمان، حضرت داود علیہما السلام کے وارث بنے۔ کس چیز کے وارث بنے؟

ہمارا موقف یہ ہے کہ وہ مال و حکومت کے وارث بنے کیونکہ باپ کی وفات پر اس کا مال اولاد کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن علم و نبوت میں ایسا نہیں ہے کہ باپ کا انتقال ہوتے ہی باپ کا علم اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔ اسی طرح نبوت بھی ہے۔ چنانچہ باپ عالم ہوتا ہے، بیٹا جاہل۔ نبوت میں بھی ایسا ہے۔ باپ نبی ہیں، بیٹا نہیں۔

حتیٰ اگر باپ بیٹا دونوں نبی ہیں تو بھی بیٹے کی نبوت اللہ کی طرف سے ہے، باپ کی طرف سے نہیں۔ البتہ باپ کے بعد مسند نبوت پر فائز ہونے کی صورت میں مجازاً وارث کہتے ہیں۔

لہٰذا یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ میراث کا اطلاق مال پر حقیقتاً ہوتا ہے، علم و نبوت پر مجازاً۔ جیسے اِنَّ الۡعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الۡاَنۡبِيَاءِ۔[1] علماء انبیاء کے وارث ہیں، میں علماء کو وارث کہا ہے۔

آیت میں وَوَرِثَ سُلَيۡمٰنُ دَاوٗدَ اطلاق ہے جو مالی وراثت پر حقیقتاً صادق آتا ہے۔ البتہ مال

[1] الکافی ۱: ۳۲

کے علاوہ علم و نبوت اس میں شامل ہونے پر دلیل کی ضرورت ہے۔ اگر اطلاق مقصود نہ ہوتا تو مفعول دوم کا ذکر ہوتا۔ مثلاً وَوَرِثَ سُلَیۡمٰنُ دَاوٗدَ علماً ہوتا۔

فخر الدین رازی سیاق آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ وراثت سے مراد صرف مال نہیں ہو سکتا اس کی چند وجوہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اگر کوئی مال و حکومت دونوں کے وارث ہونے کا قائل ہو جائے تو آیت کے سیاق پر مبنی وجوہات کی بنا پر نہیں، حدیث کے ظاہری معنی کی بنا پر رد کیا جا سکتا ہے۔

فخر الدین رازی کو اعتراف ہے کہ آیت کے حقیقی مصداق سے ہاتھ اٹھانے کے لیے حدیث کا سہارا لینا پڑے گا۔

پس معلوم ہوا وَرِثَ کے حقیقی معنی مالی وراثت ہے اور حدیث اس حقیقی معنی کے مقابلے میں ہے۔ پس یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن سے انبیاء علیہم السلام کی مالی وراثت ثابت ہے۔ بات صرف حدیث کی رہ جاتی ہے۔ ذیل میں ہم حدیث پر گفتگو کرتے ہیں:

i۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آیہ وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ (اپنے قریبی ترین رشتہ داروں کی تنبیہ کرو) کے تحت خصوصی طور پر واجب ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے لیے حلال و حرام بیان کریں۔

تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی کو نہیں بتایا کہ آپ کو میری میراث نہیں ملے گی؟ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو علی الاعلان بتاتے ہیں:

فاطمة بضعة منی یوذینی ما یوذیھا۔[1] فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جو فاطمہ کو اذیت پہنچائے اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم اپنی اولاد تک نہیں پہنچایا؟ یا جناب سیدہ (س) نے اپنے بابا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کر کے میراث کا مطالبہ کیا؟ آپ ان دونوں باتوں میں سے کس بات کو اختیار کریں گے؟

ہم پر یہ سوال نہیں آتا چونکہ ہم یہ موقف رکھتے ہیں کہ ایسا کوئی حکم ہے ہی نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے وارث نہیں ہوتے بلکہ ہم تو قرآنی تصریحات کے مطابق اس بات کے قائل ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد اپنے آباء و اجداد کی وارث بنتی ہے۔

البتہ آپ ہم سے یہ سوال کر سکتے ہیں: اس حدیث کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا نورث ما ترکناہ صدقۃ۔

اس حدیث کے بارے میں ہم یہ موقف اختیار کرتے ہیں:

---

[1] بحار ۲۳: ۲۳۴

ii۔ رسولؐ کے فرمان کا مفہوم یہ ہے: جو چیز ہم بطور صدقہ چھوڑ جاتے ہیں اس کا ہم کسی کو وارث نہیں بناتے، نہ یہ کہ جو چھوڑ جاتے ہیں وہ سب صدقہ ہوتا ہے۔ لفظ: صدقۃٌ نہیں، صدقۃً ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صدقات بہت تھے جو بطور فئی آپؐ کی ملکیت میں آئے تھے۔

چنانچہ امام شمس الدین سرخسی نے اپنی شہرہ آفاق فقہی کتاب المبسوط جلد ۱۲ صفحہ ۳۶ باب الوقف طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت میں حدیث کے یہی معنی کیے ہیں۔ ان کی عبارت ملاحظہ ہو:

واستدل بعض مشایخنا رحمهم اللّٰه تعالیٰ بقوله علیه الصلوة و السلام: انا معاشر الانبیاء لا نورث ماترکناه صدقة۔ فقالوا معناه ما ترکناه صدقة لا یورث ذلك۔ ولیس المراد ان اموال الانبیاء علیهم الصلوة والسلام لاتورث وقد قال اللّٰه تعالیٰ: وَوَرِثَ سُلَيۡمٰنُ دَاوٗدَ۔ فَهَبۡ لِيۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ . . فحاشا ان یتکلم رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله و سلم بخلاف المنزل فعلی هذا التاویل فی الحدیث بیان ان لزوم الوقف من الانبیاء علیهم الصلوة والسلام خاصة بناء علی ان الوعد منهم کالعهد من غیرهم۔

ہمارے بعض اساتذہ نے وقف کے ناقابل تنسیخ ہونے پر رسول اللہ علیه الصلوة والسلام کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے: انا معاشر الانبیاء لا نورث ماترکناه صدقة۔ وہ کہتے ہیں اس حدیث کا مطلب یہ ہے: جو مال بطور صدقہ (وقف) ہم نے چھوڑا ہے وہ ارث میں نہیں جاتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں انبیاء کے اموال کے وارث نہیں ہوتے جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَوَرِثَ سُلَيۡمٰنُ دَاوٗدَ نیز فرمایا: فَهَبۡ لِيۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ پس ممکن نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قرآن کے خلاف بات کریں۔ حدیث کی اس توجیہ سے معلوم ہوا انبیاء علیهم الصلوة والسلام کی طرف سے وقف ناقابل تنسیخ ہونا ایک خصوصی بات ہے۔ کیونکہ انبیاء علیهم الصلواة والسلام کے وعدے دوسرے لوگوں کے معاہدے کی طرح ہیں۔

ابن عطیہ اندلسی اپنی تفسیر المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز ۴: ۲۵۳ میں اور قرطبی اپنی مشہور تفسیر الجامع لاحکام القرآن ۱۴: ۱۶۴ میں اس حدیث کے یہ معنی کرتے ہیں:

و یحتمل قوله علیه السلام "انا معشر الانبیاء لا نورث" ان یرید ان ذلك من فعل الانبیاء و سیرتهم و ان کان فیهم من ورث ماله کزکریا علی اشهر الاقوال۔

اور احتمال ہے انا معشر الانبیاء لا نورث کا مطلب یہ ہو کہ وارث نہ بنانا انبیاء کا اپنا عمل اور سیرت ہے ورنہ ان میں ایسے انبیاء ہیں جن کے مال کے وارث تھے جیسے زکریا۔ جیسا کہ مشہور قول ہے۔

ابن عطیہ اپنی تفسیر المحرر الوجیز ۴:۵ سورہ مریم آیت ۵ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

ویحتمل قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انا معشر الانبیاء لا نورث ان لایرید بہ العموم بل انہ غالب امرھم۔

احتمال ہے نبی ﷺ کا فرمان انا معشر الانبیاء لا نورث سے مراد غالب انبیاء کا معاملہ ہو، تمام انبیاء نہ ہوں۔

قاضی عیاض نے اپنی کتاب الالماع صفحہ نمبر ا میں صدقۃ کی بالفتح اور بالرفع دونوں صورتیں ممکن ہے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

iii۔ خود حضرت ابوبکر نے اس حدیث کے خلاف عمل کیا۔ جب عباسؓ اور حضرت علی علیہ السلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمامہ اور تلوار کی میراث میں اختلاف ہوا تو ان چیزوں کو بطور میراث حضرت علی کے حق میں فیصلہ دیا۔[1] اگر صدقہ ہوتا تو حضرت علی علیہ السلام کے لیے صدقہ حرام تھا۔

iv۔ مصر کے نامور عالم محمود ابوریہ کہتے ہیں:

حضرت ابوبکر کو چاہیے تھا کہ ترکہ رسول میں سے کچھ بطور عطیہ حضرت زہرا کو دے دیتے جیسا کہ انہوں نے زبیر بن عوام اور محمدبن مسلمہ کو ترکہ رسول میں سے دے دیا تھا۔

v۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے یہی فدک حضرت عثمان نے مروان کو دے دیا۔ مروان راندہ رسول، جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں شہر بدر کیا تھا وہ آج ترکہ رسولؐ پر قابض ہے اور بنت رسول محروم۔

vi۔ حضرت عمر نے اس حدیث کے خلاف عمل کیا جب خیبر کی جائیدادوں کو ازواج نبی میں تقسیم کیا۔[2] کہتے ہیں ازواج کے حق مہر میں دیا تھا۔ جب کہ قرآن میں صراحت کے ساتھ بیان ہے کہ ازواج کا مہر رسول اللہؐ نے زندگی میں ادا کیا تھا۔ ملاحظہ ہو:

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَکَ اَزۡوَاجَکَ الّٰتِیۡۤ اٰتَیۡتَ اُجُوۡرَہُنَّ ...[3]

اے نبی! ہم نے آپ کے لیے آپ کی وہ بیویاں حلال کی ہیں جن کے مہر آپ نے دے دیے ہیں۔

اس جگہ ابن ابی الحدید نے نہج البلاغۃ کی شرح میں حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان بلی کانت فی ایدینا فدك کے ذیل میں لکھا ہے:

میں نے علی بن الفارقی، جو المدرسۃ الغربیۃ بغداد کے مدرس تھے، سے پوچھا: کیا فاطمہ سچی تھیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: پھر حضرت ابوبکر نے فدک ان کو کیوں نہیں دیا؟ مسکرا کر کہا: اگر آج فدک دے دیتے تو کل فاطمہ اپنے شوہر کی خلافت کا بھی دعویٰ کرتیں تو ابوبکر کو اپنے مقام سے ہٹا دیتیں۔

---

[1] رسالۃ حول حدیث نحن معاشر الانبیاء ص ۲۳ [2] جامع الاصول [3] ۳۳ احزاب: ۵۰

ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

بات اپنی جگہ درست ہے اگرچہ اسے بطور مذاق کہا گیا ہے۔

یہاں وہ احادیث قابل توجہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف مقامات پر حضرت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کو ناراض کرنے، اذیت دینے کے بارے میں خصوصی طور پر ارشاد فرمائیں جو صحاح و غیر صحاح، شیعہ اور سنی مصادر میں موجود ہیں۔

فاطمة بضعة منی		فمن اغضبها اغضبنی
فاطمة بضعة منی	یرینی ما ارابها	یوذینی ما یوذیها
فاطمة بضعة منی		من آذاها فقد آذانی
فاطمة بضعة منی	من سرها فقد سرنی	ومن ساء ها فقد ساء نی
فاطمة بضعة منی		یسخطنی ما اسخطها

۲۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمۡنَا مَنۡطِقَ الطَّیۡرِ: یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ پرندے، حیوانات اور حشرات باہمی افہام و تفہیم کے لیے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ مختلف حالات میں مختلف آواز نکالتے اور مختلف انداز اختیار کرتے ہیں اور اللہ کا یہ فرمان بھی سب کے سامنے ہے:

وَ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ بِجَنَاحَیۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُکُمۡ ...[1]　　اور زمین پر چلنے والے تمام جانور اور ہوا میں اپنے دو پروں سے اڑنے والے سارے پرندے بس تمہاری طرح کی امتیں ہیں۔

یہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسان آوازوں میں سے ایک خاص ارتعاش کو سن سکتا ہے جو ۱۶ سے ۳۲ ہزار فی سیکنڈ کے درمیان ہو۔ اس سے کم یا زیادہ کو انسان نہیں سن سکتا۔

لہٰذا اللہ کے وہ رسول جو وحی کی لطیف آواز کو سن سکتے ہیں ان کے لیے پرندوں کی بولی سن اور سمجھ لینا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ ۱۵۰

جو لوگ اس کی تاویل و توجیہ کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو فاعل مختار، ہر شیء پر قادر نہیں سمجھتے بلکہ وہ اللہ کو طبیعیاتی اشیاء کی طرح لیتے ہیں جن سے ان سے مربوط چیزیں صادر ہو سکتی ہیں۔ جیسے پانی سے رطوبت اور آگ سے حرارت اور بس

۳۔ وَ اُوۡتِیۡنَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ: ہمیں ہر چیز عنایت ہو گئی ہے۔ کُلِّ شَیۡءٍ ہر چیز سے مراد ہر وہ نعمت ہے جس سے دنیا میں انسان بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ خود حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا تھی:

وَهَبۡ لِیۡ مُلۡکًا لَّا یَنۡۢبَغِیۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِیۡ ...[2]　　مجھے ایسی بادشاہی عطا کر جو میرے بعد کسی کے شایان شان نہ ہو۔

---

[1] ۶ انعام: ۳۸　[2] ۳۸ ص ۳۵

اہم نکات

۱۔ میراث کا قانون عام ہے۔ جہاں اس عام کی شمولیت نہیں ہوتی ہے اس کا شریعت میں ذکر ہے۔ جیسے کفر، قتل، عاق۔ ان میں نبوت کا ذکر نہیں ہے۔

۲۔ پرندے مربوط بولی بولتے ہیں جسے انبیاء علیہم السلام کی حسّ لطیف درک کر سکتی ہے۔

وَ حُشِرَ لِسُلَیۡمٰنَ جُنُوۡدُہٗ مِنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ وَ الطَّیۡرِ فَہُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور سلیمان کے لیے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے اور ان کی جماعت بندی کی جاتی تھی۔

تشریح کلمات

یُوۡزَعُوۡنَ: (و ز ع) وزعته کے معنی کسی آدمی کو کسی کام سے روک دینا۔ لشکر کو روکنے کا مطلب نظم و ضبط میں رکھنا۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہ بادشاہی عنایت ہوئی تھی جو کسی نبی کو نہیں ہوئی۔ ان کی بادشاہی کا دائرہ انسان کے علاوہ جنات اور پرندوں تک وسیع تھا۔ چنانچہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ بیان فرمایا کہ ان کے لشکر میں جنات، انسان اور پرندے جمع تھے۔ اس صراحت کے خلاف تاویل کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے کہ ظاہری معنی مراد لینا ممکن نہ ہو۔ جیسے:

وَّ یَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَ الۡاِکۡرَامِ ؕ[1]

اور صرف آپ کے صاحب عزت و جلال رب کی ذات باقی رہنے والی ہے۔

وَجۡہُ: سے ذات مراد لینا اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ صرف چہرہ باقی رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جن سے پہاڑی قبائل اور پرندوں سے گھوڑ سواروں کے دستے مراد لینا کسی محاورہ اور کسی استعارہ و مجاز کے دائرے میں نہیں آتا۔

۲۔ فَہُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ: عسکری تنظیم کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لشکر مختلف النوع ہونے کے باوجود اس میں جماعت بندی تھی۔ افراتفری کا شکار نہ تھا۔

---

[1] ۵۵ رحمن: ۲۷

اہم نکات

۱۔ جنات اور پرندے انسان کے لیے مسخر ہو سکتے ہیں۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوۡا عَلٰی وَادِ النَّمۡلِ ۙ قَالَتۡ نَمۡلَۃٌ یّٰۤاَیُّہَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰکِنَکُمۡ ۚ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ سُلَیۡمٰنُ وَ جُنُوۡدُہٗ ۙ وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں کچل نہ ڈالے اور انہیں پتہ بھی نہ چلے۔

تشریح کلمات

یَحۡطِمَنَّکُمۡ: (ح ط م) الحطم کے اصل معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں۔ پھر کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنے اور روندنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوۡا عَلٰی وَادِ النَّمۡلِ: النَّمۡلِ سے مراد چیونٹی ہے۔ چنانچہ معنی حقیقی پر محمول کرنے کے لیے کسی قرینہ و دلیل کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی آیت میں معنی حقیقی یعنی چیونٹی ہی مراد لینے پر قرینہ بلکہ دلیل موجود ہے۔ پہلا قرینہ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ ہے کہ کہیں سلیمان تمہیں روند نہ ڈالیں۔ دوسرا قرینہ وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ہے چونکہ اگر النَّمۡلِ سے مراد قبیلہ نمل کے افراد ہوتے جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں تو ان کا کچلے جانے کا سلیمان علیہ السلام لشکر کو پتہ ہی نہ چلے، کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر یہ گھروں میں گھسنے سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ لہٰذا یقینی طور پر النمل سے مراد چیونٹی ہے۔ مَسٰکِنَکُمۡ سے مراد چیونٹیوں کے بل ہیں۔

۲۔ قَالَتۡ نَمۡلَۃٌ: ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں کچل نہ ڈالے۔ اس سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

i۔ چیونٹیوں میں رہنما اور رعیت کا نظام ہے جو احکام جاری کرتے ہیں اور ان پر عمل ہوتا ہے۔

ii۔ چیونٹیوں میں افہام و تفہیم کا نظام موجود ہے۔

iii۔ چیونٹی انسانوں کو ان کی خصوصیتوں کے ساتھ جانتی ہیں۔ چنانچہ اس چیونٹی نے سلیمان کا لشکر کہہ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی شخصیت کا اظہار کیا کہ یہ لشکر ان کا ہے۔ وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ کہہ کر انسان اور چیونٹی کی نسبت کا اظہار کیا کہ چیونٹی کچل جائے تو انسانوں کو پتہ نہیں چلتا۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنۡ قَوۡلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰىهُ وَ اَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِكَ فِیۡ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔اس کی باتیں سن کر سلیمان ہنستے ہوئے مسکرائے اور کہنے لگے: پروردگارا! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر بجا لاؤں جن سے تو نے مجھے اور میرے والدین کو نوازا ہے اور یہ کہ میں ایسا صالح عمل انجام دوں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل فرما۔

تشریح کلمات

تبسم: (ب س م) مسکرانا۔ ہنسی سے کمتر یعنی ہونٹ کشادہ کرنا۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آیا ہے: بل کَانَ ضَحِکُہُ التَّبَسُّمَ الْحَدِیثَ۔[1] آپ کا مسکرانا ہی پوری ہنسی تھی۔

الضحك: (ض ح ك) ہنسنا۔ تبسم سے بیشتر، دانتوں کے نظر آنے تک ہونٹ کا کھلنا۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی ہنسی تبسم یعنی مسکرانے تک محدود ہوتی ہے۔ اس کے بعد قہقہہ آتا ہے۔ لہٰذا فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا ہنستے ہوئے تبسم کیا۔ یہی ہو سکتا ہے کہ تبسم ہی انبیاء علیہم السلام کی ہنسی ہے اس لیے تبسم کو ضحك کہا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنۡ قَوۡلِهَا: اس میں صراحت موجود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی باتیں سمجھ لیں۔ کیسے سمجھ لیں؟ اس کی کیفیت ہم نہیں سمجھ سکتے۔ پہلے آیت ۱۶ کے ذیل میں بتایا کہ پیغمبران جو وحی الٰہی کی لطیف آواز سن لیتے ہیں پرندوں اور حیوانوں کی زبان سمجھنا ان کے لیے نہ مشکل ہے، نہ باعث تعجب۔ چونکہ پیغمبر اسے عام عادی قوت سماعت سے نہیں سنتے۔ وہ وحی، اس قوت ادراک سے سنتے ہیں جو اس عام بشری قوت سماعت کے ماورا میں ہے۔

۲۔ وَ قَالَ اَوۡزِعۡنِیۡۤ: عرض کیا: پروردگار مجھے یہ توفیق دے کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عنایت کی ہیں۔ اس جملے میں درج ذیل نکات قابل توجہ ہیں:

الف: شکر ادا کرنے کی توفیق خود اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کسی نعمت پر شکر کرتا ہے تو یہ بھی اللہ کی ایک نعمت ہے جس پر اسے شکر کرنا چاہیے۔ اگر شکر ادا ہو گیا تو یہ بھی اللہ کی ایک نعمت ہے جس پر شکر کرنا چاہیے۔ اس طرح یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ کے شکر کا حق ادا نہیں

[1] وسائل الشیعۃ ۱۲: ۲۰۹

ہوسکتا۔ یہاں سے ہے:

وَ مَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ...[۱]

اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے (فائدے کے) لیے شکر کرتا ہے۔

ب: وَعَلٰی وَالِدَیَّ: انسان کو ان نعمتوں کا بھی شکر ادا کرنا چاہیے جو اس کے والدین کو ملی ہیں۔ چونکہ اولاد کی قسمت والدین کی قسمت سے منسلک ہوتی ہے اور انسان کی شخصیت پر والدین کے وارثتی اور تربیتی نقوش ثبت ہوتے ہیں۔

ج: حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ کو قرآن ان بہتانوں سے پاک قرار دیتا ہے جو توریت میں ان پر عائد کیے گئے ہیں۔[۲]

۳۔ وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰىہُ: عمل، صالح اس وقت ہوتا ہے جب یہ عمل موجب رضایت رب واقع ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے اقتدار و سلطنت کو رضائے رب کے حصول میں صرف کرنے کی دعا کر رہے ہیں۔

۴۔ وَاَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِکَ فِیۡ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیۡنَ: اللہ کے بعض خاص صالح بندے ہوتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام یہی دعا کرتے ہیں کہ ان صالح بندوں میں ان کا شمار ہو۔

اہم نکات

۱۔ نعمت کے بعد شکر نعمت کی توفیق بھی ایک نعمت ہے۔

۲۔ والدین پر اللہ کی نعمت اولاد پر نعمت ہے۔

۳۔ رضائے رب اور صالح بندوں میں شمار ہونا انبیاء علیہم السلام کی منزل ہے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّیۡرَ فَقَالَ مَالِیَ لَاۤ اَرَی الۡہُدۡہُدَ ۫ۖ اَمۡ کَانَ مِنَ الۡغَآئِبِیۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ سلیمان نے پرندوں کا معائنہ کیا تو کہا: کیا بات ہے کہ مجھے ہدہد نظر نہیں آ رہا؟ کیا وہ غائب ہو گیا ہے؟

لَاُعَذِّبَنَّہٗ عَذَابًا شَدِیۡدًا اَوۡ لَاَاذۡبَحَنَّہٗۤ اَوۡ لَیَاۡتِیَنِّیۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ میں اسے ضرور سخت ترین سزا دوں گا یا میں اسے ذبح کر دوں گا مگر یہ کہ میرے پاس کوئی واضح عذر پیش کرے۔

---

[۱] ۳۱ لقمان: ۱۲

[۲] توریت میں آیا ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ اوریا کی بیوی تھیں۔ حضرت داود علیہ السلام نے معاذ اللہ اس کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کیے اور اوریا کو حیلہ و بہانے سے قتل کرایا۔ اس کی بیوی کو اپنی زوجات میں شامل کیا۔ سلیمان علیہ السلام اس عورت سے پیدا ہوئے۔

تشریح کلمات

وَتَفَقَّدَ : (ف ق د) کسی غائب چیز کا طلب کرنا۔ معائنہ کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَتَفَقَّدَ الطَّیۡرَ : حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کا معائنہ کیا تو ہد ہد نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ دنیا بھر کے تمام پرندے ان کی زیر سلطنت ہوں بلکہ ہوسکتا ہے زیر زمین پانی کا کھوج لگانے کے لیے ہد ہد سے کام لیا جاتا ہو چونکہ کہا جاتا ہے کہ ہدہد کو زیر زمین پانی نظر آتا ہے۔ وہ کسی جگہ اپنا پر ہلائے وہاں زیر زمین پانی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی بات روایات میں بھی آئی ہے:

ان الھدھد یری الماء فی بطن الارض کمایری احدکم الدھن فی القارورۃ۔[1]
ہد ہد زیر زمین پانی کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح تم شیشی میں تیل دیکھ لیتے ہو۔

لَا تَقْتُلُوا الْھُدْھُدَ فَاِنَّہٗ کَانَ دَلِیْلَ سُلَیْمَانَ عَلَی الْمَاءِ وَکَانَ یَعْرِفُ قُرْبَ الْمَاءِ وَ بُعْدَہٗ۔[2]
ہدہد کو نہ مارو یہ سلیمان کے لیے پانی کا کھوج لگانے والا تھا۔ یہ جانتا ہے پانی دور ہے یا نزدیک۔

۲۔ اَمۡ کَانَ مِنَ الۡغَآئِبِیۡنَ : کیا یہ (ہدہد) غائب ہونے والوں میں ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ پرندوں کی غیب وحضور پر مشتمل عسکری تنظیم تھی اور ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے غائب ہونا خلاف ورزی تھی۔

۳۔ لَاُعَذِّبَنَّہٗ عَذَابًا شَدِیۡدًا : ہدہد کا غیر حاضر رہنا خلاف ورزی تھی۔ ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے حاضر ہونا پڑے گا ورنہ لَاُعَذِّبَنَّہٗ ''میں اسے سزا دوں گا'' نہ فرماتے۔

۴۔ اَوۡ لَیَاۡتِیَنِّیۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ : یا وہ اپنے غیب ہونے پر کوئی معقول دلیل پیش کرے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرندہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیر نگین ایک مکلّف فرد کی طرح ڈیوٹی دیتا تھا جسے خلاف ورزی پر سزا دی جاتی ہے اور معقول عذر پیش کرنے پر سزا معاف ہو جاتی ہے؟

مجمع البیان نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے:

پرندے کا بولنا اور اسے اپنے زمانے میں مکلّف بنانا حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ اس لیے اسے سزا دینا درست ہوا۔

کیا حیوانات مکلّف ہیں؟ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ ۔[3] اور کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسۡبِیۡحَہٗ ۔[4] سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حد تک ذمے داری ہے اور اس ذمے داری کی نوعیت ہمارے لیے مبہم ہے مگر اس ذمے داری پر ثواب وعقاب کا مترتب ہونا معلوم نہیں ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۶۱: ۲۱ [2] مستدرک الوسائل ۱۶: ۱۸۲ [3] ۱۷ اسراء: ۴۴ [4] ۲۴ نور: ۴۱

فَمَکَثَ غَیۡرَ بَعِیۡدٍ فَقَالَ اَحَطۡتُّ بِمَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ وَ جِئۡتُکَ مِنۡ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیۡنٍ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس نے (حاضر ہو کر) کہا: مجھے اس چیز کا علم ہوا ہے جو آپ کو معلوم نہیں اور ملک سبا سے آپ کے لیے ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔

تشریح کلمات

سَبَاٍ : یمن کے ایک شہر کا نام ہے جو اس زمانے میں دارالخلافہ تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَمَکَثَ غَیۡرَ بَعِیۡدٍ: زیادہ دیر نہیں گزری۔ مکث کا تعلق حضرت سلیمان علیہ السلام سے ہے۔

۲۔ اَحَطۡتُّ بِمَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ: مجھے اس چیز کا علم ہوا ہے جس کا آپ کو علم نہیں۔

اس جملے میں دو نکتے قابل توجہ ہیں: ایک یہ کہ اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی عصمت پر ایک قسم کا طنز معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اس چیز کا علم ہوا جو آپؑ کے علم میں نہیں ہے لیکن یہ طنز نہیں ہے کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایسا کوئی دعویٰ نہیں رکھتے تھے کہ میں دنیا کے ہر کونے پر علمی احاطہ رکھتا ہوں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے ضروری نہیں کہ ہر چیز ان کے احاطہ علمی میں آ جائے۔

اِنِّیۡ وَجَدۡتُّ امۡرَاَۃً تَمۡلِکُہُمۡ وَ اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ لَہَا عَرۡشٌ عَظِیۡمٌ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ میں نے ایک عورت دیکھی جو ان پر حکمران ہے اور اسے ہر قسم کی چیزیں دی گئی ہیں اور اس کا عظیم الشان تخت ہے۔

تفسیر آیات

ہدہد کے ان کلمات سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی مملکت کی محدودیت کا عندیہ مل جاتا ہے۔ اول یہ کہ اگر سلیمان علیہ السلام کے بارے میں وَ اُوۡتِیۡنَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ ہے ہمیں ہر چیز عنایت ہو گئی تو اس خاتون کے لیے وَ اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ اسے ہر قسم کی چیزیں دی گئی ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کا تخت عظیم ہے۔ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ آپؑ کے تخت سے اس عورت کا تخت عظیم ہے۔

وَجَدۡتُّہَا وَ قَوۡمَہَا یَسۡجُدُوۡنَ لِلشَّمۡسِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ زَیَّنَ

۲۴۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے

لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٢٤﴾	ان کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا رکھے ہیں اور اس طرح ان کے لیے راہ خدا کو مسدود کر دیا ہے، پس وہ ہدایت نہیں پاتے۔

تفسیر آیات

۱۔ يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ : قدیم تاریخ سے قرآن کی تائید ہوتی ہے کہ قوم سبا کا مذہب آفتاب پرستی کا مذہب تھا۔

ہدہد کا یہ کہنا کہ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر آفتاب پرستی کرتے ہیں، ایک عاقل اور تربیت شدہ موحد بلکہ تعلیم یافتہ انسان کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ : شیطان نے ان کے اعمال خوشنما بنا دیے ہیں۔ اگرچہ سیاق کلام کے مطابق یہ بھی ہدہد کا کلام ہے لیکن مضمون کلام پیغمبرانہ ہے لہٰذا یہ جملہ اللہ کا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ اس پر قرینہ بن سکتا ہے۔

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ﴿٢٥﴾	۲۵۔ کیا وہ اللہ کے لیے سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور وہ تمہارے پوشیدہ اور ظاہری اعمال کو جانتا ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ: وہ ذات لائق سجدہ ہے جو آسمانوں اور زمین میں پوشیدہ چیزوں کو نکالتی ہے۔ اصل میں یخرج المخبوء ہے۔ برائے تاکید مزید مصدر الْخَبْءَ کی طرف نسبت دی ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پردہ غیب سے نکالا ہے جو عدم کے پردوں میں پوشیدہ تھی۔

قرآن مجید کی متعدد اور مختلف تعبیرات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عبادت اس ذات کی ہو سکتی ہے جو خالق اور رب ہو۔ اس آیت سے بھی یہی حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ سجدہ اس ذات کے لیے ہو سکتا ہے جس نے اس کائنات کو پردہ غیب سے نکالا ہے اور ہر آن، ہر لحظہ پردہ غیب سے عالم شہود پر لانے کا عمل جاری ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۔[1]

---

[1] ۵۵ رحمٰن: ۲۹

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ﴿٢٦﴾　　۲۶۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ: کلام سابق کا نتیجہ ہے کہ جب اس کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والی ذات ہی قابل پرستش ہے تو وہ ذات اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں ہو سکتا۔

۲۔ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ: کسی کی عبادت جب خالقیت اور ربوبیت کی بنیاد پر ہی ہو سکتی ہے تو ربوبیت کی منزل پر فائز ذات بھی اسی اللہ کی ہے جو کہ عرش عظیم کا رب ہے۔

عرش کے بارے میں ہم نے یہ موقف واضح طور پر اختیار کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مقام تدبیر کا نام ہے جو ربوبیت اور مالکیت کا لازمہ ہے۔ وہ اس کائنات کے عظیم تدبیری نظام کا مالک ہے۔

قَالَ سَنَنۡظُرُ اَصَدَقۡتَ اَمۡ کُنۡتَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۲۷﴾　　۲۷۔ سلیمان نے کہا: ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کیا تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے۔

قَالَ: یہ کہنے والے حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں کہ ہدہد کے اس انکشاف پر نفی اور اثبات کا موقف اختیار کرنے سے پہلے اس پر تحقیق کرنے کا ارادہ کیا۔

اِذۡہَبۡ بِّکِتٰبِیۡ ہٰذَا فَاَلۡقِہۡ اِلَیۡہِمۡ ثُمَّ تَوَلَّ عَنۡہُمۡ فَانۡظُرۡ مَاذَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۲۸﴾　　۲۸۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کے پاس ڈال دے پھر ان سے ہٹ جا اور دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ ہدایات ایسی ہیں جو کسی سمجھدار شخص کے لیے دی جا سکتی ہیں۔ خط ڈالنے کے بعد ہٹ جائے اور پھر اس کے ردعمل پر نظر رکھے۔ واضح رہے نظر رکھنے والا ان کے سارے ردعمل کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ردعمل عام فہم بھی ہو سکتا ہے اور پیچیدہ بھی۔ اس قسم کی سفارتی ذمہ داریاں تو آج کل اعلیٰ تعلیم یافتہ، تجربہ کار لوگوں کے لیے ممکن ہیں۔ حضرت سلیمان کے معجزے کے علاوہ اس کی اور توجیہ نہیں ملتی۔

اہم نکات

۱۔ دو عظیم مملکتوں کے درمیان سفارت کاری کی ذمے داریاں ایک ہدہد انجام دے، انبیاء علیہم السلام کا

معجزہ ہے۔

قَالَتۡ یٰۤاَیُّہَا الۡمَلَؤُا اِنِّیۡۤ اُلۡقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیۡمٌ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ ملکہ نے کہا: اے دربار والو! میری طرف ایک محترم خط ڈالا گیا ہے۔

تفسیر آیات

ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط کو ملکہ سبا کے ہاں ڈال دیتا ہے۔ ملکہ اس خط کو ایک قابل احترام خط قرار دیتی ہے۔ اس خط کو کتاب کریم قابل احترام مضمون کے اعتبار سے کہا ہوگا جس کا آغاز ایسے معبود کے نام سے ہوتا ہے جو رحمان رحیم ہے۔ التبیان میں کریم کے معنی بیان فرماتے ہیں:

انه حقيق بان يوصل الخير العظيم من جهته۔ کریم اسے کہتے ہیں جس سے خیر عظیم ملنے کی توقع ہو۔

ورنہ اس قسم کے مراسلوں کی ابتدا یوں بھی ہو سکتی تھی:

بسم اللّٰه الجبار القهار۔ خدائے قہار و جبار کے نام سے۔

نیز ہو سکتا ہے یہ خط حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہونے کی وجہ سے کَرِیۡمٌ کہا ہو چونکہ قوم سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کی عظمت کو جانتی تھی۔ چنانچہ کہا تھا:

اُوۡتِیۡنَا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِہَا وَ کُنَّا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۰﴾ [1] ہمیں اس سے پہلے معلوم ہو چکا ہے اور ہم فرمانبردار ہو چکے ہیں۔

یہ خط اپنے انداز ارسال، انداز کلام اور مضمون کے اعتبار سے غیر معمولی حیثیت کا حامل تھا۔

انداز ارسال: ایک پرندے کے ذریعے۔ کلام بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے شروع ہوتا ہے جو اس معاشرے کی ثقافت سے بالکل مختلف اور ناآشنا انداز کلام ہے۔ مضمون میں ایک دعوت ہے اور یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ ایک قانونی حکومت کے مقابلے میں ایک باطل نظام کو بڑائی اور سرکشی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اِنَّہٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَ اِنَّہٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور وہ یہ ہے: خدائے رحمٰن رحیم کے نام سے

---

[1] ۲۷ نمل: ۴۲

تفسیر آیات

اس آیت میں چند ایک نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ : قرآن کا حصہ ہے۔ جب یہ قرآنی آیت ہے تو سورہ ہائے قرآن کی ابتدا میں بھی قرآن کی آیت شمار ہوتی ہے جیسا کہ شیعہ امامیہ کا موقف ہے۔ قرآن میں بہت سی آیات مکرر ہیں اور سب قرآن ہیں۔

۲۔ بِسۡمِ اللّٰہِ : مکمل لکھنا چاہیے۔ مختصر کر کے لکھنا خلاف سنت انبیاء ہے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر مشرکین بسمك اللّٰھم لکھنا چاہتے تھے جب کہ رسول اللہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی جگہ صرف بسمه تعالیٰ لکھنا خلاف سنت ہے۔

۳۔ کہتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلی مرتبہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے ابتدا کی ہے۔ یہ عربی ترکیب عبرانی زبان کی نقل بالمعنی ہو سکتی ہے۔ چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی۔

۴۔ ملکہ سبا نے پہلی بار یہ کلمات سنے: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ آفتاب پرست ہونے کی وجہ سے یہ کلمات اس کے لیے ایک جدید اصطلاح تھی۔ اس اللہ کے نام سے جو نہایت رحمت کا مالک اور مہربان ہے۔ ایک مہربان اللہ کے ماننے والے مہربان ہی ہوں گے۔

اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَ اۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾ ع ۲/۱۷

۳۱۔ تم میرے مقابلے میں بڑائی مت کرو اور فرمانبردار ہو کر میرے پاس چلے آؤ۔

تفسیر آیات

یہ اس خط کا پورا مضمون ہے کہ تم میرے مقابلے میں بڑائی مت کرو اور فرمان بردار ہو کر میرے پاس چلے آؤ۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مضمون یہی ہوتا ہے کہ اپنی بالادستی چھوڑ کر امن و سلامتی میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خطوط میں یہی تحریر فرماتے تھے: اسلم تسلم۔ اسلام میں داخل ہو جاؤ، سلامتی پاؤ گے۔

قَالَتۡ یٰۤاَیُّہَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِیۡ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۚ مَا کُنۡتُ قَاطِعَۃً اَمۡرًا حَتّٰی تَشۡہَدُوۡنِ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ ملکہ نے کہا: اے اہل دربار! میرے اس معاملے میں مجھے رائے دو، میں تمہاری غیر موجودگی میں کسی معاملے کا فیصلہ نہیں کیا کرتی۔

تفسیر آیات

ا۔ اَفۡتُوۡنِیۡ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ: مجھے رائے دو اس امر کے بارے میں جو مجھے پیش آیا ہے۔ یہ امر ملک پر بیرونی حملے کا خطرہ ہے۔ اپنے زمانے کی سب سے بڑی طاقت کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے۔

۲۔ مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ: تمہاری غیر موجودگی میں کسی معاملے کا فیصلہ نہیں کیا کرتی۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملکہ فہم و فراست کی مالکہ تھی۔ نظام استبدادی ہونے کے باوجود طریقہ کار شورائی و جمہوری تھا۔ اس عمل کے مستحسن ہونے کی وجہ سے قرآن نے اس بات کا ذکر کیا۔ کسی غیر معمولی واقعہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اہل رائے لوگوں سے مشورہ لینا ہر عاقل کے نزدیک ایک مستحسن عمل ہے اور یہ بات کسی مذہب و شریعت سے مربوط نہیں ہے۔

اہم نکات

ا۔ دوسروں کی عقلی قوت سے فائدہ اٹھانا عقلی قوت کی علامت ہے۔

قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّةٍ وَّ اُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ ۙ وَّ الۡاَمۡرُ اِلَيۡكِ فَانۡظُرِىۡ مَاذَا تَاۡمُرِيۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ انہوں نے کہا: ہم طاقتور اور شدید جنگجو ہیں تاہم فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم کرنا چاہیے۔

تفسیر آیات

ا۔ نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّةٍ وَّ اُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ: درباریوں نے متوقع جنگ کے لیے ضرورت کی دو اہم چیزوں کا ذکر کیا۔ وہ عسکری طاقت و قوت اور حربی مہارت ہیں۔ درباریوں نے کہا: یہ دونوں چیزیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ عسکری طاقت اُولُوۡا قُوَّةٍ اور حربی مہارت اُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ کے ذریعے ہم اس حملے کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

درباریوں کا ایک مزاج ہوا کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی رعونت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حقائق کے ادراک میں رعونت و اقتدار حائل رہتے ہیں اور بادشاہ بھی عموماً درباریوں کے اس مزاج کا شکار رہتے ہیں لیکن یہاں درباری مرد اور بادشاہ عورت ہے۔ عورت عموماً جنگجو نہیں، امن پسند ہوتی ہے۔ درباری اس بات سے واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے درباری مزاج کے مطابق اپنی رعونت کا بھی مظاہرہ کیا اور ساتھ ملکہ، عورت کے امن پسند مزاج کا بھی لحاظ رکھا اور کہا: وَّ الۡاَمۡرُ اِلَيۡكِ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ورنہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ درباری بادشاہ سے درخواست کریں کہ ہمیں اجازت دیں کہ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

قَالَتۡ اِنَّ الۡمُلُوۡکَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَۃً اَفۡسَدُوۡہَا وَ جَعَلُوۡۤا اَعِزَّۃَ اَہۡلِہَاۤ اَذِلَّۃً ۚ وَ کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ ملکہ نے کہا: بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کرتے ہیں اور اس کے عزت داروں کو ذلیل کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی اسی طرح کریں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الۡمُلُوۡکَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَۃً اَفۡسَدُوۡہَا: ملکہ نے جنگ کی مذمت کرنا شروع کی اور جنگی نتائج سے درباریوں کو آگاہ کیا کہ جنگ اپنے ہمراہ تباہی لاتی ہے اور معاشرے میں افراتفری پھیلتی ہے۔ عزت دار ذلیل اور ذلیل عزت دار بن جاتے ہیں چونکہ وہ اپنے مفتوحہ علاقے کی ہر چیز کو روند ڈالتے ہیں۔ اس مفتوحہ علاقے کے مزاحمتی عناصر کو خصوصی طور پر نشانہ بناتے ہیں۔ وہ حکومتی و سلطنتی عناصر ہوں گے۔

۲۔ وَ جَعَلُوۡۤا اَعِزَّۃَ اَہۡلِہَاۤ اَذِلَّۃً: فاتح قوم جب فتح کے نشے میں چور ہوتی ہے تو اپنے زیر نگیں قوم کی حرمت و عزت کو لوٹ لیتی ہے۔ البتہ اسلامی فاتحوں کے بارے میں گوستف لوبون اپنی کتاب حضارۃ العرب میں لکھتے ہیں:

چشم تاریخ نے عربوں کی طرح کسی انصاف پسند اور رحمدل فاتح کو نہیں دیکھا۔

وَ اِنِّیۡ مُرۡسِلَۃٌ اِلَیۡہِمۡ بِہَدِیَّۃٍ فَنٰظِرَۃٌۢ بِمَ یَرۡجِعُ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور میں ان کی طرف ایک ہدیہ بھیج دیتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ ایلچی کیا (جواب) لے کر واپس آتے ہیں۔

تفسیر آیات

ملکہ نے ایک ایسی تدبیر اور آزمائش سوچی جس سے اس بادشاہ کے مزاج، نفسیات اور ترجیحات کا اندازہ ہو جائے، اس کے کے مطابق اگلا قدم اٹھایا جائے۔

وہ یہ کہ اس بادشاہ کو ایک ہدیہ پیش کر کے دیکھتے ہیں اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ اس ہدیہ کو دیکھ کر نرم پڑ جاتا ہے تو اس لالچی بادشاہ کو اسی راہ سے رام کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ اسے ٹھکرا دیتا ہے تو اس اصول پرست بادشاہ کی اصول پرستی اور اس کے پیچھے کارفرما عقائد کا مطالعہ کرنا ہو گا۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَیۡمٰنَ قَالَ

۳۶۔ پس جب وہ سلیمان کے پاس پہنچا تو انہوں

اَتُمِدُّوۡنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَاۤ اٰتٰىنِ‍َٔ اللّٰہُ خَیۡرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىکُمۡ ۚ بَلۡ اَنۡتُمۡ بِھَدِیَّتِکُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ ﴿۳۶﴾

نے کہا: کیا تم مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ اللہ نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو اس نے تمہیں دے رکھا ہے جب کہ تمہیں اپنے ہدیے پر بڑا ناز ہے۔

تفسیر آیات

چنانچہ ہدیہ کو دیکھ حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے انتہائی بے اعتنائی برتی اور اس ہدیہ کو ناچیز اور حقیر قرار دیا اس دولت کے مقابلے میں جس سے خود حضرت سلیمان مالا مال ہیں۔ وہ دولت علم و نبوت اور تسخیر جن و انس جیسی منفرد سلطنت ہے۔

بَلۡ اَنۡتُمۡ بِھَدِیَّتِکُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ: فرمایا: تمہاری تو یہ حیثیت ہے کہ تم اس ہدیہ پر ناز کرتے ہو جو نہایت حقیر ہے۔ اس حقیر مال کی خاطر اپنی دعوت الی اللہ کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام جب ان کے تحائف بڑی حقارت کے ساتھ مسترد کیے تو ملکہ سبا پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ مسئلہ کشور کشائی اور مال و دولت کا نہیں ہے۔

اِرۡجِعۡ اِلَیۡھِمۡ فَلَنَاۡتِیَنَّھُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَھُمۡ بِھَا وَ لَنُخۡرِجَنَّھُمۡ مِّنۡھَاۤ اَذِلَّۃً وَّ ھُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ (اے ایلچی) تو انہیں کی طرف واپس پلٹ جا، ہم ان کے پاس ایسے لشکر لے کر ضرور آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے اور ہم انہیں وہاں سے ذلت کے ساتھ ضرور نکال دیں گے اور وہ خوار بھی ہوں گے۔

تشریح کلمات

قِبَلَ: (ق ب ل) طاقت کو کہتے ہیں۔ لا قبل لھم یعنی لاطاقۃ لھم۔

تفسیر آیات

اہل سبا کی طرف لوٹ جاؤ اور ان سے کہو: ہم ایسے لشکر کے ساتھ ملک سبا میں داخل ہونے والے ہیں جس کے مقابلے کی ان میں طاقت نہ ہو گی۔

وَ لَنُخۡرِجَنَّھُمۡ مِّنۡھَاۤ: ان کی سرزمین سے ہم ان کو بے دخل کریں گے۔ صرف بے دخلی نہ ہو گی بلکہ اَذِلَّۃً رام و مسخر ہو کر اپنی سرزمین چھوڑیں گے۔ صاغرین خوار ہو کر، یہ خواری اسیری کی شکل میں ہو سکتی

ہے۔ واضح رہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا سے دو باتوں کا مطالبہ کیا تھا:

۱۔ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ: میرے مقابلے میں بڑائی کا مظاہرہ نہ کرو۔

۲۔ وَ اۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ: فرماں بردار ہو کر میرے پاس چلے آؤ۔

حق کی دعوت قبول کرو۔ حق کا مقابلہ کرنا ترک کرو۔ ملکہ نے ان دو باتوں میں سے کسی ایک کا مثبت یا منفی جواب دینے کی جگہ تیسرا راستہ اختیار کیا اور ہدیہ پیش کیا۔ اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس نے ہماری دعوت کو قابل اعتناء سمجھنے کی جگہ مال و دولت کا لالچ دینے پر آ گئی ہے۔ لہٰذا یہ تہدید آمیز موقف اختیار کرنا پڑا۔

قَالَ یٰۤاَیُّہَا الۡمَلَؤُا اَیُّکُمۡ یَاۡتِیۡنِیۡ بِعَرۡشِہَا قَبۡلَ اَنۡ یَّاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ سلیمان نے کہا: اے اہل دربار! تم میں سے کون ہے جو ملکہ کا تخت میرے پاس لے آئے قبل اس کے کہ وہ فرمانبردار ہو کر میرے پاس آئیں؟

تفسیر آیات

ہدیہ رد ہونے پر ملکہ نے بات سمجھ لی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ماننے تسلیم ہونے میں ہی سلامتی ہے۔ اس فیصلے سے آگاہ ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے چاہا کہ اس جگہ خداداد طاقت وقوت کا مظاہرہ ہونا چاہیے اور اپنی نبوت پر ایک معجزہ پیش کرنا چاہیے تاکہ ان پر حجت پوری ہو جائے۔ چنانچہ اپنے درباریوں سے فرمایا ملکہ کے یہاں حاضر ہونے سے قبل اس کا تخت میرے پاس کون حاضر کر سکتا ہے؟

بظاہر یہ تخت ملک سبا سے اروشلم تک لانے کی بات اس وقت ہو رہی ہے جب ملکہ اروشلم شہر میں داخل ہونے والی ہے۔ لہٰذا کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ یہ تخت ملکہ کے ہمراہ ہو سکتا ہے چونکہ ملکہ کو خدشہ تھا کہ سلیمان علیہ السلام اس کے لیے تخت فراہم نہیں کریں گے، خلاف ظاہر ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ سوال بتاتا ہے کہ ان کے درباریوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو اس قسم کے کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

قَالَ عِفۡرِیۡتٌ مِّنَ الۡجِنِّ اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِکَ ۚ وَ اِنِّیۡ عَلَیۡہِ لَقَوِیٌّ اَمِیۡنٌ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ جنوں میں سے ایک عیار نے کہا: میں اسے آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں اور میں یہ کام انجام دینے کی طاقت رکھتا ہوں، امین بھی ہوں۔

تشریح کلمات

عِفۡرِیۡتٌ : اصل میں سرکش جن کو کہتے ہیں۔ پھر نا قابل تسخیر طاقتور کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔

تفسیر آیات

بیت المقدس سے ملک سبا کا فاصلہ ڈیڑھ ہزار میل سے کم نہ تھا۔ کسی بشری طاقت کے لیے ممکن نہ تھا کہ چند گھنٹوں میں یہ کام انجام دے لہٰذا جن سے مراد کوئی بشر نہیں جیسا کہ بعض عقلیت پسند لکھتے ہیں۔

قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِکَ : آپ کے اپنی جگہ سے اٹھنے سے پہلے تخت پیش کروں گا۔ سلیمان دربار میں چند گھنٹے ہی بیٹھ سکتے ہیں۔

وَ اِنِّیۡ عَلَیۡہِ لَقَوِیٌّ : اس جن کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہ کام میں کر سکتا ہوں۔ اس کام کے لیے مطلوبہ قوت میرے پاس ہے۔

اَمِیۡنٌ : جن ہونے کے اعتبار سے ایک سوال جو ذہن میں آتا ہے اس کا بھی اس جن نے جواب دے دیا کہ میں امین ہوں۔ اس تخت کو بغیر کسی تصرف کے آپ کے پاس پہنچا دوں گا۔

قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسۡتَقِرًّا عِنۡدَہٗ قَالَ ہٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ ۟ۖ لِیَبۡلُوَنِیۡۤ ءَاَشۡکُرُ اَمۡ اَکۡفُرُ ؕ وَ مَنۡ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیۡ غَنِیٌّ کَرِیۡمٌ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ جس کے پاس کتاب میں سے کچھ علم تھا وہ کہنے لگا: میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں، جب سلیمان نے تخت کو اپنے پاس نصب شدہ دیکھا تو کہا: یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفران اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ خود اپنے فائدے کے لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا پروردگار یقیناً بے نیاز اور صاحب کرم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ : جس کے پاس کتاب میں سے کچھ علم تھا وہ کہنے لگا: میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے حاضر کر دیتا ہوں۔

یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ پلک جھپکنے کی دیر میں کیسے ممکن ہوا کہ کوئی ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے سے

یہ تخت حاضر کر دے۔ ایسا تو آج کے جوہری دور میں بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ سوال اللہ کی کن فیکونی طاقت کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ سائنسی نقطہ نظر سے بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ بقول آئن سٹائن: انسان کو مکان و زمان میں محدود سمجھنا ایک مفروضہ ہے نیز نظریہ اضافت کے لحاظ سے زمان ہر جگہ یکساں نہیں ہے۔ روشنی کی رفتار سے سفر کرنے والے کے دس منٹ ساکن لوگوں کے سینکڑوں سال کے برابر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ معراج کی بحث میں ہم نے بیان کیا ہے لیکن ہم اس مسئلے کی توجیہ نظریہ اضافت وغیرہ سے نہیں کرتے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سائنسی مفروضے کے تحت بھی ایسا عمل ناممکن نہیں ہے۔

قرآن کی صراحت موجود ہے کہ یہ قدرت جس شخص کے پاس تھی اس کی بنیاد علم تھا اور اس علم کا ماخذ الکتاب ہے اگرچہ ہمیں اس علم اور الکتاب کی نوعیت کا علم نہیں ہے تاہم اس آیت میں علم کی طاقت کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ اس شخص نے اپنے دعویٰ کو جامہ عمل پہناتے ہوئے چشم زدن میں اس عظیم تخت کو حاضر کر دیا۔

انسان کو اب تک دور سے آواز اور تصاویر چشم زدن میں حاضر کرنے کا طریقہ آ گیا ہے۔ اجسام حاضر کرنے کا طریقہ ابھی نہیں آیا۔ آیت سے معلوم ہوا اس قسم کا علم بھی موجود ہے جس سے اجسام کو دور سے چشم زدن میں حاضر کرنا ممکن ہے۔

۲۔ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسۡتَقِرًّا عِنۡدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ: جب تخت حاضر پایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس علمی کارنامے کو اللہ کا فضل قرار دیا، تخت کے حصول کو نہیں چونکہ مال و دولت کو تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلے ہی بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ لہٰذا یہ فَضۡلِ رَبِّیۡ، مما اتانی اللّٰہ ہے جو علم و کمال کی دولت ہے۔ مما اتاکم نہیں ہے جس پر دوسروں کو ناز ہے۔

۳۔ لِیَبۡلُوَنِیۡۤ ءَاَشۡكُرُ اَمۡ اَكۡفُرُ: تا کہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفران نعمت۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔ انہیں اچھی طرح علم ہے کہ اس قسم کے کمالات کی نعمت اللہ کی طرف سے ایک امتحان ہوتا ہے۔ وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَیۡرِ ۔۔۔۔[1] اللہ شر اور خیر دونوں کے ذریعہ آزماتا ہے۔

۴۔ وَمَنۡ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ: جو شکر کرتا ہے وہ خود اپنے فائدے کے لیے شکر کرتا ہے چونکہ شکر کرنا خود اپنی جگہ اہم قدروں میں سے ایک قدر ہے۔ اس قدر کا مالک ہونا خود اپنی جگہ ایک کمال ہے۔ ثانیاً شکر کا نتیجہ خود شکر کرنے والے کے حق میں ہوتا ہے۔ جس کا شکر کیا جاتا ہے اس کے حق میں صرف اتنا ہے کہ وہ اس شکر پر خوش ہوگا۔ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّكُمۡ ۔۔۔۔[2] اگر تم شکر کرو تو میں تمہارے لیے اور زیادہ عنایت کروں گا۔ لہٰذا شکر نعمت باعث مزید نعمت ہے: اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ ۔۔۔[3]

[1] ۲۱ انبیاء: ۳۵ [2] ۱۴ ابراہیم: ۷ [3] ۱۷ اسراء: ۷ (ترجمہ) اگر تم نے نیکی کی تو اپنے لیے نیکی کی۔

اہم نکات

۱۔ علم کی طاقت سب سے بڑی ہے۔
۲۔ انسان ابھی علم انبیاء کو سمجھنے سے قاصر ہے۔
۳۔ نعمتیں آزمائش ہیں۔شکر کے ذریعے اس میں کامیابی ممکن ہے۔
۴۔ شکر کا فائدہ خود شکر گزار کے لیے ہے۔

قَالَ نَكِّرُوۡا لَهَا عَرۡشَهَا نَنۡظُرۡ اَتَهۡتَدِیۡۤ اَمۡ تَكُوۡنُ مِنَ الَّذِیۡنَ لَا یَهۡتَدُوۡنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ سلیمان نے کہا: ملکہ کے تخت کو اس کے لیے انجانا بنادو، ہم دیکھیں کیا وہ شناخت کر لیتی ہے یا شناخت نہ کرنے والوں میں سے ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ نَكِّرُوۡا لَهَا عَرۡشَهَا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس کے تخت کو انجانا بنا دو۔ یعنی اس تخت میں کچھ تبدیلیاں لا کر اس کے رنگ وشکل اور کچھ خصوصیات کو بدل دو۔

۲۔ نَنۡظُرۡ اَتَهۡتَدِیۡۤ: ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا ملکہ اپنے تخت کو پہچان لیتی ہے۔ ممکن ہے اس عمل سے حضرت سلیمان علیہ السلام ملکہ کی فراست کا اندازہ لگانا چاہتے ہوں کہ یہ خاتون کس فہم و فراست کی مالکہ ہے۔ اسی کے مطابق اس کے ساتھ برتاؤ کیا جائے:

اِنَّ الثَّوَابَ عَلَى قَدْرِ الْعَقْلِ...[۱] ثواب عقل کے مطابق ملتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسان کو اس کی عقل و فراست کے مطابق مقام دیتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَتۡ قِیۡلَ اَهٰكَذَا عَرۡشُكِ ؕ قَالَتۡ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوۡتِیۡنَا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهَا وَ كُنَّا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ جب ملکہ حاضر ہوئی تو (اس سے) کہا گیا: کیا آپ کا تخت ایسا ہی ہے؟ ملکہ نے کہا: گویا یہ تو وہی ہے، ہمیں اس سے پہلے معلوم ہو چکا ہے اور ہم فرمانبردار ہو چکے ہیں۔

---

۱ الکافی ۱: ۱۱

تفسیر آیات

۱۔ اَهٰکَذَا عَرۡشُكِ: جب ملکہ حاضر ہوئی تو ملکہ ہی کے تخت کی طرف اشارہ کر کے پوچھا گیا: کیا آپ کا تخت اس تخت کی طرح ہے؟ سوال کا انداز بھی ایسا ہے جس میں کوئی ایسا شائبہ نہیں ہے کہ یہ وہی تخت ہے۔ مثلاً اگر یہ سوال ہوتا یہ تخت آپ کا تخت تو نہیں؟ تو کچھ اشارہ مل جاتا۔

۲۔ قَالَتۡ کَاَنَّهٗ هُوَ: جواب میں ملکہ نے کہا: گویا یہ تو وہی ہے۔ نفی اور اثبات میں جواب دینے کی جگہ ''گویا'' کہہ کر ملکہ نے اپنی عقل و فراست کا ثبوت دیا۔ یعنی جب کہا: گویا یہ تخت وہی میرا اپنا تخت ہے تو تخت میں تبدیلی کے باوجود پہچان لیا اور ساتھ محتاطانہ جواب دیا۔

۳۔ وَ اُوۡتِیۡنَا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهَا: ملکہ نے کہا: اس تخت کے یہاں حاضر کرنے کے معجزہ کے مشاہدے سے پہلے ہمیں آپؑ کی نبوت اور معجزانہ قوت و طاقت کا علم ہو گیا تھا۔

۴۔ وَ کُنَّا مُسۡلِمِیۡنَ: ہم پہلے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے فرماں بردار ہو چکے ہیں۔

وَ صَدَّهَا مَا کَانَتۡ تَّعۡبُدُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا کَانَتۡ مِنۡ قَوۡمٍ کٰفِرِیۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اور سلیمان نے اسے غیر اللہ کی پرستش سے روک دیا کیونکہ پہلے وہ کافروں میں سے تھی۔

تفسیر آیات

اس آیت کی ایک تشریح یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام ملکہ کو غیر اللہ کی عبادت سے روکا۔ اس صورت میں صد کا فاعل ضمیر سلیمان علیہ السلام کی طرف راجع ہے۔ یہی ترجمہ ہم نے اختیار کیا ہے۔

دوسری تشریح یہ ہے کہ سورج کی پرستش نے اسے ایمان باللہ سے روکا۔ سیاق کلام کے مطابق اس تشریح کے لیے تکلف کرنا پڑتا ہے۔

قِیۡلَ لَهَا ادۡخُلِی الصَّرۡحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتۡهُ حَسِبَتۡهُ لُجَّۃً وَّ کَشَفَتۡ عَنۡ سَاقَیۡهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِیۡرَ ۬ؕ قَالَتۡ رَبِّ اِنِّیۡ

۴۴۔ ملکہ سے کہا گیا: محل میں داخل ہو جائیے، جب اس نے محل کو دیکھا تو خیال کیا کہ وہاں گہرا پانی ہے اور اس نے اپنی پنڈلیاں کھول دیں، سلیمان نے کہا: یہ شیشے سے مرصع محل ہے

ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ وَ اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَیۡمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۴﴾

ملکہ نے کہا: پروردگارا! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اب میں سلیمان کے ساتھ رب العالمین اللہ پر ایمان لاتی ہوں۔

تشریح کلمات

صرح: (ص ر ح) بلند، منقش و مزین مکان۔

مُّمَرَّدٌ: (م ر د) ہموار کیا ہوا۔ صاف کیا ہو۔ مرّد بے آب گیاہ ریتلی، بے سبزہ زمین کو کہتے ہیں اور بے ریش نوجوان کو امرد کہتے ہیں۔ قَوَارِیۡرَ قارورۃ کی جمع۔ شیشہ۔

تفسیر آیات

۱۔ قِیۡلَ لَہَا ادۡخُلِی الصَّرۡحَ: ملکہ سے کہا گیا محل میں داخل ہو جائے تو ملکہ نے دیکھا سامنے گہرا پانی ہے۔ چونکہ قصر سلیمانی کا صحن شفاف شیشوں سے بنا ہوا تھا اور نیچے پانی کا تالاب تھا اس لیے دیکھنے میں پانی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ حَسِبَتۡہُ لُجَّۃً خیال کیا وہاں گہرا پانی ہے۔ اس لیے ملکہ نے اپنی پنڈلیاں کھولیں۔ جب معلوم ہوا یہ شیشہ ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی شوکت و سلطنت کو دیکھ کر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہمنگیت میں آ گئیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات اور ان کی سلطنت و حکومت کے بارے میں توریت کی روایت اور اسرائیلیات پر مبنی روایات، خرافات اور نا قابل اعتنا ہیں۔ ہم نے ان باتوں کی طرف اشارہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاہُمۡ صٰلِحًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ فَاِذَا ہُمۡ فَرِیۡقٰنِ یَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ اور ہم نے (قوم) ثمود کی طرف ان کی برادری کے صالح کو (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو تو وہ دو فریق بن کر جھگڑنے لگے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَخَاہُمۡ صٰلِحًا: حضرت صالح کو قوم ثمود کا بھائی بند اس لیے کہا گیا کہ ان کا تعلق اسی قوم سے تھا۔

۲۔ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ: تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت صرف اللہ کی بندگی اختیار کرنے پر مرکوز تھی۔

۳۔ فَاِذَا ہُمۡ فَرِیۡقٰنِ یَخۡتَصِمُوۡنَ: حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت قبول اور رد کرنے والوں پر مشتمل

ہمیشہ کی طرح دو فریق وجود میں آ گئے۔

سورۃ الاعراف آیات ۷۵۔ ۷۶ میں ان دونوں فریقوں کا ذکر آیا ہے جس میں ایمان لانے والوں کو مستضعفین، کمزور کہا ہے اور منکرین کو مستکبرین کہا ہے۔ دعوت انبیاء علیہم السلام معاشرے کا کمزور طبقہ قبول کرتا آیا ہے۔

ہم نے پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مستکبرین نے دعوت انبیاء علیہم السلام کو ہمیشہ ٹھکرایا ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں: پہلا سبب یہ ہے کہ جن کے ضمیر مادیت کے تہ در تہ پردوں کے پیچھے ہوتے ہیں ان کے ضمیر تک انبیاء علیہم السلام کی آواز پہنچ نہیں پاتی۔ دوسرا سبب دعوت انبیاء علیہم السلام ان کے مفادات کے ساتھ متصادم ہوتی ہے اس لیے تقریباً تمام سرمایہ داروں نے دعوت انبیاء علیہم السلام کو مسترد کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مادیات اور مفادات قبول حق میں رکاوٹ ہیں۔

قَالَ یٰقَوۡمِ لِمَ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبۡلَ الۡحَسَنَۃِ ۚ لَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرُوۡنَ اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ صالح نے کہا: اے میری قوم! نیکی سے پہلے برائی کے لیے کیوں عجلت کرتے ہو؟ تم اللہ سے معافی کیوں طلب نہیں کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے؟

تفسیر آیات

قوم صالح نے جب اونٹنی کو مار ڈالا تو وہ کہنے لگے:

یٰصٰلِحُ ائۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ○ [۱] اے صالح! اگر تم واقعی پیغمبر ہو تو ہمارے لیے وہ (عذاب) لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو۔

اس کے جواب میں حضرت صالح علیہ السلام فرماتے تھے: تم نیکی سے پہلے برائی کے لیے کیوں عجلت کرتے ہو۔ برائی سے مراد یہاں عذاب ہے اور حسنۃ سے مراد رحمت و مغفرت ہے۔ تم نے جس جرم کا ارتکاب کیا ہے اس کے لیے استغفار کرنی چاہیے تھی کہ اللہ کی رحمت تمہارے شامل حال ہو جائے۔ اس کی جگہ تم عذاب طلب کرتے ہو۔

---

[۱] ۷ اعراف: ۷۷

قَالُوا اطَّیَّرۡنَا بِکَ وَ بِمَنۡ مَّعَکَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تُفۡتَنُوۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ وہ کہنے لگے: تم اور تمہارے ساتھی ہمارے لیے بدشگونی کا سبب ہیں، صالح نے کہا: تمہاری بدشگونی اللہ کے پاس ہے بلکہ تم لوگ آزمائے جا رہے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوا اطَّیَّرۡنَا بِکَ: وہ بدشگونی کا سبب قرار دیتے تھے۔ عربوں کے اوہام میں سے ایک وہم یہ تھا کہ وہ پرندوں سے بدشگونی لیتے تھے۔ اس لیے وہ ہر بدشگونی کو اطَّیَّرَ کہتے تھے۔ ان کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام نے ان کے معبودوں کو مسترد کرنے کی دعوت دی تو ان کے معبود ناراض ہو گئے اور بدشگونی کا سبب فراہم ہوا۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۳۱ میں بھی بدشگونی کا ذکر ہوا ہے۔

۲۔ قَالَ طٰٓئِرُکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ: ان کے اپنے محاورے میں جواب دے رہے ہیں کہ تمہاری بدشگونی یعنی عذاب اللہ کے پاس ہے۔ جو کچھ حوادث پیش آ رہے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔

۳۔ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تُفۡتَنُوۡنَ: یہ بدشگونی نہیں ہے بلکہ جن باتوں کو تم بدشگونی سمجھ رہے ہو وہ تمہارے لیے آزمائش ہیں جن سے مؤمن و کافر، نیک اور بد میں امتیاز آ جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ بدشگونی مشرکوں کا جاہلانہ واہمہ ہے۔

وَ کَانَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ تِسۡعَۃُ رَہۡطٍ یُّفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا یُصۡلِحُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور اس شہر میں نو دھڑے باز تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح کا کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

تشریح کلمات

رَہۡطٍ: (ر ھ ط) دس آدمیوں سے کم جماعت کو رَہۡطٍ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ کَانَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ تِسۡعَۃُ رَہۡطٍ: حضرت صالح علیہ السلام کے شہر میں نو ایسے دھڑے بستے تھے جو فساد کی جڑ تھے اور یہ لوگ اس قوم کے سردار تھے۔ ناقہ صالح کے قتل میں یہی لوگ ملوث تھے۔

۲۔ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ: وہ ہمہ تن فسادی تھے جس کی صراحت اگلے جملے میں ہے۔
۳۔ وَ لَا یُصۡلِحُوۡنَ: ان کے کردار میں اصلاح کا شائبہ تک نہیں تھا۔

قَالُوۡا تَقَاسَمُوۡا بِاللّٰہِ لَنُبَیِّتَنَّہٗ وَ اَہۡلَہٗ ثُمَّ لَنَقُوۡلَنَّ لِوَلِیِّہٖ مَا شَہِدۡنَا مَہۡلِکَ اَہۡلِہٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ انہوں نے کہا: آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم رات کے وقت صالح اور ان کے گھر والوں پر ضرور شب خون ماریں گے پھر ان کے وارث سے یہی کہیں گے کہ ہم ان کے گھر والوں کی ہلاکت کے موقع پر موجود ہی نہ تھے اور ہم سچے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا تَقَاسَمُوۡا: وہ آپس میں کہنے لگے کہ قسم کھاؤ۔ آیت کے اس حصے میں تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے کہ تَقَاسَمُوۡا و قالوا قسم کھا کر کہنے لگے کہ ہم شب خون ماریں گے اور صالح اور ان کے اہل خانہ کو قتل کریں گے۔ پھر ہم کہیں گے رات کی تاریکی میں کیا معلوم کس نے قتل کیا۔ ہم نے تو تاریکی میں دیکھا بھی نہیں۔
۲۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ: وہ اس مکر و حیلہ کے ذریعے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے پر مطمئن تھے۔

وَ مَکَرُوۡا مَکۡرًا وَّ مَکَرۡنَا مَکۡرًا وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اور انہوں نے مکارانہ چال چلی تو ہم نے ایسی حکیمانہ تدبیریں کیں کہ انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

تشریح کلمات

مَکَرَ: (م ک ر) کے معنی کسی شخص کو حیلہ کے ساتھ اس کے مقصد سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اچھی اور بری تدبیر دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے اور جب بری تدبیر کے لیے لفظ مکر استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ایک لفظ کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے وَ لَا یَحِیۡقُ الۡمَکۡرُ السَّیِّیٴُ اِلَّا بِاَہۡلِہٖ ....[1] حالانکہ بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔

تفسیر آیات

کہاں ان کی تدبیر و حیلہ اور کہاں اللہ کی تدبیر۔ کہاں ان کی ناقص سوچ اور کہاں اللہ کی قدرت۔ جب یہ اللہ کی تدبیر کے زد میں آتے ہیں تو ان کو خبر بھی نہیں ہوتی اور تباہی میں گر چکے ہوتے ہیں۔

---
[1] ۳۵ فاطر: ۴۳

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ پس دیکھ لو! ان کی مکاری کا کیا انجام ہوا، ہم نے انہیں اوران کی پوری قوم کو نابود کر دیا۔

تفسیر آیات

حضرت صالح علیہ السلام کے خلاف اس قوم نے جو حیلہ اور تدبیر اپنائی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خود ہلاک اور نابود ہو گئے۔

دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ: ان کو تباہ کیا جو حضرت صالح علیہ السلام کو شہید کرنے کی تدبیر میں شامل تھے اور ساتھ ان کی قوم بھی تباہ و نابود ہو گئی چونکہ یہ سب اس جرم میں شریک تھے جو یہ لوگ کرنا چاہتے تھے اور ناقہ کو قتل کرنے کے جرم میں بھی شریک تھے۔

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ پس ان کے یہ گھر ان کے ظلم کے نتیجے میں ویران پڑے ہیں، اس میں علم رکھنے والوں کے لیے ایک نشانی ہے۔

تشریح کلمات

خَاوِيَةً: (خ و ی) الخواء کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً: وہ ایسے تباہ ہوئے کہ ان کے گھر اپنے مکینوں سے خالی ہو گئے۔

بِمَا ظَلَمُوْا اس تباہی کا سبب وہ ظلم تھا جو ان سے صادر ہوا۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ظلم کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ نسلیں تباہ اور گھر کے مکین ختم ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ: اس واقعہ میں ایک نشانی ہے۔ عبرت کی نشانی، ایک درس عبرت ہے اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے۔ جسے علم ہے کہ کون سا حادثہ کس عمل کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ عالم علل و اسباب کی گہرائی میں علم کی روشنی سے نگاہ کرنے والے اس راز کو جانتے ہیں۔

وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ اور ہم نے ایمان والوں کو نجات دی اور وہی تقویٰ والے تھے۔

تفسیر آیات

اور اہل ایمان کو ہم نے نجات دی۔ ان کو نجات دینے کے پیچھے جو سبب کارفرما تھا وہ تقویٰ تھا۔ جیسا کہ منکرین کو تباہ کرنے کے پیچھے جو سبب تھا وہ ان کا ظلم تھا۔ تقویٰ یعنی بچاؤ۔ وہ اپنے آپ کو آنے والے خطرات سے بچاتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ ظلم اور تقویٰ کے اپنے اپنے اثرات ہیں۔

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اور لوط (کا وہ وقت یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو؟ حالانکہ تم دیکھ رہے ہوتے ہو۔

تفسیر آیات

قوم لوط اعلانیہ ہم جنس بازی کا ارتکاب کرتی تھی۔ اس کے لیے وہ محفلیں جماتی اور سب کے سامنے اس شرم ناک فعل کو انجام دیتی تھی۔ اس لیے حضرت لوط علیہ السلام نے ان دونوں ناشائستہ حرکتوں کی طرف اشارہ فرمایا: ایک یہ کہ تم بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو اور دوسرا وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ اس عمل بد کو سب کی نگاہوں کے سامنے انجام دیتے ہو۔

اَئِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَہۡوَۃً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تَجۡہَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت پرستی کے لیے مردوں کا رخ کرتے ہو؟ بلکہ تم تو جاہل قوم ہو۔

تفسیر آیات

عورتوں کو چھوڑ کر شہوت پرستی کے لیے مردوں کا رخ کرنا وہ فحش ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں آیا۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ مل گیا کہ اپنی جنسی شہوت کو جائز طریقے سے پورا کرنے کے لیے جائز طریقے سے عورتوں کا رخ کرنا فحش نہیں ہے۔

بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تَجۡہَلُوۡنَ: تم ایک نادان جاہل قوم ہو۔ اپنے اس عمل بد کی برائی سے آگاہ نہیں ہو اور

اس کے انجام سے بھی آگاہ نہیں ہو۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡۤا اٰلَ لُوۡطٍ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ تو ان کی قوم کا بس یہی جواب تھا کہ وہ کہیں لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے نکال دو یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔

تفسیر آیات

حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت کو تمسخر کے ساتھ مسترد کرتے، طہارت و پاکیزگی کو عار و ننگ قرار دیتے اور یہ اعلان کرتے ہیں:

اَخۡرِجُوۡۤا اٰلَ لُوۡطٍ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ : آل لوط کو ملک بدر کرو۔ انہیں اپنے شہر سے نکال باہر کرنے کی وجہ، یہ اعلان کرتے ہیں:

اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ : یہ لوگ پاکیزگی چاہتے ہیں۔ پاکیزگی اور طہارت پسندی اس معاشرے میں عار و ننگ شمار ہوتی تھی۔

ہم اکیسویں صدی کے مغربی اور مغرب زدہ معاشروں کا مشاہدہ کرنے والوں کے لیے یہ بات باعث تعجب نہیں ہے چونکہ ان معاشروں میں وہ بات عار و ننگ شمار ہوتی ہے جو انسانی طہارت، غیرت، عزت و ناموس سے متعلق ہے۔ چنانچہ حجاب عیب شمار ہوتا ہے اور فرینڈز کے نام سے چار پانچ نامحرم مردوں کے ساتھ روابط رکھنا فخر اور عزت شمار ہوتی ہے۔

فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرۡنٰهَا مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ تو ہم نے لوط اور ان کے گھر والوں کو بچا لیا سوائے لوط کی بیوی کے، ہم نے اس کا مقدر یہ بنایا تھا کہ وہ پیچھے رہ جائے۔

تشریح کلمات

الۡغٰبِرِ : (غ ب ر) اسے کہتے ہیں جو ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد پیچھے رہ جائے۔

تفسیر آیات

قوم لوط پر نازل ہونے والے عذاب سے حضرت لوط اور ان کے گھر کے افراد کو بچا لیا۔ صرف

ان کی زوجہ نجات پانے والوں میں شامل نہ تھی۔ رسول کی زوجہ ہونے کے باوجود نجات نہیں مل سکتی چونکہ یہ عورت اس رسول کے دین پر نہ تھی۔

وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿۵۸﴾ ع ۱۴ / ۱۹

۵۸۔ اور ہم نے ان پر ایک بارش برسائی جو ان کے لیے بہت ہی بری بارش تھی جنہیں تنبیہ کی گئی تھی۔

یہ بارش پتھر کی بارش تھی۔ ممکن ہے ایک زلزلے میں زمین زوردار دھماکے کے ساتھ پھٹ گئی ہو جس سے پتھروں کی بارش ہو گئی ہو۔ جیسے آتش فشانوں کے مناظر میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔

چنانچہ سورۃ القمر آیت ۳۴ میں فرمایا:

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ حَاصِبًا... تو ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ہوا چلا دی۔

مزید تشریح سورہ ہود: ۷۷۔۸۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَ سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی ؕ آٰللّٰہُ خَیۡرٌ اَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿ؕ۵۹﴾

۵۹۔ کہدیجیے: ثنائے کامل ہے اللہ کے لیے اور سلام ہو اس کے برگزیدہ بندوں پر، کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں؟

تفسیر آیات

۱۔ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ: انبیاء علیہم السلام کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد اپنے حبیب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے فرمایا: آپ اللہ کی حمد و ستائش کریں۔ وہ لائق حمد ہے۔ جو بھی حمد و ستائش قابل تصور ہے وہ سب اللہ کے لیے ہے۔ جس کسی میں حمد و ستائش کے قابل کوئی بات ہو گی تو اس کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔

۲۔ وَ سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی: سلام ہو اللہ کے برگزیدہ بندوں پر۔ جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ یہ برگزیدہ بندے کون ہیں تو یہ آیت ہمارے سامنے آتی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ﴾ ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿ۚ﴾ [1]

بے شک اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام عالمین پر برگزیدہ فرمایا ہے۔ وہ اولاد جو ایک دوسرے کی نسل سے ہے اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

لہٰذا قرآن کی رو سے برگزیدہ بندگان، انبیاء اور اولاد انبیاء علیہم السلام ہیں۔

[1] ۳ آل عمران: ۳۳۔۳۴

۳۔ آٰللّٰہُ خَیۡرٌ اَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ: اللہ کے ساتھ ان لوگوں کا کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا جنہیں یہ مشرکین اللہ کے ساتھ شریک گردانتے تھے لیکن مشرکین ان شریکوں کو اللہ سے زیادہ چاہتے تھے اس لیے ایک دعوت فکر کے طور پر کہا گیا: کیا اللہ بہتر ہے جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے یا وہ بت جن کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے؟

اَمَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ اَنۡزَلَ لَکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنۡۢبَتۡنَا بِہٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَہۡجَۃٍ ۚ مَا کَانَ لَکُمۡ اَنۡ تُنۡۢبِتُوۡا شَجَرَہَا ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ یَّعۡدِلُوۡنَ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ (شریک بہتر ہیں) یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا؟ پھر ہم نے اس سے پر رونق باغات اگائے، ان درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا، تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ یہ لوگ تو منحرف قوم ہیں۔

تشریح کلمات

حَدَآئِقَ: (ح د ق) الحدیقۃ مرغزار۔ وہ قطعہ زمین جس میں پانی جمع ہو اور ہیئت وصورت اور پانی کے ہونے کی وجہ سے اسے حدقۃ العین (آنکھ کی پتلی) سے تشبیہ دے کر اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

بَہۡجَۃٍ: (ب ھ ج) خوش نمائی، فرحت و سرور کا ظہور۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ: کلام کا رخ مشرکین کی طرف ہے جو غیر اللہ کی اس بنیاد پر پرستش کرتے ہیں کہ یہ غیر اللہ ان کی زندگی کو چلاتے اور کائنات کی تدبیر کرتے ہیں۔ وہ اللہ کو خالق مانتے ہیں بس۔ آگے تدبیر غیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ان سے فرماتا ہے کس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا؟ وہ کہیں گے: اللہ نے۔ پھر سوال ہوا کس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی نازل کیا؟ تو وہ کہتے ہیں ہمارے معبودوں نے۔ اگلے جملے میں فرمایا:

۲۔ فَاَنۡۢبَتۡنَا بِہٖ حَدَآئِقَ: پھر ہم نے اس سے پر رونق باغات اگائے۔ یہ اگانے کا عمل تخلیقی عمل ہے۔ یہ روئیدگی جو زندگی کا ستون ہے تخلیق ہے۔ ایک تنے سے مختلف میوے کون نکالتا ہے؟ صاحب قاموس قرآن نے خوب کہا ہے: تربوز کا بیج جس کا کوئی وزن نہیں اس سے کئی کلو وزنی تربوز کون نکالتا ہے؟ لہٰذا خلق و تدبیر قابل تفریق نہیں ہے۔ مشرکین اللہ کو خالق تسلیم کرتے ہیں تو انہیں اللہ ہی کو مدبر تسلیم کرنا پڑے گا۔

۳۔ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ: کیا کوئی معبود ایسا ہے جو اللہ کے ساتھ تخلیق و تدبیر کا یہ عمل انجام دے سکے؟ جواب نفی میں ہے. جب تخلیقی عمل صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے تو تدبیر کا عمل بھی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا صرف اللہ ہی معبود ہے۔

۴۔ بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ یَّعۡدِلُوۡنَ: یہ لوگ اپنے بنائے ہوئے اصول سے منحرف ہو جاتے ہیں اور غیر خالق کے مدبر ہونے کے قائل ہیں۔

اَمَّنۡ جَعَلَ الۡاَرۡضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَہَاۤ اَنۡہٰرًا وَّ جَعَلَ لَہَا رَوَاسِیَ وَ جَعَلَ بَیۡنَ الۡبَحۡرَیۡنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ (یہ بت بہتر ہیں) یا وہ جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے بیچ میں نہریں بنائیں اور اس کے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان ایک آڑ بنائی؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں تخلیق و تنظیم سے مربوط چار اہم چیزوں کا ذکر ہے جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تخلیق و تدبیر دو مختلف چیزیں نہیں ہیں:

۱۔ اَمَّنۡ جَعَلَ الۡاَرۡضَ قَرَارًا: زمین خلق کرنے کے بعد اسے جائے استقرار کس نے بنایا؟ ظاہر ہے جس نے زمین کو خلق فرمایا اسی نے زمین کو اس طرح خلق فرمایا کہ اس میں استقرار آ جائے، قابل سکونت ہو اور اضطراب نہ ہو۔

۲۔ وَّ جَعَلَ خِلٰلَہَاۤ اَنۡہٰرًا: زمین کو نشیبی صورت میں خلق فرمایا۔ اس طریقہ تخلیق سے نہروں میں روانی آ گئی۔ دریا بہنا شروع ہو گئے۔ اگر زمین ہموار ہوتی تو پانی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ ہوتا۔

۳۔ وَّ جَعَلَ لَہَا رَوَاسِیَ: پہاڑوں کی تخلیق کی وجہ سے زمین کو اضطراب سے محفوظ کر دیا اور ساتھ برف کے ذریعے پانی کو ذخیرہ کر دیا۔ اگر پہاڑوں کی تخلیق نہ ہوتی تو زندگی منظم نہ ہوتی۔

۴۔ وَ جَعَلَ بَیۡنَ الۡبَحۡرَیۡنِ حَاجِزًا: دو سمندروں کے درمیان ایک آڑ بنائی۔

آیت کے اس حصے کی ایک تشریح یہ کی جاتی ہے کہ دونوں سمندر اپنے کیمیکل مواد اور نمک کی وجہ سے جو پانی میں حل ہو گئے ہیں ایک دوسرے سے مخلوط نہیں ہوتے۔ جیسے تیل اور پانی لیکن اس تفسیر میں کوئی تدبیری نکتہ نہیں ہے۔

اس کی ایک تفسیر قاموس قرآن نے اختیار کی ہے جو اگرچہ سیاق آیت سے چنداں نزدیک نہیں

ہے تاہم اس میں ایک اہم تدبیری نکتہ موجود ہے جو آیت کی غرض و غایت کے نزدیک ہے۔
کہتے ہیں: ایک سمندر زمین کی پشت پر ہے اور ایک دوسرا سمندر زمین کی شکم میں ہے۔ زیر زمین پانی کو ہم کنویں، ٹیوب ویل کے ذریعے اوپر لاتے ہیں اور چشمے پھوٹنے سے بھی یہ پانی روئے زمین پر آتا ہے۔ ان دونوں سمندروں کے درمیان زمین ایک آڑ ہے جس سے زمین پر موجود پانی سے زیر زمین پانی نمکین یا تلخ نہیں ہوتا۔ لہٰذا حَاجِزًا آڑ سے مراد زمین ہے جس پر صاحب قاموس قرآن کو یقین حاصل ہے۔

اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکۡشِفُ السُّوۡٓءَ وَ یَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿ؕ۶۲﴾

۶۲۔ یا وہ بہتر ہے جو مضطرب کی فریاد سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس کی تکلیف دور کرتا ہے اور تمہیں زمین میں جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ تم لوگ بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ: جب تم بے بس ہوتے ہو تو اللہ کو پکارتے ہو کیونکہ تمہاری جبلت میں اللہ کا تصور موجود ہے۔ وہ مصیبت کے وقت ہی تمہیں یاد آتا ہے۔ وہی تمہارا معبود ہے۔

۲۔ اِذَا دَعَاہُ: جب اللہ کو پکارے۔ اجابت دعا کے لیے آیت میں یہ شرط عائد کی ہے کہ جب اللہ کو پکارے تو دعا قبول ہو گی۔ اگر کوئی صرف اللہ کو نہیں پکارتا، غیر اللہ کے ساتھ پکارتا ہے تو اجابت دعا کا وعدہ نہیں ہے یا صحیح معنوں میں پکار ہوتی ہی نہیں ہے، صرف زبان ہلاتا ہے۔ اس سے بھی دعا قبول نہ ہو گی لیکن اگر صرف اللہ کو پکارے اور حقیقی معنوں میں پکارے تو اللہ کی طرف سے قبول دعا کا وعدہ ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ ...[1]

اس آیت میں بھی دعا ہونے کی صورت میں قبول دعا کا وعدہ ہے۔ چنانچہ منقول دعا میں آیا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَدْعُوكَ كَمَا اَمَرْتَنِی فَاسْتَجِبْ لِی كَمَا وَعَدْتَنِی ....[2]

اے اللہ! میں تیرے حکم کے مطابق دعا کرتا ہوں اب تو اپنے وعدے کے مطابق قبول فرما۔

لہٰذا یہاں یہ سوال نہیں آسکتا کہ کبھی دعائیں بہت ہوتی ہیں لیکن قبول نہیں ہوتیں۔

۳۔ وَ یَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ: اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اللہ نے آنے والی نسلوں کو گزشتہ نسلوں کا جانشین بنایا۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ تمہیں اللہ نے زمین پر اپنا جانشین بنایا ہے کہ اس نے ہر

[1] ۴۰ غافر: ۶۰ [2] التھذیب ۳: ۱۲۱

چیز تمہارے اختیار میں رکھی ہے۔ اس طرح اس نے مجموعی طور پر انسان کو زمین میں خلافت عطا کی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

هُوَاَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا ...[1]	اللہ نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس میں تمہیں آباد کیا۔

یہ دونوں تفسیریں تدبیری نقطہ نظر سے آیت کے سیاق کے ساتھ مناسب ہیں۔

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾	۶۳۔ یا وہ بہتر ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے اور کون ہے جو ہواؤں کو خوشخبری کے طور پر اپنی رحمت کے آگے آگے بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ اللہ بالاتر ہے ان چیزوں سے جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ: خشکی، سمندر اور تاریکیوں میں اللہ تعالیٰ نے اس کائناتی نظام میں ایسے نظام وضع فرمائے ہیں جن سے انسان کو سمتوں کا پتہ چلتا ہے۔ پائلٹ اور سمندری جہاز چلانے والے اس نظام سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان میں ستارے بھی شامل ہیں جن سے راہنمائی ملتی ہے۔

۲۔ وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ: اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تدبیر کا ایک اہم مظہر یہ ہے کہ اللہ نے نظام خلقت میں مختلف علاقوں کے درجہ حرارت مختلف رکھے ہیں۔ اس کی وجہ سے تیز رفتار ہوا وجود میں آتی ہے جو بادلوں کو خشکی کی طرف چلاتی ہے۔ یہ ہوا رحمت الٰہی یعنی سرچشمہ حیات پانی کی خوشخبری دینے والی ہے۔ ۱۸۰

یہ سب اللہ تعالیٰ کے تخلیقی نظام سے مربوط تدبیریں ہیں جو تخلیق سے جدا نہیں ہیں۔

۳۔ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ: یہ سب تدبیریں خالق کی طرف سے ہیں تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہو سکتا ہے جس کا اس تخلیق و تدبیر میں کوئی کردار ہو؟

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ	۶۴۔ یا وہ بہتر ہے جو خلقت کی ابتدا کرتا ہے پھر اسے دہراتا ہے اور کون تمہیں آسمان اور زمین سے رزق

[1] ۱۱ ہود: ۶۱

الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۶۴﴾

دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ کہد یجیے: اپنی دلیل پیش کرو اگر تم لوگ سچے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمَّنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ: کون خلقت کی ابتدا کرتا ہے پھر اسے دہراتا ہے؟ مشرکین اس بات کے تو قائل تھے کہ خالق اللہ ہے لہٰذا تخلیق سے تدبیر کا استدلال درست ہے لیکن وہ اعادہ تخلیق کے قائل نہیں تھے۔ اس آیت میں اعادہ تخلیق سے کیسے استدلال ہوا؟ جس کے وہ قائل نہیں تھے۔

تقریباً تمام مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اعادہ خلق پر اس قدر دلائل دیے ہیں کہ ان دلائل کی روشنی میں اعادہ خلق دلائل کی دنیا میں ناقابل انکار ہو گیا ہے۔

میرے نزدیک یہ بات بعید نہیں ہے کہ اعادہ خلق سے مراد آخرت نہ ہو، دنیا میں جاری اعادہ خلق ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ متعدد آیات میں دنیا میں اعادہ تخلیق سے آخرت کے اعادہ تخلیق کے لیے استدلال فرماتا ہے:

وَیُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ وَکَذٰلِکَ تُخۡرَجُوۡنَ ﴿۱۹﴾ [1]

اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے۔

وَالَّذِیۡ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنۡشَرۡنَا بِہٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا ۚ کَذٰلِکَ تُخۡرَجُوۡنَ ○ [2]

اور جس نے آسمان سے پانی ایک مقدار میں نازل کیا جس سے ہم نے مردہ شہر کو زندہ کر دیا، تم بھی اسی طرح (قبروں سے) نکالے جاؤ گے۔

۲۔ وَمَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ: کون تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ رزق کا بیشتر حصہ آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ دھوپ، نائٹروجن، بارش وغیرہ۔ اس لیے فرمایا:

وَ فِی السَّمَآءِ رِزۡقُکُمۡ وَ مَا تُوۡعَدُوۡنَ ○ [3]

اور تمہاری روزی آسمان میں ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

دانے کو شگافتہ کر کے اس کے شکم سے تنا، برگ اور دانہ نکالنا رزق اور تخلیق ہے۔ لہٰذا رزق دینا تخلیق مسلسل سے عبارت ہے۔

۳۔ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ: کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے جو تمہاری زندگی کی یہ تمام تدابیر فراہم کرے؟

۴۔ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ: اے رسول کہد یجیے: تم اپنے مدّعا پر دلیل پیش کرو کہ تمہارے معبود ان تدبیری امور میں کوئی امر انجام دیتے ہیں؟

---

[1] ۳۰ روم: ۱۹ [2] ۴۳ زخرف: ۱۱ [3] ۵۱ ذاریات: ۲۲

اہم نکات

۱۔ خالق ہی رازق ہے چونکہ رزق دینا تخلیق مسلسل ہے۔

قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰہُ ؕ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ کہدیجیے: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ غیب کی باتیں نہیں جانتے سوائے اللہ کے اور نہ انہیں یہ علم ہے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

تفسیر آیات

علم غیب بذات خود صرف اللہ جانتا ہے۔ اگر غیر اللہ کو کسی علم غیب پر دست رسی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم کی صورت میں ممکن ہے۔ لہٰذا آسمانوں اور زمین میں علم غیب کا ماخذ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہے اور جو اپنے بندوں کے مستقبل سے بے خبر ہو وہ معبود نہیں بن سکتا کیونکہ وہ بے خبری میں اپنے بندوں کی زندگی کی تدبیر نہیں کر سکتا۔

وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ: علم غیب کا ایک موضوع علم بہ قیامت کا ذکر ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کے مستقبل کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا، خاص کر قیامت کے بارے میں کہ کب برپا ہو گی تو ایسے معبود اپنے بندوں کے مستقبل کے بارے میں کس چیز کی ضمانت دے سکیں گے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی زندگی اسی ذات کے قبضہ قدرت میں ہے جو اس کے مستقبل سے باخبر ہے۔

بَلِ ادّٰرَکَ عِلۡمُہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۟ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّنۡہَا ۫۟ بَلۡ ہُمۡ مِّنۡہَا عَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾ ع ۸

۶۶۔ بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم ماند پڑ گیا ہے، بلکہ وہ اس کے بارے میں شک میں ہیں بلکہ یہ اس کے بارے میں اندھے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بَلِ ادّٰرَکَ عِلۡمُہُمۡ: اس جملے اور اس کے بعد آنے والے جملوں کی تفسیر و توجیہ میں اہل علم کو بہت اضطراب پیش آیا ہے۔ اس اضطراب کی وجہ لفظ ادّٰرَکَ کے معنی میں مضمر ہے۔ چنانچہ اس لفظ کے ایک معنی فنا کے ہیں۔ اس معنی کو اکثر نے اختیار کیا پھر توجیہ و تاویل اور تکلف کرنا پڑا۔ جب کہ اس لفظ کے کثیر

الاستعمال معنی تتابع اور تلاحق کے ہیں۔ کہتے ہیں: دراکا متدارکا یعنی تباعاً واحداً اثر واحد۔ اِدّٰرَكَ اور متدارك یکے بعد دیگرے پیچھے آنے کے معنوں میں ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اس جملے کا واضح مطلب یہ بنتا ہے:

یہ مشرکین آخرت کی نفی میں جس علم کے مدعی ہیں ان کا یہ علم کسی دلیل و برہان پر مستند نہیں ہے۔ بَلِ ادّٰرَكَ عِلۡمُهُمۡ بلکہ ان کا یہ علم تقلیدی ہے۔ اپنے آباء و اجداد سے یکے بعد دیگرے ان تک منتقل ہوا ہے۔

ہم نے اِدّٰرَكَ کا ترجمہ ماند پڑ گیا سے کیا ہے چونکہ ان کا علم کسی سند تک نہیں پہنچ پاتا۔ جیسا کہ قرآن نے متعدد آیات میں اس قسم کے تقلیدی عقائد و نظریات کو مسترد کیا ہے۔

بَلۡ هُمۡ فِیۡ شَكٍّ مِّنۡهَا: وہ اس تقلیدی موقف کو علم کا نام دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔

بَلۡ هُمۡ مِّنۡهَا عَمُوۡنَ: بلکہ وہ شک کے مرحلے سے بدتر حالت میں ہیں۔ شک کی حالت میں انسان مسئلے کی طرف متوجہ رہتا ہے پھر شک کرتا ہے۔ یہ لوگ ایسے اندھے ہیں کہ اس مسئلے کو اپنے صفحہ ذہن پر نہیں لاتے۔

اہم نکات

۱۔ مشرکین نے اپنا عقیدہ علم کی بنیاد پر نہیں رکھا ہے بلکہ ان کا عقیدہ شک سے بدتر نابینائی کی صورت میں موجود ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا ءَاِذَا کُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَاۤ اَئِنَّا لَمُخۡرَجُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اور کفار کہتے ہیں: جب ہم اور ہمارے باپ دادا خاک ہو چکے ہوں گے تو کیا ہمیں (قبروں سے) نکالا جائے گا؟

تفسیر آیات

وہ انسان کے خاک ہونے کے بعد دوبارہ انسان ہونے کو بعید سمجھتے تھے۔ ان کے پاس انسان کے دوبارہ انسان ہونے کے ناممکن ہونے پر کوئی دلیل نہیں تھی۔

صرف یہ کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے جسم کے ذرات زمین میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ ایک درخت کی جڑوں کا حصہ بن جاتا ہے جس کے پتے زمین پر گرتے ہیں۔ پھر ان پتوں کو کوئی جانور کھاتا ہے۔ اس جانور کو کوئی انسان کھاتا ہے۔ اس طرح اس شخص کے بدن کے اجزاء کسی دوسرے شخص کے بدن کا جز بن جاتے ہیں۔

جب کہ انسان پہلی مرتبہ انسان بنا تو جن اجزاء و خلیات سے بنا ہے وہ کسی اور انسان اور حیوان کے تنفس سے پیدا ہونے والے عناصر سے بنے ہیں کہ یہ کاربن ایک درخت کا حصہ بن گیا۔ اس کے پھل سے انسان کا خون نطفہ بن جاتا ہے پھر انسان کی شکل میں آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ پہلی بار انسان کو اللہ تعالیٰ نے منتشر اور مختلف عناصر جمع کر کے بنایا۔ دوسری بار بھی اسی طرح خلق کرنا اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے۔

لَقَدۡ وُعِدۡنَا ہٰذَا نَحۡنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اس قسم کا وعدہ پہلے بھی ہم سے اور ہمارے باپ دادا سے ہوتا رہا ہے یہ تو قصہ ہائے پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اس قسم کی قیامت کا وعدہ تو ہمارے آبا و اجداد سے بھی ہوتا رہا ہے۔ اگر یہ وعدہ سچ ہوتا تو ابھی تک قیامت آ چکی ہوتی۔ یہ صرف داستان پارینہ ہے جو بے حقیقت ہے۔

۲۔ اس آیت میں مشرکین کی طرف سے اس بات کا اعتراف ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آخرت کا تصور قائم کر کے کوئی انوکھا تصور قائم نہیں کیا بلکہ خود مشرکین کے اعتراف کے مطابق تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام بیان کرتے آئے ہیں۔

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ کہد یجیے: زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہوا ہے۔

تفسیر آیات

سیر فی الارض سے تمہیں یہ نظر آئے گا کہ ان قوموں کا انجام کیسا رہا جنہوں نے قیامت کا انکار کیا تھا۔ ان کا انجام دیکھ کر ان سے سبق لو اور انکار آخرت کے جرم کے مرتکب نہ بنو۔

ممکن ہے مطلب یہ ہو کہ سیر فی الارض سے گزشتہ قوموں پر نازل ہونے والے عذاب کے آثار دیکھ کر یہ معلوم ہو جائے گا کہ انسانی عمل و کردار بے حساب نہیں ہے جیسا کہ مشرکین نے خیال کر رکھا ہے بلکہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا مل جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خلقت عبث ہو جاتی۔

اہم نکات

۱۔ قوموں کی تباہی میں درس اور دلیل ہے روز آخرت پر۔

وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا تَکُنۡ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ﴿۷۰﴾

۷۰۔اور (اے رسول) ان (کے حال) پر رنجیدہ نہ ہوں اور نہ ہی ان کی مکاریوں پر دل تنگ ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ رسول اللہ ﷺ کو انسانوں کی نجات و ہدایت کے ساتھ جو ہمدردی اور مہربانی تھی اس کی وجہ سے لوگوں کو گمراہ ہوتے دیکھ کر آپؐ رنجیدہ ہوتے تھے۔ ان کی عاقبت کو دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔ آیت میں بتایا کہ یہ لوگ آپؐ کی ہمدردی کے اہل نہیں ہیں۔

۲۔ دوسری طرف ان مجرموں کی مکاریوں سے سے بھی آپ ﷺ کو اذیت ہوتی تھی۔ یہاں تک آپؐ نے فرمایا:

ما اوذی نبی مثل ما اوذیت۔[1] جیسے اذیت مجھے دی گئی ایسی کسی نبی کو نہیں دی گئی

آیت میں فرمایا ان مکاریوں سے آپؐ دل تنگ نہ ہوں۔ اللہ ان کے شر سے آپ ﷺ کو بچائے گا اور فتح آپ ہی کی ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ جو رحمت حق کے اہل نہیں ہیں ان پر رحم نہیں کیا جاتا۔

وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ﴿۷۱﴾

۷۱۔ اور وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ آخر کب پورا ہو گا؟

تفسیر آیات

اس وعدے سے مراد دنیاوی عذاب ہو سکتا ہے کہ قرآن کی طرف سے گزشتہ اقوام، قوم عاد و ثمود کی طرح کے عذاب سے ڈرایا جاتا تھا:

---

[1] بحار الانوار ۳۹: ۵۵

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ؕ[1]

اگر یہ منہ پھیر لیں تو کہہ دیجیے: میں نے تمہیں ایسی بجلی سے ڈرایا ہے جیسی بجلی قوم عاد و ثمود پر آئی تھی۔

قُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّكُوۡنَ رَدِفَ لَكُمۡ بَعۡضُ الَّذِیۡ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ کہہ دیجیے: ممکن ہے جن بعض باتوں کے لیے تم عجلت چاہ رہے ہو وہ تمہارے پس پشت پہنچ چکی ہوں۔

تشریح کلمات

رَدِفَ: (ر د ف) الردف تابع یعنی ہر وہ چیز جو دوسرے کے پیچھے ہو۔

۱۔ قُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّكُوۡنَ رَدِفَ: عَسٰی کا لفظ جب اللہ تعالیٰ استعمال فرماتا ہے تو اس کے بعد ذکر ہونے والا مطلب ایک مطلوبہ عمل ہوا کرتا ہے۔ التبیان کے مطابق عسی من اللّٰہ واجبۃ۔ اللہ جب عَسٰی (ممکن ہے) کا لفظ استعمال فرماتا ہے تو اس کے بعد مذکورہ مطلب کا واقع ہونا لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا جس عذاب کی طرف اشارہ ہو رہا ہے اس کا واقع ہونا لازمی ہے۔

یہ عذاب جنگ بدر کی شکست سے شروع ہوا اور فتح مکہ کے موقع پر اس وعدے کا ایک حصہ پورا ہو گیا۔ بَعۡضُ الَّذِیۡ یہ دنیوی عذاب کل کے عذاب کا ایک حصہ ہوگا جو مشرکین کے مقدر میں ہے۔

مجرمین پر عذاب نازل کرنے میں اللہ تعالیٰ عجلت سے کام نہیں لیتا۔ جب کہ مجرمین خود اس عدم عجلت کو قیامت کے برحق نہ ہونے کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔ عذاب کا مستحق ہونے کے باوجود عذاب میں عجلت سے کام نہ لینا اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے جس سے ان کے جرم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مجرم کے عذاب میں عجلت سے کام نہ لینا خود عذاب ہے۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا یَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور تحقیق آپ کا پروردگار لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

تفسیر آیات

۱۔ عذاب میں عجلت سے کام نہ لینا، ان لوگوں کے حق میں اللہ کا فضل و کرم ہے جو مستقبل میں راہ

[1] ۴۱ فصلت: ۱۳

حق پر آنے والے ہیں۔ لہٰذا وہ لوگ جو ایمان کے دائرے میں داخل ہونے والے ہیں وہ عذاب نہ آنے کا شکر کریں مگر وہ آج شکر نہیں کر رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مہلت مؤمن کے لیے رحمت اور کافر کے لیے عذاب ہے۔

وَ اِنَّ رَبَّکَ لَیَعۡلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوۡرُہُمۡ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ اور جو کچھ ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں بتحقیق آپ کا پروردگار اسے خوب جانتا ہے۔

۲۔ عذاب میں تاخیر اس لیے تو نہیں ہے کہ اللہ کو مجرمین کے جرم پر علم حاصل کرنے میں وقت لگتا ہے۔ اللہ تو جرم کے واقع ہونے سے پہلے مجرمین کے ارادوں کو اسی طرح جانتا ہے جیسے جرم کا برملا ارتکاب کرنے کی صورت میں جانتا ہے۔

وَ مَا مِنۡ غَآئِبَۃٍ فِی السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ اور آسمان اور زمین میں کوئی ایسی پوشیدہ بات نہیں ہے جو کتاب مبین میں نہ ہو۔

۳۔ کوئی بات اللہ سے پوشیدہ کیسے رہ سکتی ہے۔ کل کائنات میں پیش آنے والا ہر عمل اور کائنات کے سینے میں پوشیدہ تمام راز کتاب مبین یعنی لوح محفوظ میں موجود ہیں۔

اہم نکات

۲۔ موجودات اپنے وجود سے پہلے اللہ کے علم میں ہیں۔

اِنَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اَکۡثَرَ الَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر وہ باتیں بیان کر دیتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت عیسیٰ روح القدس اور اللہ کو یہ لوگ اقنوم ثلاثۃ کہتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی چڑھنے کے بارے میں ان کے اختلافات کا قرآن فیصلہ کن موقف اختیار فرماتا ہے۔ بنی اسرائیل نے

انبیاء علیہم السلام اور ان کے لائے ہوئے دین میں جو تحریفیں کی ہیں ان سب حقائق کا بیان کرنا قرآن نے اپنے ذمے لیا ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۷۷ ۷۷۔ اور یہ اہل ایمان کے لیے یقیناً ہدایت اور رحمت ہے۔

۲۔ یہ قرآن تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے ہے اور رحمت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اس ہدایت سے بہرہ ور ہوتے اور ایمان کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝۷۸ ۷۸۔ یقیناً آپ کا رب اپنے حکم سے ان کے درمیان فیصلہ کر دیتا ہے اور وہی بڑا غالب آنے والا، بڑا علم رکھنے والا ہے۔

۳۔ آپ کا رب ان اختلاف کرنے والوں میں فیصلہ کرے گا۔ یہ فیصلہ بِحُكْمِهٖ یعنی بعدلہ ہوگا۔ اللہ ان میں اپنے عدل سے فیصلہ فرمائے گا۔ یہ فیصلہ قیامت کے دن ہو۔گا چنانچہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے:

۴۔ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ: وہ عزیز بالادست ہے۔ اس کا فیصلہ کوئی رد نہیں کر سکتا اور اپنا فیصلہ نافذ کر سکتا ہے۔ وہ علیم ہے۔ اپنے فیصلے میں لغزش نہیں کرتا ہے۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝۷۹ ۷۹۔ لہٰذا آپ اللہ پر بھروسا کریں، یقیناً آپ صریح حق پر ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: اے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم! آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں اور استقامت کے ساتھ رہیں۔ استقامت کے لیے دو بنیادوں کا ذکر ہے: ایک یہ کہ اس کائنات میں طاقت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ اسی پر اپنا بھروسہ قائم رکھیں۔

۲۔ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ: دوسری یہ کہ آپ صریح حق پر ہیں۔ حق کو دوام حاصل ہے اور باطل زوال پذیر ہے۔ حق امر واقع کو کہتے ہیں۔ جو موقف واقعیت رکھتا ہے وہ ایک عظیم طاقت رکھتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان مروی ہے:

مَنْ صَارَعَ الْحَقَّ صَرَعَهُ۔[1] جو حق سے ٹکرائے گا حق اسے پچھاڑ دے گا۔

۳۔ الْمُبِيْنِ: وہ واضح بات جس میں شبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حق جب آشکار ہو گا تو یہ حق زیادہ طاقتور ہو گا۔

اس میں رسول کریم ﷺ کے لیے حتمی کامیابی کی خوشخبری ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق کی طاقت شکست پذیر نہیں ہے۔

۲۔ حق کے حصول کے بعد اللہ پر توکل کیا جائے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ۝۸۰

۸۰۔ آپ نہ مردوں کو سنا سکتے ہیں، نہ ہی بہروں کو اپنی دعوت سنا سکتے ہیں جب وہ پیٹھ پھر کر جا رہے ہوں۔

۱۔ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى: یہاں اسماع (سنانا) سے مراد ہدایت ہے۔ آپ ان لوگوں کو راہ راست پر نہیں لا سکتے جن میں زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ ان میں وہ سوجھ بوجھ نہیں ہے جو کسی بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی مفہوم کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ....[2]

ان کے پاس دل تو ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے....

لہٰذا یہاں الْمَوْتٰى استعارہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور الْمَوْتٰى (مرنے والوں) سے مراد حقیقی مردے نہیں ہیں کہ اس سے استدلال کیا جا سکے کہ مُردوں سے خطاب درست نہیں ہے لہٰذا صحیح مسلم کی اس حدیث: ما انتم باسمع لما اقول منهم۔ تم زندہ لوگ ان مردوں سے زیادہ میری بات سننے والے نہیں ہو، کا اس آیت سے کوئی تصادم نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔

۲۔ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ: نہ ہی آپؐ بہروں کو اپنی دعوت سنا سکتے ہیں۔ الصُّمَّ (بہرے) بھی استعارہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کی آواز پر کان دھرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

بہرے سے مراد حقیقی بہرے نہیں ہیں۔ چنانچہ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ (جب وہ پیٹھ پھر کر جا رہے ہوں) اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لوگ حق کی آواز سننے پر آمادہ ہی نہیں ہیں۔

[1] نہج البلاغۃ حکمت: ۴۰۸ [2] ۷ اعراف: ۱۷۹

اہم نکات

۱۔ اللہ کی رحمت و ہدایت ان لوگوں کو شامل نہیں کرتی جو اس کے اہل نہیں ہیں۔

۲۔ حق کی آواز پر کان نہ دھرنے والے زندہ شمار نہیں ہوتے۔

وَمَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِی الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ ؕ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ اور نہ ہی آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے بچا کر راستہ دکھا سکتے ہیں، آپ ان لوگوں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرمانبردار بن جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِی الۡعُمۡیِ: جن لوگوں میں بینش کی صلاحیت نہیں ہے انہیں آپ راستہ دکھا کر ان کو گمراہی سے نہیں بچا سکتے۔

ان آیات میں فرمایا: آپ مردوں، بہروں اور اندھوں کو راہ راست پر نہیں لا سکتے کیونکہ یہ لوگ ہدایت حاصل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اہلیت کا نہ ہونا خود ان لوگوں کی اپنی ہٹ دھرمی اور سرکشی کی وجہ سے ہے۔ اس ہٹ دھرمی کے پیچھے کچھ لوگوں میں اور عوامل ہوتے ہیں۔ وہ عوامل ان سرکشوں میں سے بڑوں کے مفادات ہیں:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ کٰفِرُوۡنَ ۝ [1]

اور ہم نے کسی بستی کی طرف کسی تنبیہ کرنے والے کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے مراعات یافتہ لوگ کہتے تھے: جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔

یہ مفاد پرست لوگ دیگر لوگوں کو حق کی مخالفت پر اکساتے تھے:

وَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا ۝ [2]

اور وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی پس انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔

۲۔ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا: یہاں آیات سے مراد دلائل ہیں۔ جو لوگ دلائل کو سنتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ان پر حق کی آواز اثر کرتی ہے۔

---

[1] سبا: ۳۴ [2] احزاب: ۶۷

۲۔ فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ: دلائل سمجھنے اور حق کی معرفت حاصل کرنے کے بعد اپنی سرکشی پر قائم نہیں رہتے بلکہ ان آیات و دلائل کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿٨٢﴾ ع

۸۲۔ اور جب ان پر وعدہ (عذاب) پورا ہونے والا ہوگا تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک چلنے پھرنے والا نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ درحقیقت لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ: یہ تعبیر قرآن میں وعدے کے پورا ہونے اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں فرمایا:

وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ○

اور ان کے ظلم کی وجہ سے بات ان کے خلاف پوری ہو کر رہے گی اور وہ بول نہیں سکیں گے۔

۲۔ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ: ہم ان کے لیے زمین سے ایک چلنے پھرنے والا نکالیں گے۔ دَآبَّةً کے لغوی معنی چلنے پھرنے والے کے ہیں۔ انسان اور حیوان دونوں شامل ہیں یا اَخْرَجْنَا زمین سے نکالنے سے مراد ہو سکتا ہے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا ہو یا بطور معجزہ کسی جاندار کو زمین سے نکالنا ہو۔

واضح رہے اس آیت میں دَآبَّةً اور اَخْرَجْنَا۔ دونوں لفظوں میں ایسا اجمال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مطلب کو اجمال میں رکھنا چاہتا ہے۔

۳۔ تُكَلِّمُهُمْ: یہ دَآبَّةً ان سے بات کرے گا۔ یہ قرینہ بن سکتا ہے کہ یہ دَآبَّةً کوئی انسان ہے لیکن ساتھ یہ امکان بھی ہے کہ اس دَآبَّةً کا بات کرنا ایک معجزے کے طور پر ہو۔ پھر آگے وہ بات کیا ہو گی اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ اجمال میں رکھنا ہی منظور الٰہی ہے۔

یہ بات بھی قاری کی نظر میں رہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت قرآن کا جو انتظام فرمایا اس میں سے ایک یہی اجمال و ابہام ہے اور قرآن کا ذو وجوہ ہونا ہے۔ ہم نے مقدمہ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ قرآن نے صرف اصول و کلیات ہی بیان کیے ہیں اور تفسیر و تشریح کا کام سنت پر چھوڑ دیا ہے۔ آیہ مباہلہ میں اَبْنَآءَنَا اور نِسَآءَنَا [1] کی تشریح سنت نے کی ہے۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ [2] اور الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ [3] سے کون مراد ہیں؟ قرآن نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ صرف ابو لہب کا نام صراحۃً

[1] ۳ آل عمران: ۶۱ [2] ۱۰۸ کوثر: ۳ [3] ۱۷ اسراء: ۶۰

ذکر ہوا ہے چونکہ مستقبل میں رسولؐ کے خاندان کی طرف سے کسی تحریف کا خطرہ نہیں تھا۔
۳۔ اَنَّ النَّاسَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوۡقِنُوۡنَ: بعض کے نزدیک یہی وہ کلام ہے جو یہ دَآبَّۃً کرے گا۔ مجمع البیان کے نزدیک ظاہر آیت یہی ہے لیکن یہ دابۃ کا کلام ہونا اور اس کا ظاہر آیت ہونا اکثر مفسرین کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے بلکہ اس بات کے سبب کا بیان ہے کہ ان کے بارے وعدہ عذاب کیسے پورا ہوا۔ وعدہ عذاب اس لیے پورا ہوا کہ وہ آیات الٰہی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔
دَآبَّۃً مِّنَ الۡاَرۡضِ کون ہیں؟: غیر شیعہ مفسرین میں اس دَآبَّۃً کے بارے میں جو نامعقول خرافاتی باتیں منقول ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت کے راستے سے پھسلنے کے بعد کیسے گہری کھائی میں گرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

> اس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ ہوگی۔ اس کے بال اور سم ہوگا اور ساتھ داڑھی ہوگی۔ اس کا سر بیل کے سر کی طرح، آنکھ سور کی آنکھوں کی طرح، کان ہاتھی کی طرح، اس کے سینگ ہرنی کی طرح، اس کی گردن شتر مرغ کی طرح، اس کا سینہ شیر کی طرح، اس کا رنگ چیتے کی طرح، اس کی دم دنبے کی طرح، ٹانگیں اونٹ کی طرح ہوں گی۔ چہرہ انسان کی طرح ہوگا۔ پرندے کی طرح چونچ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے دونوں سینگوں کا درمیانی فاصلہ ایک فرسخ ہوگا۔[۱]

اس کے مقابلے میں دیگر روایات میں اس دَآبَّۃً کے بارے میں آیا ہے: حضرت علی علیہ السلام سے اس دَآبَّۃً کے بارے میں سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

اما واللّٰہ ما لھا ذنب و ان لھا للحیۃ۔[۲]	قسم بخدا اس کی کوئی دم نہ ہوگی، اس کی تو داڑھی ہو گی۔

دیگر حدیث رسولؐ میں آیا ہے:

انھا تکتب علی جبین الکافر انہ کافر و علی جبین المؤمن انہ مؤمن۔[۳]	یہ دَآبَّۃً کافر کے رخسار پر لکھے گا یہ کافر ہے اور مؤمن کے رخسار پر لکھے گا یہ مؤمن ہے۔
تخرج دابۃ الارض و معھا عصا موسی و خاتم سلیمان علیھما السلام فتخطم انف الکافر بالعصا و تحلی وجہ المؤمن بالخاتم۔[۴]	دابۃ الارض زمین سے نکلے گا ان کے ساتھ موسیٰ کا عصا اور سلیمان کی انگوٹھی ہوگی وہ عصا سے کافر کی ناک کاٹے گا اور انگوٹھی سے مؤمن کا چہرہ چمکا دے گا۔

دَآبَّۃً کا خروج قیامت سے پہلے ہوگا۔

---
۱ الدر المنثور ۵: ۱۱۷، تفسیر ابن کثیر ۶: ۱۹۳ ۲ بحار ۶: ۳۰۰ ۳ التبیان ۸: ۱۲۰
۴ مسند احمد۔ ۲: ۲۵۹۔ ۴۹۱، سنن ابن ماجۃ کتاب الفتن

رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے۔ اس حدیث کو مسلم اور اصحاب سنن نے ذکر کیا ہے:

لاتقوم الساعة حتی تروا عشر آیات: طلوع الشمس من مغربها، والدخان و الدابة....	جب تک دس نشانیوں کا مشاہدہ نہ کرو گے قیامت برپا نہ ہو گی۔ مغرب سے سورج کا طلوع، دھواں اور دَآبَّۃً ....۔

حذیفہ بن الیمانؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہؐ سے پوچھا گیا: یہ دَآبَّۃً کہاں سے نکلے گا؟ فرمایا:

تخرج من اعظم المساجد حرمة علی اللّٰہ بینما عیسی یطوف بالبیت و معه المسلمون۔[1]	یہ دَآبَّۃً اللہ کے نزدیک حرمت کے اعتبار سے سب سے عظیم مسجد سے نکلے گا جب عیسیٰ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے ہوں گے اور مسلمان ان کے ساتھ ہوں گے۔

وَ یَوۡمَ نَحۡشُرُ مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍ فَوۡجًا مِّمَّنۡ یُّکَذِّبُ بِاٰیٰتِنَا فَہُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ﴿۸۳﴾	۸۳۔ اور جس روز ہم ہر امت میں سے ایک ایک جماعت کو جمع کریں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتی تھیں پھر انہیں روک دیا جائے گا۔

تفسیر آیات

آیت کے ظاہری سیاق سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیامت سے قبل کا واقعہ ہے کیونکہ قیامت کے دن سب کو جمع کیا جانا ہے:

وَّ حَشَرۡنٰہُمۡ فَلَمۡ نُغَادِرۡ مِنۡہُمۡ اَحَدًا ۞[2]	اور سب کو ہم جمع کریں گے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔

جب کہ اس آیت میں ہر امت میں سے یک ایک جماعت کو جمع کرنے کا ذکر ہے۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ کرتے ہیں: یہ قیامت کا ہی واقعہ ہے اور وَ یَوۡمَ نَحۡشُرُ مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍ فَوۡجًا اس دن ہم ہر امت کو فوج فوج کر کے جمع کریں گے۔

تیسری تفسیر میں کہتے ہیں: ہر نبی کی امت میں تصدیق اور تکذیب کرنے والے سب شامل ہیں۔ اس آیت میں فرمایا: ہر امت میں سے تکذیب کرنے والوں کو جمع کیا جائے گا یا یہ کہ ان کے سرداروں کو جمع کیا جائے گا۔ اس تفسیر کے مطابق مِن زائدہ نہیں ہے اور واقعہ قیامت کا ہے۔

---

[1] تفسیر طبری ۲۰: ۱۱ [2] ۱۸ کهف: ۴۷

پہلی تفسیر کے مطابق اس آیت سے رجعت پر استدلال کیا جاتا ہے کہ ظہور مہدی علیہ السلام کے موقع پر دشمنان اہل بیت میں سے صف اول کے لوگوں کو انتقام اور صف اول کے مؤمنوں کو حکومت مہدی میں شرکت کے لیے زندہ کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں شیعہ مصادر میں روایات کثرت سے موجود ہیں۔

علمائے شیعہ کی ایک جماعت نے رجعت کے بارے میں وارد روایات کی تاویل کی ہے کہ رجعت سے مراد آل محمد کی حکومت کی رجعت ہے، افراد و اشخاص کی نہیں. ملاحظہ ہو مجمع البیان ذیل آیہ۔

صاحب المیزان کے نزدیک ظاہر آیت سے یہ حشر، قیامت سے پہلے ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ تاہم آیت اس مفہوم پر نص صریح نہیں ہے۔ تاویل ہو سکتی ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡ قَالَ اَکَذَّبۡتُمۡ بِاٰیٰتِیۡ وَ لَمۡ تُحِیۡطُوۡا بِہَا عِلۡمًا اَمَّا ذَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ جب سب آ جائیں گے تو (اللہ) فرمائے گا: کیا تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا تھا؟ جب کہ ابھی تم انہیں اپنے احاطہ علم میں بھی نہیں لائے تھے اور تم کیا کچھ کرتے تھے؟

تفسیر آیات

۱۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡ: جب سب لوگ آ گئے چونکہ باقی لوگوں کو روک لیا تھا، یہ یُوۡزَعُوۡنَ سے مربوط ہے، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ یہ خطاب اللہ کی طرف سے ہو گا۔ آیاتی میں، رجعت کی صورت میں آیات سے مراد ائمہ اہل بیت اور انبیاء علیہم السلام ہو سکتے ہیں۔ تکذیب سے مراد ان کی طرف سے قائم کردہ دلائل کی تکذیب ہو سکتی ہے۔ رجعت مراد نہ ہونے کی صورت میں انبیاء علیہم السلام کی طرف سے پیش کردہ معجزات ہو سکتے ہیں۔

۲۔ وَ لَمۡ تُحِیۡطُوۡا بِہَا عِلۡمًا: یہ تکذیب ان لوگوں نے کسی علم اور سند کی بنیاد پر نہیں کی۔ ظاہر ہے کسی علم کے بغیر نہ اسے رد کرنا درست ہے، نہ قبول کرنا۔ علم کے بغیر رد کرنا عناد اور قبول کرنا اندھی تقلید ہے۔

۳۔ اَمَّا ذَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ: جو کام کرنے کا تھا وہ تحقیق و جستجو تھا۔ پھر اس کے بارے میں علم حاصل کرنا تھا۔ یہ کام تو تم نے کیا نہیں۔ آگے تم نے جو کام کیا ہے وہ تکذیب ہی ہے۔

وَ وَقَعَ الۡقَوۡلُ عَلَیۡہِمۡ بِمَا ظَلَمُوۡا فَہُمۡ لَا یَنۡطِقُوۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ اور ان کے ظلم کی وجہ سے بات ان کے خلاف پوری ہو کر رہے گی اور وہ بول نہیں سکیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ ان پر وعدہ عذاب پورا ہو گیا۔ اس آیہ شریفہ میں وَقَعَ الۡقَوۡلُ کا مطلب وہی ہو گا جو آیت ۸۲

میں وَقَعَ الۡقَوۡلُ کا مطلب ہے۔ وہاں وَقَعَ الۡقَوۡلُ کا مطلب وعدہ عذاب کا حتمی ہونا تھا، خود عذاب نہیں۔ لہٰذا اس آیت میں بھی وَقَعَ الۡقَوۡلُ سے مراد وعدہ عذاب کا حتمی ہونا ہے، خود عذاب نہیں ہے کہ قیامت کا دن مراد لیا جائے۔

۲۔ بِمَا ظَلَمُوۡا: یہ وعدہ عذاب کا حتمی ہونا، آیات الٰہی کی تکذیب کی صورت میں ہونے والے ارتکاب ظلم کی وجہ سے ہے۔

۳۔ فَهُمۡ لَا يَنۡطِقُوۡنَ: ان تکذیبی عناصر کے پاس کوئی عذر نہ ہو گا جسے وہ پیش کر سکیں۔

اَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِيَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ وَالنَّهَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے رات اس لیے بنائی کہ وہ اس میں سکون حاصل کریں اور دن کو روشن بنایا؟ ایمان لانے والوں کے لیے اس میں یقیناً نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

ان تکذیبی عناصر سے ہے کہ اگر کائنات میں موجود نظام و حکمت میں یہ غور کرتے تو دابۃ الارض جیسے معجزے کا ذریعہ استعمال کرنے کی نوبت نہ آتی۔

روز و شب کی آمد و رفت میں روئے زمین پر حیات و زندگی کی بقا و ارتقا کا جو کردار ہے وہ کسی عاقل سے پوشیدہ نہیں ہے، صرف ان میں فکر اور تدبر کر کے اس سے نتیجہ اخذ کرنے میں فرق ہے۔ اہل ایمان اس حکمت آمیز نظام سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ اسے روز کا معمول گردانتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔

وَيَوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ فَفَزِعَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوۡهُ دٰخِرِيۡنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ اور جس روز صور میں پھونک ماری جائے گی تو آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات خوفزدہ ہو جائیں گی سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ چاہے اور سب نہایت عاجزی کے ساتھ اس کے حضور پیش ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيَوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ: قیامت سے پہلے کے واقعات کے بعد خود قیامت کا ذکر اس آیت سے

شروع ہوتا ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات میں صور پھونکنے کا ذکر ہے۔ صور میں دو مرتبہ پھونک ماری جائے گی:

وَنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِیۡہِ اُخۡرٰی فَاِذَا ہُمۡ قِیَامٌ یَّنۡظُرُوۡنَ ۝[1]	اور (جب) صور میں میں پھونک ماری جائے گی تو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب بیہوش ہو جائیں گے مگر جنہیں اللہ چاہے، پھر دوبارہ اس میں پھونک ماری جائے گی تو اتنے میں وہ سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔

پہلی پھونک سے آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات مر جائیں گی اور دوسری پھونک سے سب زندہ ہو جائیں گی۔

اس آیہ شریفہ میں فزع قرینہ بن سکتا ہے کہ یہ پہلی پھونک ہے اور وَکُلٌّ اَتَوۡہُ دٰخِرِیۡنَ کہا گیا ہے جو قرینہ بن جاتا ہے کہ دوسری پھونک ہے لیکن میرے نزدیک اَتَوۡہُ دوسری پھونک کے لیے قرینہ نہیں بن سکتا چونکہ موت آنے کو بھی اَتَوۡہُ اللہ کے حضور پیش ہونے کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ جیسے کلمہ استرجاع میں کسی کی موت کے موقع پر اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کہتے ہیں۔ وَیَاۡتِیۡنَا فَرۡدًا[2] سے مراد موت ہی ہو سکتی ہے۔

۲۔ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ: بعض ایسی ہستیاں ہوں گی جو صور پھونکنے کی وجہ سے خوفزدہ نہ ہوں گی۔ چنانچہ اگلی آیت ۸۹ میں صراحت موجود ہے: مِّنۡ فَزَعٍ یَّوۡمَئِذٍ اٰمِنُوۡنَ۔

۳۔ وَکُلٌّ اَتَوۡہُ دٰخِرِیۡنَ: یہ خوف اس قدر ہولناک ہو گا کہ سب کی موت واقع ہو جائے گی۔ یعنی اسی ایک پھونک سے خوفزدہ ہوں گے اور موت بھی واقع ہو جائے گی۔ کیا ایک صور پھونکنے سے خوف زدگی اور موت واقع ہو گی؟ یا دو صور ہیں۔ ایک سے خوف زدہ دوسرے سے موت واقع ہو گی؟

ہمارے نزدیک فزع سے مراد موت یعنی موت کا فزع ہے۔ جیسا کہ سورہ سبا: ۵۱ میں فرمایا:

وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ فَزِعُوۡا فَلَا فَوۡتَ وَ اُخِذُوۡا مِنۡ مَّکَانٍ قَرِیۡبٍ ۝	اور کاش! آپ دیکھ لیتے کہ جب یہ پریشان حال ہوں گے تو بچ نہ سکیں گے اور نزدیک ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔

وَتَرَی الۡجِبَالَ تَحۡسَبُہَا جَامِدَۃً وَّہِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنۡعَ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ ؕ اِنَّہٗ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝۸۸	۸۸۔ اور آپ پہاڑوں کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ ایک جگہ ساکن ہیں جب کہ (اس وقت) یہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوں گے، یہ سب اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو پختگی سے بنایا ہے، وہ تمہارے اعمال سے یقیناً خوب باخبر ہے۔

---

[1] ۳۹ زمر: ۶۸ [2] ۱۹ مریم: ۸۰

تفسیر آیات

۱۔ وَتَرَى الۡجِبَالَ تَحۡسَبُهَا جَامِدَةً: اس آیت میں کیا قیامت کے دن کا ذکر ہے یا زمین کی حرکت کی طرف اشارہ ہے؟ سیاق آیت بتاتا ہے کہ قیامت سے مربوط ہے کہ صور پھونکنے کے بعد ایک کائناتی انقلاب آئے گا جس میں پہاڑ جو ابھی آپ کو ساکن آ نظر رہے ہیں، بادل کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا:

وَّسُيِّرَتِ الۡجِبَالُ فَكَانَتۡ سَرَابًا ۝[1] اور پہاڑ چلا دیے جائیں گے تو وہ سراب ہو جائیں گے۔

۲۔ صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اَتۡقَنَ كُلَّ شَىۡءٍ: یہ کائناتی انقلاب، یہ تخریب و تعمیر اللہ تعالیٰ کی صنعت کاملہ کا ایک حصہ ہے۔ اللہ کے مضبوط اور مستحکم طریقۂ تخلیق و ارتقا کا ایک مرحلہ ہے۔ اَتۡقَنَ كُلَّ شَىۡءٍ ہر چیز کی تخلیق میں انضباط و استواری رکھی ہے۔ کائنات کا یہ انقلاب اسی انضباط کا حصہ ہے۔ نئی کائنات کی تعمیر کے لیے پرانی کائنات کا ملبہ ہٹانا اسی صنعت کاملہ کا تقاضا ہے۔

۳۔ اِنَّهٗ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَفۡعَلُوۡنَ: نفخ صور اور قیام قیامت کا منظر پیش فرمانے کے بعد زمان نزول قرآن سے لے کر تا قیام قیامت کے لوگوں کے لیے خطاب فرمایا: اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ اگر یہ آیت قیامت سے مربوط ہوتی تو بما فعلتم کہتے۔

بعض حضرات نے پوری شد و مد سے اس آیت سے حرکت زمین پر استدلال کیا ہے اور کہتے ہیں جبال کہہ کر پورا کرۂ ارض مراد لیا گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت ایک تخریب برائے تعمیر، ایک انقلاب برائے ارتقاء ہے۔

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيۡرٌ مِّنۡهَا ۚ وَهُمۡ مِّنۡ فَزَعٍ يَّوۡمَئِذٍ اٰمِنُوۡنَ ۝۸۹	۸۹۔ جو شخص نیکی لے کر آئے گا اسے اس سے بہتر اجر ملے گا اور وہ اس دن کی ہولناکیوں سے امن میں ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ: ایسی نیکی کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو نجات کے لیے بنیاد ہے۔ ایسی جامع نیکی جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے چونکہ اس نیکی کی وجہ سے وہ قیامت کی ہولناکیوں سے امان میں ہو گا۔ یہ اس

---

[1] ۷۸ نباء: ۲۰

نیکی کی طرح نہیں ہے جس کا ذکر مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِہَا ...[1] میں آیا ہے۔ وہاں نیکی برائے ثواب کا ذکر ہے۔ یہاں نیکی برائے نجات کا ذکر ہے۔

اسی لیے اس نیکی کے بارے میں بعض روایات میں آیا ہے: یہ کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ ہے اور بعض دیگر مصادر میں آیا ہے اس سے مراد ولایت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے۔ بعض دیگر شیعی مصادر میں آیا ہے کہ اس نیکی سے مراد اللہ کی محبت ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت اسی مضمون پر مشتمل ہے۔

المیزان ولایت علی علیہ السلام کی تفسیر محبت خدا سے کرتے ہیں کہ علی علیہ السلام کی ولایت کا مطلب فنا فی اللّٰہ ہے اور سب سے پہلے فنا فی اللّٰہ کا دروازہ کھولنے والی ذات علی علیہ السلام کی ہے۔

۲۔ فَلَہٗ خَیۡرٌ مِّنۡہَا اگر ہم نیکی کی تفسیر حب اللّٰہ اور فنا فی اللّٰہ سے کرتے ہیں تو اس جملے کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ حب اللّٰہ کا نتیجہ رضائے رب ہے جو سب سے بہتر ہے۔ وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ...[2] اللہ کی طرف سے خوشنودی سب سے بڑھ کر ہے۔

۳۔ وَ ہُمۡ مِّنۡ فَزَعٍ یَّوۡمَئِذٍ اٰمِنُوۡنَ یعنی اس جامع حسنہ کے حامل لوگ قیامت کی ہولناکیوں سے امن میں رہیں گے۔ جیسے فرمایا:

لَا یَحۡزُنُہُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ ...[3]　　انہیں قیامت کے بڑے خوفناک حالات بھی خوفزدہ نہیں کریں گے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو اس نیکی کے درپے ہونا چاہیے جو نجات کی ضامن ہے۔

وَ مَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ فِی النَّارِ ؕ ہَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۰﴾

۹۰۔ اور جو شخص برائی لے کر آئے گا پس انہیں اوندھے منہ آگ میں پھینک دیا جائے گا، کیا تمہیں اپنے کیے کے علاوہ کوئی اور جزا مل سکتی ہے؟

تفسیر آیات

اس سیئۃ (برائی) سے مراد ایک ایسی برائی ہے جو تمام برائیوں کی آماجگاہ ہے جیسے شرک۔ یعنی جو شرک، جس کے ساتھ کوئی نیکی وجود میں نہیں آ سکتی، جیسی برائی لے کر آتا ہے تو اس کا انجام یہ ہو گا اسے اوندھے منہ آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۶۰ (ترجمہ) جو (اللہ کے پاس) ایک نیکی لے کر آئے گا اسے دس گنا (اجر) ملے گا۔
[2] ۹ توبۃ: ۷۲
[3] ۲۱ انبیاء: ۱۰۳

ان دو آیات کی ایک اور تفسیر بھی ہے جو سابقہ تفسیر کے ساتھ متصادم نہیں ہے: یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو صرف حسنہ یا صرف سیئہ برائیاں لے کر آتے ہیں۔ان کا حسنہ غالب ہے یا دوسرے لوگوں کا سیئہ (برائی) غالب ہے:

بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ○ [1]

البتہ جو کوئی بدی اختیار کرے اور اس کے گناہ اس پر حاوی ہو جائیں تو ایسے لوگ اہل دوزخ ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

لیکن جن کے اعمال میں حسنہ اور سیئہ، نیکی اور برائی دونوں مکس ہوں ان کی نجات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔فرمایا:

وَاٰخَرُوۡنَ اعۡتَرَفُوۡا بِذُنُوۡبِهِمۡ خَلَطُوۡا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ○ [2]

اور کچھ دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا انہوں نے نیک عمل کے ساتھ دوسرے برے عمل کو مخلوط کیا، بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے، بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن ہوشیار ہوتا ہے۔اس برائی سے بچنا چاہیے جو تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الۡبَلۡدَةِ الَّذِىۡ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَىۡءٍ‌ وَّاُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ‏ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ (اے رسول! آپ یہ کہیں) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے محترم بنایا اور ہر چیز اسی کی ملکیت ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے رہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ رَبَّ: مشرکین، شہر مکہ کی حرمت کے قائل تھے اور اس گھر کی حرمت کی بنیاد پر وہ عربوں پر اپنی بالادستی قائم رکھتے تھے لیکن جس ذات نے اس شہر اور اس گھر کو یہ حرمت دی اس کی وحدانیت کے قائل نہ تھے۔رسول ﷺ کو حکم ہوا کہ اس عقیدے کی تائید کریں کہ میں اس شہر مکہ کے رب کی عبادت کرتا ہوں۔اسی رب کی عبادت کرتا ہوں جس نے اس شہر کو محترم بنایا۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۸۱ [2] ۹ توبۃ: ۱۰۲

۲۔ الَّذِیۡ حَرَّمَہَا وَ لَہٗ کُلُّ شَیۡءٍ: وہ صرف اسی شہر مکہ کا مالک نہیں ہے جیسا کہ مشرکین اپنے ارباب کو کسی خاص شعبے کے ساتھ محدود کرتے ہیں بلکہ میرا رب ہر شیء کا مالک ہے۔ وہ کل کائنات کا واحد مالک ہے۔

۳۔ وَّ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ: مجھے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ میں اپنے رب کے ہر حکم اور اشارے کو تسلیم کروں اور اس حکم کی تعمیل کروں۔

وَ اَنۡ اَتۡلُوَا الۡقُرۡاٰنَ ۚ فَمَنِ اہۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَہۡتَدِیۡ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ ضَلَّ فَقُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ ﴿۹۲﴾

۹۲۔ اور یہ کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں اس کے بعد جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہی میں چلا جائے اسے کہد یجیے: میں تو بس تنبیہ کرنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَنۡ اَتۡلُوَا الۡقُرۡاٰنَ: اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں۔ کلام اللہ کی شیرینی اور حلاوت تمہارے ذائقہ فطرت کو چکھا دوں چونکہ تلاوت ہی وہ مؤثر ذریعہ تھا جس کے سامنے بڑے بڑے رعونت والے رام ہو جاتے تھے۔؟

۲۔ فَمَنِ اہۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَہۡتَدِیۡ لِنَفۡسِہٖ: اس کلام کی حلاوت چکھنے کے بعد اسے اپنانے، اپنے لیے راہنما بنانے کا مثبت نتیجہ خود اس شخص کو ملے گا، مجھے نہیں۔

۳۔ وَ مَنۡ ضَلَّ: جو اس حلاوت کے چکھنے کے بعد بھی اپنی تلخی شرک پر قائم رہتا ہے اسے ایمان پر مجبور نہیں کرتا ہوں۔ بس میرا کام تنبیہ کرنا، شرک و کفر کے انجام بد سے باخبر کرنا ہے۔

وَ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ سَیُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ فَتَعۡرِفُوۡنَہَا ؕ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۳﴾ ع

۹۳۔ اور کہد یجیے: ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے، عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم انہیں پہچان لو گے اور آپ کا پروردگار تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ: اے رسول ﷺ جو نبوت و رسالت کا مقام آپ کو عنایت ہوا ہے، آپؐ کے ہاتھ حق و باطل میں امتیاز ہوا اور بہت سے لوگ راہ راست پر آگئے، اس پر اللہ کی حمد و ستائش کریں۔

۲۔ سَیُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ فَتَعۡرِفُوۡنَہَا: اللہ مستقبل میں اپنی آیات اس طرح دکھائے گا کہ تم انکار نہ کر سکو گے جیسے خروج دابۃ لیکن اس عدم انکار کا تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے اٰیٰتِہٖ سے مراد اس قسم کی آیات ہوں گی جو ناقابل انکار ہوں گی۔

فَتَعۡرِفُوۡنَہَا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات و معجزات کے سامنے آنے کے بعد ان کی معجزاتی صورت واضح ہو جائے گی۔ سائنسی طور پر نشانیاں روز سامنے آ رہی ہیں اور آتی رہے گی لیکن انہیں دیکھ کر لوگ فَتَعۡرِفُوۡنَہَا کی منزل تک نہیں پہنچ رہے ہیں بلکہ وہ اس کی دوسری توجیہات کرتے ہیں۔

۳۔ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ: تم جن جرائم کا ارتکاب کر رہے ہو اس کا فوری ردعمل نہ ہونے کا یہ مطلب نہ سمجھو کہ اللہ کو تمہارے ان جرائم کی خبر نہیں ہے۔

سُورَةُ الْقَصَصْ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورة المبارکة کا نام القصص اس لیے ہے کہ اس سورہ مبارکہ کی آیت ۲۵ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت شعیب علیہ السلام کو اپنا سارا قصہ سنانے کا ذکر آیا ہے:

فَلَمَّا جَآءَہٗ وَ قَصَّ عَلَیۡہِ الۡقَصَصَ ... جب موسیٰ ان کے پاس آئے اور اپنا سارا قصہ انہیں سنایا۔

احادیث میں اس سورة کا نام طسم القصص بھی ذکر ہوا ہے اور اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں سورہ ہائے شعراء، نمل اور قصص کو الطوسین الثلاث کا نام دیا گیا ہے۔

یہ سورة مکی ہے البتہ بعض مفسرین کہتے ہیں: آیات ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵ مدنی ہیں اور آیۂ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ ... (۸۵) کے بارے میں کہتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام جحفہ پر نازل ہوئی ہے۔

مضامین: اس سورة المبارکة میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیل سے ذکر ہے اور ان مراحل و امتحانات کا بھی ذکر ہے جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گزارا گیا۔ ان صعوبات و مشکلات کا ذکر ہے جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام دوچار رہے چونکہ جب یہ سورہ نازل ہو رہی تھی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی بہت سی صعوبتوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس سورة میں واضح طور پر بتایا کہ اپنے زمانے کے فرعون جیسے بڑے طاغوت کو کس طرح ذلت آمیز شکست دی اور موسیٰ علیہ السلام جیسے بے سر و سامان کو فتح و نصرت عنایت کی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ بنام خدائے رحمٰن رحیم

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ ۱۔ طا، سین، میم۔

طا، سین، میم۔ حروف مقطعات ہیں جو اپنے حبیب کے ساتھ راز و رموز سے متعلق ہیں۔ ان کا تعلق امت قرآن سے نہیں، صرف حامل قرآن سے ہے۔

تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾ ۲۔ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں۔

اس آیت کی تشریح سورہ یوسف اور سورہ شعراء میں ہو چکی ہے۔

نَتۡلُوۡا عَلَیۡکَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰی وَ فِرۡعَوۡنَ بِالۡحَقِّ لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳﴾

۳۔ ہم آپ کو موسیٰ اور فرعون کا واقعہ اہل ایمان کے لیے حقیقت کے مطابق سناتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ نَتۡلُوۡا عَلَیۡکَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰی: ہم آپ کو موسیٰ و فرعون کا واقعہ سناتے ہیں جس میں درس ہے، عبرت ہے، نوید ہے، سنت تاریخ کا فہم اور قوموں کے زوال و عروج کے اسباق ہیں۔

۲۔ بِالۡحَقِّ: یہ قصہ حق اور واقعیت پر مبنی ہے۔ خود ساختہ داستانوں کی طرح نہیں ہے چونکہ واقع منشاء آثار ہوتے ہیں اور حق پر مبنی واقعات درس آموز ہوتے ہیں۔

۳۔ لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ: یہ واقعہ اہل ایمان کے لیے سناتے ہیں چونکہ اس سے درس لینے والے وہی ایمان والے ہوں گے جو فراعنہ قریش کے مقابلے میں کمزور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو تقریباً ایسے حالات سے گزر رہے ہیں جن سے بنی اسرائیل گزر رہے تھے۔

اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَ جَعَلَ اَہۡلَہَا شِیَعًا یَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَۃً مِّنۡہُمۡ یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَہُمۡ وَ یَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۴﴾

۴۔ فرعون نے زمین میں سر اٹھا رکھا تھا اور اس کے باسیوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا، ان میں سے ایک گروہ کو اس نے بے بس کر رکھا تھا، وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑتا تھا اور وہ یقیناً فسادیوں میں سے تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ: فرعون ارض مصر میں اس قدر جابر اور طاغوت بن گیا تھا کہ طاقت کے استعمال کے ساتھ اپنے رعایا کا مذہبی استحصال بھی کرتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو سورج دیوتا، رب اور معبود کا نمائندہ ہونے کے اعتبار سے معبود سمجھتا تھا۔

۲۔ وَ جَعَلَ اَہۡلَہَا شِیَعًا: فرعونی معاشرے میں مصر کے شہری دو نسلوں میں منقسم تھے۔ اقباط اور اسباط۔ مقامی اور حاکم لوگوں کو اقباط اور مہاجر لوگوں کو جو بنی اسرائیلی تھے، اسباط کہتے تھے جو دوسرے نمبر کے شہری شمار ہوتے تھے۔

۳۔ یَسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَۃً مِّنۡہُمۡ : جس گروہ کو بے بس کر دیا تھا وہ بنی اسرائیل تھے۔ ان کی بیٹوں کو وہ ذبح کرتے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔

بائبل کے مطابق فرعون بنی اسرائیل کا مخالف اس لیے ہوا کہ وہ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی آبادی سے گھبرا گیا اور اسے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر جنگ چھڑ جائے تو یہ لوگ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں گے۔ اس لیے بنی اسرائیل کے نوزائیدہ بچوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نجومیوں نے پیشگوئی کی کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہو گا جو فرعون کی حکومت کا خاتمہ کر دے گا مگر اس روایت کا مأخذ اسرائیلی روایت ہے۔

۴۔ نِسَآءَہُمۡ : بعض اہل تحقیق کے مطابق نساء کا لفظ جب ابناء کے مقابلے میں آتا ہے تو اس سے مراد بیٹیاں ہیں جیسے اس آیت میں نساء سے مراد بیٹیاں ہیں، عورت نہیں۔

وَ نُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ نَجۡعَلَہُمۡ اَئِمَّۃً وَّ نَجۡعَلَہُمُ الۡوٰرِثِیۡنَ ۙ﴿۵﴾

۵۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ جنہیں زمین میں بے بس کر دیا گیا ہے ہم ان پر احسان کریں اور ہم انہیں پیشوا بنائیں اور ہم انہی کو وارث بنائیں۔

وَ نُمَکِّنَ لَہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ نُرِیَ فِرۡعَوۡنَ وَ ہَامٰنَ وَ جُنُوۡدَہُمَا مِنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَحۡذَرُوۡنَ ﴿۶﴾

۶۔ اور ہم زمین میں انہیں اقتدار دیں اور ان کے ذریعے ہم فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھا دیں جس کا انہیں ڈر تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ نُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا : یہاں ارادہ تکوینی ہے جو حتمی الوقوع ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حتمی قانون ہے جو لوگ برائے خدا ظلم و ستم کا شکار ہوتے رہے ہیں ان پر اللہ احسان ضرور کرے گا۔ ان تمام مظلوم قوموں کے لیے یہ ایک عظیم بشارت ہے جو عدل و انصاف کی حکومت قائم کرنا اور ظلم و جور کا خاتمہ چاہتی ہیں۔ آگے اس احسان کی نوعیت کا ذکر ہے:

۲۔ نَجۡعَلَہُمۡ اَئِمَّۃً : انہیں اللہ انسانوں کی قیادت کا عہدہ عنایت فرمائے گا۔ امامت، دینی راہنمائی کا مقام ہے: وَ جَعَلۡنٰہُمۡ اَئِمَّۃً یَّہۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا ... [1] خواہ ان کے پاس حکومت ہو یا نہ ہو۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۷۳ (ترجمہ) اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق رہنمائی کرتے تھے۔

۲۔ وَّ نَجۡعَلَہُمُ الۡوٰرِثِیۡنَ: ہم ان مظلوم لوگوں کو وارث بنائیں گے۔ جانے والے کی جگہ لینے والے کو وارث کہتے ہیں۔ یہ وعدہ اگرچہ نزول کے اعتبار سے بنی اسرائیل کے لیے ہے لیکن لفظی عمومیت کے اعتبار سے اس وعدہ کی تطبیق مختلف قوموں پر ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰہِ ۟ۙ یُوۡرِثُہَا مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ ؕ وَ الۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ۝ [۱]

بے شک یہ سرزمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور نیک انجام اہل تقویٰ کے لیے ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَ لَقَدۡ کَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّکۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُہَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ ۝ [۲]

اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔

چنانچہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے کنعانیوں، آموریوں اور ارامیوں کا وارث بنایا جب کہ ان اقوام میں اپنے اپنے زمانے میں بڑے جابر لوگ تھے۔

۳۔ وَ نُمَکِّنَ لَہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ: ہم ان مظلوموں کو زمین پر اقتدار دیں گے۔ تمکین، کسی جگہ قدرت و استقرار کے ساتھ بیٹھنے کو کہتے ہیں۔

۴۔ وَ نُرِیَ فِرۡعَوۡنَ وَ ہَامٰنَ: اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو اسی ذلت و خواری میں مبتلا کریں گے جس کا انہیں خوف تھا۔ فرعون و ہامان جیسے لوگوں کو تخت و تاج سے محروم کریں گے۔

الف: **فرعون**: قدیم نقوش سے بڑے ایوان کی تصویر سامنے آتی ہے جس میں بیٹھ کر مصر کا بادشاہ فیصلے اور احکام صادر کرتا ہے۔ اس میں دیوانہائے حکومت کا اجتماع ہوتا تھا۔ چنانچہ اس بڑے ایوان کو مصری پیرو کہتے تھے جس کا یہود نے فرعوہ یا فرعون کے ساتھ ترجمہ کیا اور بادشاہ کا لقب بھی اسی سے مشتق ہو گیا۔[۳]

ب: ہامان۔ جو (آمن) کا معرب ہے اس نام کی تاریخ بھی فرعون کے نام ہی کی طرح ہے۔ مصر کے سب سے بڑے دیوتا کا نام آمن تھا۔ اس دیوتا کے عبادت خانہ کے متولی (کاہن) کا نام آمن پڑ گیا۔ چنانچہ تاریخ میں آیا ہے:

> معبد آمن کے بڑے کاہن کا نام بھی آمن پڑ گیا جس نے سلسلہ شاہان مصر کے انیسویں خاندان کے دور سے بہت اہمیت حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ دریائے نیل کے بالائی علاقوں پر مسلط ہو گیا اور افواج کی سربراہی اور شہنشاہی خزانے کے انچارج کا عہدہ حاصل کیا اور تمام عبادتگاہوں کے نگران اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز ہو گیا۔[۴]

---

[۱] ۷ اعراف: ۱۲۸ [۲] ۲۱ انبیاء: ۱۰۵

[۳] تاریخ تمدن ول ڈیورینٹ ترجمہ عربی ۲: ۹۳ بحوالہ شبہات و ردود ہادی معرفت [۴] تاریخ مصر تالیف لبرسٹیڈ صفحہ ۵۲۰

واضح رہے عربی اور عبری تلفظ کے فرق کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً عبری تلفظ ابراھم، عمرام، موشی اور یسوع کا عربی تلفظ ابراھیم، عمران، موسیٰ اور عیسیٰ ہے اور آج بھی بہت دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک لفظ دوسری زبان میں جا کر تلفظ کی دوسری شکل اختیار کرتا ہے۔

لہٰذا یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے کہ ھامان نام کا مصر میں کوئی شخص تھا ہی نہیں۔ یہ تو کسی ایرانی بادشاہ کے ایک درباری کا نام ہے اور قرآن نے غلطی سے ھامان کو مصری قرار دیا ہے۔

آیئے ہم اس بات کا مدرک دیکھتے ہیں کہ ایرانی وزیر کا نام ہامان تھا؟ اس کا مدرک و مأخذ صرف اسرائیلی روایات ہیں۔ دیگر کسی مأخذ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

عھد قدیم سفر استیر اصحاح ۳ میں آیا ہے:

> ھامان بن ھمداثا فارسی بادشاہ، خشایارشا جو داریوش کبیر کے بعد تخت و تاج کے مالک بنا، کا وزیر تھا۔ فرعون و موسیٰ علیہ السلام کے صدیوں بعد یہ ھامان بادشاہ کا مقرب تھا۔ بعد میں بادشاہ اس پر ناراض ہوا اور اسے سولی چڑھا دیا اور اس کی جگہ ایک یہودی مرد خای کو وزیر بنا دیا۔

حالانکہ قدیم ایرانی تاریخ میں اس نام کے کسی شخص کا ذکر نہیں ملتا۔ ملاحظہ ہو شبھات و ردود صفحہ ۳۵۲۔

یہ صرف اس توریت کی روایت ہے جو خرافات سے پُر ہے۔ جس میں اللہ پر کذب کا بہتان ہے۔ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ناموس کی اہانت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی کردار کشی ہے۔

اس تحریف شدہ توریت کی روایت کو قرآنی صراحت پر مقدم سمجھا جاتا ہے!!؟ لہٰذا ان تاریخی شواہد کی روشنی میں دو باتیں ثابت ہیں:

اول یہ کہ ھامان (آمن) نام کا ایک فرعونی، صاحب اختیار وزیر تھا۔

دوم یہ کہ ھامان نام کا ایرانی بادشاہ کا کوئی وزیر نہیں تھا اور اگر ایرانی وزیر کا نام ھامان تھا بھی تو اس قرآنی ھامان کے ساتھ کوئی تعارض نہیں ہے۔ قرآنی ھامان، آمن کا معرب ہے اور ایرانی ھامان کا نام ہی ھامان تھا۔

علامہ حسکانی نے شواھد التنزیل میں متعدد طرق سے حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان نقل کیا ہے:

لَتَعْطِفَنَّ الدُّنْيَا عَلَيْنَا بَعْدَ شِمَاسِهَا یہ دنیا اپنی دشمنی دکھانے کے بعد پھر ہماری طرف جھکے گی

عَطْفَ الضَّرُوسِ عَلَى وَلَدِهَا... جس طرح کاٹنے والی اونٹنی اپنے بچے کی طرف جھکتی ہے۔

اس کے بعد آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔[1]

---

[1] نہج البلاغۃ حکمت: ۲۰۹

دوسری روایات میں حضرت علی علیہ السلام اور آئمہ علیہم السلام نے فرمایا: المستضعفین ہم ہیں۔

جابر بن عبداللہ انصاری راوی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا بنی ھاشم انتم المستضعفون المقھورون المستذلون۔[1]	اے بنی ہاشم! میرے بعد تم مستضعف (بے بس) مغلوب اور ناقابل احترام ہوں گے۔

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡہِ فَاَلۡقِیۡہِ فِی الۡیَمِّ وَ لَا تَخَافِیۡ وَ لَا تَحۡزَنِیۡ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡہُ اِلَیۡکِ وَ جَاعِلُوۡہُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۝	۷۔ اور ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ انہیں دودھ پلائیں اور جب ان کے بارے میں خوف محسوس کریں تو انہیں دریا میں ڈال دیں اور بالکل خوف اور رنج نہ کریں، ہم انہیں آپ کی طرف پلٹانے والے اور انہیں پیغمبروں میں سے بنانے والے ہیں۔

تشریح کلمات

الۡیَمِّ : سمندر اور دریا دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی: ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی بھیجی۔ وحی، کلام خفی اور پوشیدہ اشارے کے معنوں میں ہے۔ یہ کلام خفی اگر حروف و اصوات پر مشتمل ہے تو اصطلاح میں بھی وحی کہتے ہیں اور اگر حروف و اصوات کے بغیر صرف معانی و مطالب ذہن میں ڈال دے جائیں تو اسے الہام کہتے ہیں۔ اگر یہ تفہیم کسی کے تخلیقی مرحلے میں اس میں ودیعت کی گئی ہے تو اسے فطرت کہتے ہیں۔ چنانچہ وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ ....[2] میں یہی معنی مراد ہیں۔

مادر موسیٰ کو وحی بمعنی الہام ہوئی ہے۔ یعنی ان کے دل میں یہ باتیں ڈال دی گئیں۔

۲۔ اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ: اسے دودھ پلائیں۔ جب تک فرعون کی طرف سے خطرہ لاحق نہیں ہے اسے اپنے پاس رکھیں اور دودھ پلاتی رہیں۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالنے سے پہلے جتنی مدت ماں کے پاس رکھا گیا، وہ حکم خدا سے رکھا گیا ہے۔

۳۔ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡہِ فَاَلۡقِیۡہِ فِی الۡیَمِّ: جب یہ خوف لاحق ہو جائے کہ فرعونیوں کو اس کے بچے

---

[1] حسکانی۔ شواھد التنزیل ذیل آیت
[2] ۱۶ نحل: ۶۸

کی ولادت کا علم ہو جائے گا اور وہ اسے ذبح کر دیں گے تو اس وقت اسے دریا میں ڈال دیں۔ الْیَمِّ سے مراد یہاں دریائے نیل ہی ہو سکتا ہے چونکہ قصر فرعون دریائے نیل کے ساحل پر واقع تھا۔

تلمود کے مطابق فرعون نے جاسوس عورتیں چھوڑ رکھی تھی جو بنی اسرائیل کے گھروں میں اپنے چھوٹے بچے لے جاتی تھیں اور ان بچوں کو رلا دیتی تھیں تا کہ اگر کوئی بچہ چھپا ہوا ہے تو وہ آواز سن کر روئے اور یوں اس بچے کو حاصل کر کے قتل کروا دیں۔

۴۔ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ: موسیٰ کی زندگی پر خوف نہ کرو اور جدائی کا غم بھی نہ کرو۔

آنے والے خطرات کی صورت میں خوف ہوتا ہے۔ گزشتہ مصیبت پر حزن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں دونوں صورتوں کے لیے تسلی ہے۔ موسیٰ زندگی کے لیے آیندہ خطرات کا خوف نہ کرو اور دریا میں ڈالنے کے بعد جدائی کا غم نہ کرو۔ چونکہ یہ جدائی وقتی ہو گی۔

۵۔ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ: ہم اس بچے کو آپ کی طرف واپس کریں گے۔ آپ بچے کو دریا میں ڈال دیں۔ بچہ آپ کو واپس ملے گا۔ اس یقین دہانی پر مادر موسیٰ کو یقین آنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس الہام کی نوعیت ایسی تھی جس سے ماں کی مامتا کو بچے کی زندگی کے بارے میں یقین آ گیا۔

۶۔ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ: ہم اس بچے کو مرسلین میں سے بنانے والے ہیں۔ اس پیشگوئی اور خوشخبری سے اندازہ ہوتا ہے کہ مادر موسیٰ کو الہام کے ذریعے ملنے والا پیغام ایک خاص نوعیت کے الہام کے ذریعہ تھا نیز یہ بھی ہو سکتا ہے بنی اسرائیل ایک نجات دہندہ رسول کے انتظار میں تھے، مادر موسیٰ کو الہام و دیگر علامات سے معلوم ہوا ہو کہ یہ وہی نبی ہیں جس کے وہ انتظار میں تھے۔

اہم نکات

۱۔ خدا پر توکل اپنے جگر گوشے کو دریا کے حوالے کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ ۸

۸۔ چنانچہ آل فرعون نے انہیں اٹھا لیا تا کہ وہ ان کے لیے دشمن اور باعث رنج بن جائیں، یقیناً فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکر والے خطا کار تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَالْتَقَطَهٗۤ: چنانچہ مادر موسیٰ نے بچے کو حوالہ دریا کر دیا۔ قصر فرعون چونکہ ساحل دریا پر تھا۔ دریا

میں ایک صندوق کو دیکھ کر اس کو اٹھانے کا حکم دیا گیا۔ دیکھا اس صندوق میں ایک بچہ ہے۔ فیصلہ ہوا کہ اس بچے کو پالا جائے۔

۲۔ لِیَکُوۡنَ لَہُمۡ عَدُوًّا: آل فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو اس لیے اٹھایا تھا کہ ان کے لیے مفید ثابت ہو جائے یا اسے بیٹا بنا لیں لیکن ہوا یہ کہ فرعون کے لیے جانی دشمن اور باعث رنج بن گیا۔ گویا وہ اپنے لیے ایک دشمن اور باعث رنج کو اٹھا رہے تھے۔

۳۔ کَانُوۡا خٰطِئِیۡنَ: فرعون اور ہامان، موسیٰ علیہ السلام کو اٹھانے میں خطا کار نہیں تھے بلکہ وہ اس ظلم و ستم میں خطا کار تھے جس کے نتیجے میں فرعون کے دشمن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ہاتھ میں پالیں اور بڑا کریں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنے رسول کو دشمن کے ذریعے تحفظ دیتا ہے۔

۲۔ اللہ اپنے دین کو فرعونیت سے بچانے کے لیے خود فرعونیت کو ذریعہ بناتا ہے۔

وَ قَالَتِ امۡرَاَتُ فِرۡعَوۡنَ قُرَّتُ عَیۡنٍ لِّیۡ وَ لَکَ ؕ لَا تَقۡتُلُوۡہُ ٭ۖ عَسٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ۝۹

۹۔ اور فرعون کی عورت نے کہا: یہ (بچہ) تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو، ممکن ہے یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنا لیں اور وہ (انجام سے) بے خبر تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالَتِ امۡرَاَتُ فِرۡعَوۡنَ: بائبل کا بیان ہے کہ یہ عورت فرعون کی بیٹی تھی لیکن قرآن نے اس کو فرعون کی بیوی قرار دیا ہے چونکہ قرآنی اصطلاح میں امرأۃ فلان سے مراد ہمیشہ بیوی لی جاتی ہے لہٰذا قرآن کی اصلاح کے مطابق یہ فرعون کی بیٹی نہیں، بیوی تھی۔

۲۔ قُرَّتُ عَیۡنٍ لِّیۡ وَ لَکَ ؕ لَا تَقۡتُلُوۡہُ: قصر فرعون میں معلوم ہوتا ہے اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ یہ بچہ اسرائیلی لگتا ہے اسے قتل کر دینا چاہیے۔ فرعون کی زوجہ آگے آتی ہے اور کہتی ہے: لَا تَقۡتُلُوۡہُ اسے قتل نہ کرو۔ یہ بچہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

اللہ نے اس خاتون کے دل میں موسیٰ علیہ السلام کی محبت ڈال دی۔ یہ بھی ایک فضیلت ہے کہ اللہ نے اس خاتون کے دل کو اس لائق بنایا جس میں ایک اولوالعزم پیغمبر کی محبت جاگزیں ہو جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیث ہے:

افضل نساء اهل الجنة اربع خديجة بنت خويلد و فاطمه بنت محمد و مريم بنت عمران و اسية بنت مزاحم امراة فرعون۔ [1]

جنت کی خواتین میں افضل چار عورتیں ہیں: خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمدؐ، مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم جوفرعون کی عورت ہے۔

۴۔ عَسٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا: کہتے ہیں فرعون کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ آسیہ نے کہا: ہم اسی کو بیٹا بنا لیتے ہیں۔

۵۔ وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ: فرعون اور فرعونی یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ ہم اپنے گھر میں اپنے لیے تباہی پال رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ وہ دل افضل ترین قرار پاتا ہے جس میں حب نبی ہو۔

وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا ؕ اِنۡ کَادَتۡ لَتُبۡدِیۡ بِہٖ لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِہَا لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔اور ادھر مادر موسیٰ کا دل بے قرار ہو گیا، قریب تھا کہ وہ یہ راز فاش کر دیتیں اگر ہم نے ان کے دل کو مضبوط نہ کیا ہوتا، تاکہ وہ ایمان رکھنے والوں میں سے ہو جائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا: مادر موسیٰ کا دل خالی ہو گیا۔ اپنے لخت جگر کو دریا کے حوالے کرنے کے بعد بے چینی کی انتہائی حالت میں آنا ماں کی ممتا کا لازمی تقاضا ہے۔

۲۔ اِنۡ کَادَتۡ لَتُبۡدِیۡ بِہٖ: قریب تھا یہ راز فاش کر دیتیں۔ کہتے ہیں: جب موسیٰ علیہ السلام کو دریا کی موجوں کے تلاطم میں دیکھا تو مادر موسیٰ کی چیخ نکلنے والی تھی: ہائے میرا بیٹا! بعض دیگر لوگ کہتے ہیں: جب مادر موسیٰ کو علم ہوا کہ موسیٰ کو فرعون نے پکڑ لیا ہے تو بے صبر ہو گئیں۔

۳۔ لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِہَا: صبر و تحمل کے الہام کے ذریعے اگر ہم قلب مادر موسیٰ کو تقویت نہ دیتے تو وہ اپنی پریشانی کو قابو میں نہیں رکھ سکتی تھیں۔ اس سے مفہوم یہ نکلتا ہے کہ چونکہ ہم نے مادر موسیٰ کے قلب کو تقویت دی تھی اس لیے انہوں نے اس راز کو فاش نہیں کیا۔

۴۔ لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: ہم نے ان کے قلب کو صبر کی قوت دی تاکہ وہ ہمارے وعدے پر ایمان

---

[1] الخصال ۱: ۲۰۵

رکھنے والوں میں سے ہو جائے۔ اس صبر کا باعث وہ ایمان بن رہا ہے جو ہمارے وعدہ اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْكِ (ہم اسے آپ کی طرف واپس کرنے والے ہیں) پر رکھتی تھیں۔

اہم نکات

۱۔ بچے کو حوالہ دریا کرنے کا حکم اللہ کی طرف سے ہونے کے باوجود پریشان ہونا قدرتی بات ہے اور ماں کی مامتا کا تقاضا ہے۔

۲۔ صبر کا بہترین عامل ایمان ہے۔

وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۱

۱۱۔ اور مادر موسیٰ نے ان کی بہن سے کہا: اس کے پیچھے پیچھے چلی جا تو وہ موسیٰ کو دور سے دیکھتی رہیں کہ دشمنوں کو (اس کا) پتہ نہ چلے۔

تشریح کلمات

قُصِّيْهِ: (ق ص ص) القص کے معنی نشان قدم پر چلنے کے ہیں۔ حالات بیان کرنے کو بھی قصہ اسی لیے کہتے ہیں کہ اس میں بھی صاحب قصہ کا تعاقب کیا جاتا ہے۔

جُنُبٍ: (ج ن ب) جنب دور کے معنوں میں ہے۔ اجنبنی کے معنی ہیں مجھے دور رکھو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ: مادر موسیٰ نے ہارون کی بہن سے کہا: قُصِّيْهِ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا اور دیکھ موسیٰ کا تابوت کس سمت جا اور کس کے ہاتھ آ رہا ہے۔ اس بچی کو یہ حکم اس لیے دیا کہ مادر موسیٰ کو اللہ کے وعدے پر یقین تھا کہ دریا دور نہیں لے جائے گا۔ اس بچی کے لیے پیچھا کرنا ممکن رہے گا۔

۲۔ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ: چنانچہ خواہر موسیٰ نے تعاقب کیا تو دیکھا فرعونیوں نے تابوت کو دریا سے اور موسیٰ علیہ السلام کو تابوت سے نکالا۔ عَنْ جُنُبٍ کے ایک معنی یہ کیے گئے ہیں: دور سے دیکھتی رہیں۔ دوسرے معنی یہ بھی کیے ہیں: عَنْ جُنُبٍ ایک جانب سے دیکھتی رہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ اس بچے کے تعاقب میں ہے۔

۳۔ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: دشمن کے شر سے بچنے کے لیے مؤمن کو اپنی فراست استعمال کرنی چاہیے۔

وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ

۱۲۔ اور ہم نے موسیٰ پر دائیوں کا دودھ پہلے سے

قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَیْتٍ یَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾

حرام کر دیا تھا، چنانچہ موسیٰ کی بہن نے کہا: کیا میں تمہیں ایک ایسے گھرانے کا پتہ بتا دوں جو اس بچے کو تمہارے لیے پالیں اور وہ اس کے خیر خواہ بھی ہوں؟

تفسیر آیات

۱۔ وَحَرَّمۡنَا عَلَیۡہِ الۡمَرَاضِعَ: اَلْمَرَاضِعَ مرضعة کی جمع قرار دی جاتی ہے۔ جو دایہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلانے کے لیے بلائی جاتی تھی بچہ اس کی چھاتی سے دودھ نہیں پیتا تھا۔ ہوشیار بہن محل کے آس پاس اپنے بھائی کے حالات پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ جب پتہ چلا کہ بچہ کسی دایہ کا دودھ نہیں پی رہا تو بہن محل پہنچ گئی اور بولی میں ایک شائستہ دایہ تلاش کر سکتی ہوں جو اسے بڑے پیار سے پالے گی۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کو گود میں پہنچ گئے اور خود دشمن ہی سے انہیں تحفظ مل گیا۔ مِنۡ قَبۡلُ سے مراد بہن یا ماں کے پاس آنے سے پہلے۔

۲۔ وَ ہُمۡ لَہٗ نٰصِحُوۡنَ: اور یہ گھرانہ اس بچے کا خیر خواہ بھی ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ بچے کی روحانی نشوونما میں دودھ کا اثر ہوتا ہے۔

۲۔ حَرَّمۡنَا میں تحریم تکوینی ہے۔

فَرَدَدۡنٰہُ اِلٰۤی اُمِّہٖ کَیۡ تَقَرَّ عَیۡنُہَا وَ لَا تَحۡزَنَ وَ لِتَعۡلَمَ اَنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾ الربع ع ۱۴

۱۳۔ (اس طرح) ہم نے موسیٰ کو ان کی ماں کے پاس واپس پہنچا دیا تاکہ ماں کی آنکھ ٹھنڈی ہو جائے اور غم نہ کرے اور یہ جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَرَدَدۡنٰہُ اِلٰۤی اُمِّہٖ: موسیٰ علیہ السلام کی ہوشیار بہن اپنی ماں کو قصر فرعون میں لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ جب اپنی ماں کی خوشبو سونگھی تو بھوک سے نڈھال بچے نے دودھ پینا شروع کیا اور رونا بھی بند کیا۔ کہتے ہیں: فرعون نے مادر موسیٰ سے پوچھا یہ کیسے ہوا کہ اس بچے نے دوسری عورتوں کا دودھ نہیں پیا، صرف تمہارا دودھ قبول کیا؟ مادر موسیٰ نے کہا: چونکہ میں ایک معطر خاتون ہوں۔ میرا دودھ بھی شیریں ہے۔ اس

لیے جب بھی کوئی بچہ لایا گیا اس نے میرا دودھ قبول کیا ہے۔ یہ سن کر فرعون خوش ہوا۔

۲۔ کَیۡ تَقَرَّ عَیۡنُہَا وَ لَا تَحۡزَنَ: موسیٰ علیہ السلام کو ماں کے بغیر بھی تحفظ فراہم ہو سکتا تھا لیکن بچے کی مصلحت کے علاوہ خود ماں کو آنکھوں کو ٹھنڈک دینا اور اپنے لخت جگر کی جدائی کا غم و اندوہ ختم کرنا بھی مقصود تھا۔

۳۔ وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ: اکثر لوگ وعدۂ الٰہی کے لازمی طور پر پورا ہونے والے اس اہم ترین مسئلے کو نہیں جانتے اور وعدۂ الٰہی کے مطابق اپنی سیرت و کردار کو استوار نہیں کرتے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ مادر موسیٰ پر ماں کی مامتا سے زیادہ مہربان ہے۔

۲۔ وعدۂ الٰہی کے برحق ہونے پر یقین بہت سے مسائل کا حل ہے۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ اسۡتَوٰۤی اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور جب موسیٰ رشد کو پہنچ کر تنومند ہو گئے تو ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا اور ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔

تشریح کلمات

اَشُدَّہٗ: (ش د د) سوجھ بوجھ کی عمر کو پہنچنا اشد ہے۔ عقل و ہوشمندی کی عمر کو پہنچا۔ استوی بدنی اعتبار سے مضبوط ہونا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام عقل و ہوشمندی کی عمر کو پہنچ گئے۔ عمر کے اس حصے میں داخل ہونا جس میں انسان رشد عقل کو پہنچ جایا کرتا ہے انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی ضروری ہے۔ البتہ یہ مسئلہ اس نبی سے مربوط ہے کہ وہ کس قسم کے معاشرے کی طرف مبعوث ہو رہا ہے ورنہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے ارشاد ہوا۔ وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا [1] اور ہم نے انہیں بچپن ہی سے حکمت عطا کی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارے میں نبوت کے درجہ پر فائز ہونے کا اعلان کیا۔

۲۔ اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا: ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکمت اور علم عطا کیا۔ پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ حکمۃ واقع بینی اور صائب نظری کو کہتے ہیں۔ حکمت کے مقابلے میں خطا اور غلطی آتی ہے۔ انسان کوئی کام

---

[1] ۱۹ مریم: ۱۲

حکمت و صواب کے مطابق انجام دے رہا ہوتا ہے تو غلطی و اشتباہ سے محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبل از نبوت یہ صلاحیت دے دی۔ اس صلاحیت کے آنے پر علم عنایت فرمایا۔

۴۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس منزل پر فائز ہو گئے جہاں سے وہ حکمت و علم کے اہل ٹھہرے۔ یہ بات ہر اس ہستی کے لیے ہے جو نیکی کی اس منزل پر فائز ہے۔

۱۔ واضح رہے حکمت و علم سے مراد نبوت نہیں ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام ابھی مبعوث نہیں ہوئے۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے قصر میں ہوتی رہی۔ شرک و کفر طغیانی و ستم کے مرکز میں پرورش پائی اس کے باوجود اس ماحول نے آپؑ کی شخصیت، آپ کے افکار پر کوئی اثر نہیں کیا بلکہ آپؑ کے وجود میں صرف اور صرف الٰہی اقدار جا گزیں ہوئیں۔

اہم نکات

۱۔ منصب الٰہی کے لیے کمال عقلی و قوت جسمانی دونوں ضروری ہیں۔

۲۔ حکمت کا سینہ علم کا خزانہ ہوتا ہے۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۫ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۵

۱۵۔ اور موسیٰ شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب شہر والے بے خبر تھے، پس وہاں دو آدمیوں کو لڑتے پایا، ایک ان کی قوم میں سے تھا اور دوسرا ان کے دشمنوں میں سے تھا تو جو ان کی قوم میں سے تھا اس نے اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے موسیٰ کو مدد کے لیے پکارا تو موسیٰ نے اس (دوسرے) کو گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا، پھر موسیٰ نے کہا: یہ تو شیطان کا کام ہو گیا، بے شک وہ صریح گمراہ کن دشمن ہے۔

تشریح کلمات

شِيْعَتِهٖ: (ش ی ع) شیعة الرجل اتباعه وانصاره۔ کسی شخص کی پیروی اور اس کی نصرت کرنے والوں کو اس کا شیعہ کہتے ہیں۔ (القاموس) شیعة الرجل اصحابه۔

وکز: (و ك ز) الوکز کے معنی دھکا دینے اور مکا مارنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَدَخَلَ الْمَدِیْنَةَ: فرعون کا قصر لب دریا، شہر سے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں داخل ہوئے۔

۲۔ عَلٰی حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا: جب شہر والے بے خبری کے عالم میں تھے۔ یہ مغرب و عشا کا درمیانی وقت تھا یا ظہر کے آرام کا وقت یا صبح کا وقت؟ اس کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہرحال ایک ایسا وقت تھا جس میں لوگ گھروں میں ہوا کرتے تھے۔

۳۔ فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ: دیکھا دو شخص آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شیعہ تھا۔ مِنْ شِیْعَتِهٖ یعنی ممن شایعة علی دینه اپنے دین میں ان کی پیروی کرنے والا تھا۔ دوسرا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن تھا۔ ان دونوں لڑنے والوں میں سے ایک اسرائیلی تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم و ملت سے ہے اور دوسرا قبطی فرعونی تھا۔ کہتے ہیں یہ فرعون کے قصر کا نانبائی تھا اور اسرائیلی کو لکڑیاں اٹھانے پر مجبور کر رہا تھا۔

اس اسرائیلی کو موسیٰ علیہ السلام کا شیعہ قرار دینے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مصر میں اسرائیلی موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم و ملت کے ایک راہنما کے طور پر جانتے تھے۔ بنی اسرائیل اگرچہ مصریوں کے ساتھ بت پرستی کرتے تھے تاہم وہ اپنے آبا و اجداد کی طرف منسوب تھے۔ دین ابراہیمی کو مانتے تھے۔

ابن اسحاق کے مطابق بنی اسرائیل میں کچھ لوگ ایسے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں سنتے اور ان کی پیروی کرتے اور ان سے ملتے رہتے تھے۔[1]

۴۔ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ: موسیٰ علیہ السلام کا یہ شیعہ چونکہ مظلوم واقع ہو رہا تھا موسیٰ کو دیکھ کر اس نے مدد طلب کی۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے کیسے پکارا جو خود فرعون کے گھر کے ایک فرد کی طرح ہیں؟ دوسرا قبطی تو بقول بعضے اس کی روٹی پکانے والا نوکر تھا۔ موسیٰ علیہ السلام گھر کا ایک فرد تھے۔ جب گھر کا خادم کسی بیرونی شخص سے لڑ رہا ہے تو خادم کو چاہیے تھا وہ اپنے مخدوم سے مدد طلب کرے تو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محلات چھوڑ چکے تھے اور اسرائیلی موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ایک راہنما کے طور پر جاننے لگے تھے؟ اگلی آیات سے اس کا کسی حد تک جواب مل سکتا ہے۔

۵۔ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰی: موسیٰ علیہ السلام نے ایک گھونسا مارا جس سے وہ قبطی فرعونی مر گیا۔ گھونسے سے عام حالات میں آدمی نہیں مرتا لیکن وہ فرعونی مر گیا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پریشانی ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو عمداً نہیں مارا تھا جیسا کہ بائبل کہتی ہے۔

---

[1] الکشف والبیان ۷: ۲۴۰۔ معالم التنزیل بغوی ۲: ۵۲۶

۶۔ قَالَ هٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ: یہ لڑائی شیطان کا کام تھا جس کے نتیجے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مداخلت کرنا پڑی اور قبطی کے قتل کی نوبت آئی۔ یہ قتل غیر مناسب وقت میں واقع ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ قتل ایک آزمائش بن گیا۔ منشائے خداوندی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آزمائشی مرحلے سے گزرنا تھا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنے برگزیدہ مرسلین کو سخت ترین آزمائشی مراحل سے گزارتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡ لِیۡ فَغَفَرَ لَہٗ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ کہا: پروردگارا! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا پس مجھے معاف فرما چنانچہ اللہ نے انہیں معاف کر دیا یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

اس اعتبار سے ظلم بہ نفس ہوا کہ اس قتل سے یا اس شہر میں بے وقت داخل ہو کر حضرت موسیٰ نے اپنے آپ کو جانی خطرے میں ڈال دیا اور مغفرت سے مراد یہ ہے کہ اس خطرے سے نجات دلا دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس لغزش کے اثرات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مترتب ہونے نہیں دیے۔ انہیں نجات دی۔

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ فَلَنۡ اَکُوۡنَ ظَہِیۡرًا لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ موسیٰ نے کہا: میرے رب! جس نعمت سے تو نے مجھے نوازا ہے اس کے باعث میں آئندہ کبھی بھی مجرموں کا پشت پناہ نہیں بنوں گا۔

تفسیر آیات

مجرمین کا اشارہ فرعون اور قوم فرعون کی طرف ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے نظام کا بظاہر حصہ بنے ہوئے تھے۔ بعض نے مجرمین سے مراد اسرائیلی لیا ہے جو درست نہیں ہے۔ اسرائیلی مجرم نہ تھا۔ وہ تو مظلوم تھا جس کی اعانت ہونی چاہیے تھی اور نہ قبطی کو گھونسا مارنا جرم تھا چونکہ قتل کا قصد نہیں تھا۔ اس گھونسے کا مقصد مظلوم کا دفاع کرنا تھا۔

فَاَصۡبَحَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ خَآئِفًا

۱۸۔ موسیٰ صبح کے وقت شہر میں ڈرتے ہوئے اور

يَتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسۡتَنۡصَرَہٗ بِالۡاَمۡسِ يَسۡتَصۡرِخُہٗ ؕ قَالَ لَہٗ مُوۡسٰۤی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۸﴾

خطرہ بھانپنے کی حالت میں تھے، اچانک دیکھا کہ جس نے کل مدد مانگی تھی وہ آج پھر اس (موسیٰ) سے فریاد کر رہا ہے، موسیٰ نے اس سے کہا: تو یقیناً صریح گمراہ شخص ہے۔

فَلَمَّاۤ اَنۡ اَرَادَ اَنۡ يَّبۡطِشَ بِالَّذِیۡ ہُوَ عَدُوٌّ لَّہُمَا ۙ قَالَ يٰمُوۡسٰۤی اَتُرِيۡدُ اَنۡ تَقۡتُلَنِیۡ کَمَا قَتَلۡتَ نَفۡسًۢا بِالۡاَمۡسِ ٭ۖ اِنۡ تُرِيۡدُ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ جَبَّارًا فِی الۡاَرۡضِ وَمَا تُرِيۡدُ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ جب موسیٰ نے اس شخص پر ہاتھ ڈالنا چاہا جو ان دونوں کا دشمن تھا تو اس نے کہا: اے موسیٰ! کیا تم مجھے بھی اسی طرح قتل کر دینا چاہتے ہو جس طرح کل تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا؟ کیا تم زمین میں جابر بننا چاہتے ہو اور اصلاح کرنا نہیں چاہتے؟

تفسیر آیات

۱۔ فَاَصۡبَحَ فِی الۡمَدِيۡنَۃِ خَآئِفًا: پھر وہ شہر میں ڈرتے ہوئے خطرہ بھانپنے کی حالت میں ہو گئے۔ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قصر فرعون میں نہیں ہیں۔ کل کا قتل غیر معمولی تھا۔ اپنی غلام قوم اسرائیل کے ہاتھوں قبطی کا قتل۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک بہت بڑے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں اور يَتَرَقَّبُ سے معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہیں کہ اگلے لمحوں میں ان کے خلاف کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ فَاِذَا الَّذِی اسۡتَنۡصَرَہٗ بِالۡاَمۡسِ: اتنے میں کل جس نے مدد مانگی تھی آج وہ پھر موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کر رہا ہے۔ وہ شخص کسی اور سے دست بہ گریباں ہے اور موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔

۳۔ قَالَ لَہٗ مُوۡسٰۤی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِيۡنٌ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص سے کہا: تم بڑے فسادی ہو۔ ایسے لوگوں سے لڑتے ہو جس کا نتیجہ ظلم اور زیادتی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ غوی گمراہ ہونے اور فساد کرنے کو کہتے ہیں۔

۴۔ فَلَمَّاۤ اَنۡ اَرَادَ اَنۡ يَّبۡطِشَ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی پر حملہ کرنا چاہا۔ یہ قبطی ان دونوں اسرائیلیوں کا دشمن تھا اور اسرائیلی کو اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فسادی کہا لیکن وہ تھا تو مظلوم۔ اس وجہ سے اس کے دفاع کے لیے آگے بڑھنا ایک فطری امر تھا۔

۵۔ قَالَ یٰمُوۡسٰۤی اَتُرِیۡدُ اَنۡ تَقۡتُلَنِیۡ: اس قبطی نے کہا: اے موسیٰ! کیا تم مجھے اسی طرح قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح کل ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے گزشتہ روز کے قتل کی خبر شہر میں پھیل گئی تھی اور یہ بات کرنے والا اسرائیلی نہیں ہو سکتا جیسا کہ توریت کا خیال ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی پر نہیں، قبطی پر حملہ کرنا چاہتے تھے اور قبطی ہی عَدُوٌّ لَّهُمَا ان دونوں (موسیٰ علیہ السلام اور اسرائیلی) کا دشمن تھا۔ اسرائیلی تو صرف قبطی کا دشمن تھا، دونوں کا دشمن نہیں تھا۔

۶۔ اِنۡ تُرِیۡدُ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ جَبَّارًا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قبطی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شناخت تھی اور لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو داعی اصلاح کے طور پر جانتے تھے۔ ممکن ہے اس لیے کہا ہو: اے موسیٰ! تم اصلاح کے داعی نہیں، جابر اور زیادتی کرنے والے ہو۔

وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِیۡنَۃِ یَسۡعٰی ۫ قَالَ یٰمُوۡسٰۤی اِنَّ الۡمَلَاَ یَاۡتَمِرُوۡنَ بِکَ لِیَقۡتُلُوۡکَ فَاخۡرُجۡ اِنِّیۡ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیۡنَ ﴿۲۰﴾	۲۰۔ شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، کہنے لگا: اے موسیٰ! دربار والے تیرے قتل کے مشورے کر رہے ہیں، پس (یہاں سے) نکل جا میں تیرے خیر خواہوں میں سے ہوں۔

تشریح کلمات

یَاۡتَمِرُوۡنَ: (ا م ر) الائتمار کے اصل معنی حکم بجا لانے کے ہیں اور تشاور باہم مشورہ کرنے کو بھی ائتمار کہا جاتا ہے کیونکہ مشورہ میں بھی ایک دوسرے کا حکم قبول کیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِیۡنَۃِ: شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ یہ شخص حزقیل ہی ہو سکتے ہیں جنہیں قرآن نے مومن آل فرعون کہا ہے جو اپنا ایمان چھپائے رکھتے تھے۔ فرعون کا قصر شہر کے کنارے واقع تھا۔ وہاں سے شہر میں دوڑ کر آیا۔ اس سے بھی عندیہ ملتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قصر فرعون میں نہیں رہتے تھے، کم سے کم ان دو دنوں میں۔ یہ شخص فرعون کے خاندان سے متعلق تھا۔ یَسۡعٰی دوڑتا ہوا آیا، سے معلوم ہوتا ہے خطرہ بالکل سر پر ہے۔ اس لیے اس مؤمن کو دوڑ کر خبر لانا پڑی کہ ایسا نہ ہو خبر ملنے سے پہلے فرعونیوں کی گرفت میں آجائیں۔

۲۔ اِنَّ الۡمَلَاَ یَاۡتَمِرُوۡنَ بِکَ: دربار والے آپ کے قتل کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مومن فرعون کا بھیدی تھا یا اس منصوبہ بندی کرنے والوں میں شریک تھا۔

۳۔ فَاخۡرُجۡ اِنِّیۡ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیۡنَ: اس مومن کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تحفظ کا واحد ذریعہ ہجرت تھا۔ فَاخۡرُجۡ کہہ کر مومن ہجرت کا مشورہ دیتا ہے۔ اس مومن کا نام روایت میں حزقیل آیا ہے۔ حضرت حزقیل کو یہ شرف اور فضیلت حاصل ہوئی کہ ایک اولوالعزم رسول کو تحفظ فراہم کیا۔ چنانچہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

الصدیقون ثلاثۃ حبیب بن موسی النحار مؤمن آل یاسین و حزقیل مؤمن آل فرعون و علی بن ابی طالب الثالث و ھو افضلھم۔[1]

صدیق تین ہیں۔ حبیب بن موسیٰ نجار مومن آل یاسین، حزقیل مومن آل فرعون تیسرے علی بن ابی طالب جو ان میں افضل ہیں۔

اس حدیث کے راوی ہیں: ابن ابی لیلی، ابن عباس، ابو ایوب انصاری۔ افضل المرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کی شب بستر رسولؐ پر سو کر اپنی جان کا نذرانہ دینے والے صدیق کا ان سب صدیقوں سے افضل ہونا قدرتی امر ہے۔

فَخَرَجَ مِنۡہَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ چنانچہ موسیٰ ڈرتے ہوئے خطرہ بھانپتے ہوئے وہاں سے نکلے، کہنے لگے: اے میرے پروردگار! مجھے قوم ظالمین سے بچا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَخَرَجَ مِنۡہَا: اس مومن کے مشورے کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر سے نکل جاتے ہیں۔ خَآئِفًا حالت خوف میں نکلے چونکہ فرعونی ان کے تعاقب میں تھے اور حضرت حزقیل کا دوڑتے ہوئے آنا بتاتا ہے کہ خطرہ بالکل سر پر تھا۔

ایک شاعر نے کہا تھا:

خرج الحسین من المدینۃ خائفا
کخروج موسی خائفا یترقب

حسینؑ مدینہ سے موسیٰ کی طرح خوف اور خطرہ بھانپتے ہوئے نکلے۔

تو ہمارے ہندوستانی عالم نے اس شعر کی اصلاح کی:

خرج الحسین من المدینۃ باسلا
لا مثل موسی خائفا یترقب

---

[1] بشارۃ المصطفی ص ۲۰۸

حسین مدینہ سے بہادرانہ نکلے حضرت موسیٰ کی طرح
خوف اور خطرہ بھانپتے ہوئے نہیں نکلے۔

۲۔ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ: ظالم قوم سے نجات کی دعا سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قبطی کا قتل موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ظلم نہ تھا بلکہ اس قتل کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ ظالمانہ تھا۔

اہم نکات

۱۔ ہجرت، انبیاء علیہم السلام کی سیرت ہے۔

وَ لَمَّا تَوَجَّہَ تِلۡقَآءَ مَدۡیَنَ قَالَ عَسٰی رَبِّیۡۤ اَنۡ یَّہۡدِیَنِیۡ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور جب موسیٰ نے مدین کا رخ کیا تو کہا: امید ہے میرا پروردگار مجھے سیدھے راستے کی ہدایت فرمائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین کی طرف رخ کیا۔ مدین کے بارے میں الاعراف آیت ۸۵ ملاحظہ فرمائیں۔ آیت کے سیاق سے تو یہ عندیہ ملتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قصداً مدین کا رخ کیا تھا۔ تَوَجَّہَ رخ کیا تِلۡقَآءَ مَدۡیَنَ مدین کی جانب۔

کہتے ہیں: مصر اور مدین کے درمیان آٹھ سو پچاس میل کا فاصلہ ہے۔[1] کیا مصر اور البدع جو خلیج عقبہ کے مغربی ساحل پر واقع، کے درمیان یہی مسافت ہے؟ چونکہ کہتے ہیں مدین وہی البدع ہے۔

۲۔ قَالَ عَسٰی رَبِّیۡۤ: چنانچہ اللہ نے انہیں سیدھے راستے کی راہنمائی فرمائی۔ جو راستہ مدین کو جاتا تھا۔ مدین کا علاقہ فرعون کی سلطنت میں شامل نہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا یہ تھی: مدین پہنچنے کے لیے سیدھے راستے کی راہنمائی فرما۔

وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدۡیَنَ وَجَدَ عَلَیۡہِ اُمَّۃً مِّنَ النَّاسِ یَسۡقُوۡنَ ۬۫ وَ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِہِمُ امۡرَاَتَیۡنِ تَذُوۡدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطۡبُکُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسۡقِیۡ

۲۳۔ اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا لوگوں کی ایک جماعت (اپنے جانوروں کو) پانی پلا رہی ہے اور دیکھا ان کے علاوہ دو عورتیں (اپنے جانور) روکے ہوئے کھڑی ہیں، موسیٰ نے کہا: آپ دونوں کا کیا مسئلہ ہے؟ وہ دونوں بولیں:

حَتّٰی یُصۡدِرَ الرِّعَآءُ ۔۔۔ وَ اَبُوۡنَا شَیۡخٌ کَبِیۡرٌ ﴿۲۳﴾

جب تک یہ چرواہے (اپنے جانوروں کو لے کر) واپس نہ پلٹ جائیں ہم پانی نہیں پلاسکتیں اور ہمارے والد بڑی عمر کے بوڑھے ہیں۔

تشریح کلمات

وَرَدَ : (و ر د) اصل میں ورد کے معنی پانی کا قصد کرنے کے ہیں۔ پھر ہر جگہ کا قصد کرنے پر بولا جاتا ہے۔

تَذُوۡدٰ : (ذ و د) ذود کے معنی کسی چیز سے دفع کرنے کے ہیں۔

الرِّعَآءُ : (ر ع ی) عام طور پر یہ لفظ حفاظت اور حسن انتظام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ رعاء، راعی کی جمع ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدۡیَنَ : جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین پہنچ گئے تو اس علاقے کے کنویں کے پاس پہنچے۔ مدین اس زمانے میں مصر کا قریب ترین علاقہ تھا۔ یہ جگہ آج کل البدع کے نام سے مشہور ہے جو خلیج عقبہ کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔

۲۔ وَجَدَ عَلَیۡہِ اُمَّۃً مِّنَ النَّاسِ : دیکھا لوگوں کی ایک جماعت اپنے جانوروں کو پانی پلا رہی ہے۔ آیت میں صرف پلانے کا ذکر ہے، جانوروں کا ذکر نہیں ہے۔ بعد میں آنے والے الرِّعَآءُ چرواہے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانوروں کو پلا رہے تھے۔

۳۔ وَ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِہِمُ امۡرَاَتَیۡنِ : ان کے علاوہ دو عورتوں کو دیکھتے ہیں جو اپنے جانوروں کو روکے ہوئے ہیں۔ پانی پینے سے روک رہی ہیں۔ دوسرے لوگ کنویں سے پانی نکال کر اپنے اپنے جانوروں کو پلا رہے تھے۔ ان دو عورتوں کے جانور بھی پانی کی طرف لپکتے تھے لیکن یہ دونوں اپنے جانوروں کو دوسروں کے پانی کی طرف جانے سے روک رہی ہیں۔

۴۔ قَالَ مَا خَطۡبُکُمَا : حضرت موسیٰ علیہ السلام ان دونوں سے پوچھتے ہیں: تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تمہارے جانور دوسرے جانوروں کے ساتھ پانی کیوں نہیں پی رہے؟

۵۔ قَالَتَا لَا نَسۡقِیۡ حَتّٰی یُصۡدِرَ الرِّعَآءُ : دونوں عورتوں نے جواب میں کہا: جب تک یہ چرواہے واپس پلٹ نہ جائیں ہم پانی نہیں پلاسکتیں۔

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ دونوں خواتین پاکیزہ نفس کے مالکہ تھیں۔ مردوں کے ہجوم میں دھکے کھانے کی نوبت آتی تھی اس لیے ان کے واپس جانے کا انتظار کرتی تھیں۔

۱؎ التحریر و التنویر ۲۰: ۳۷

دوسری تفسیر یہ ہے کہ لوگ کنویں سے پانی نکال کر جانوروں کو پلاتے تھے۔ یہ دونوں خواتین مردوں کی طرح پانی نہیں نکال سکتی تھیں۔ اس لیے ان کے واپس جانے کا انتظار کرتیں اور بچے کھچے پانی سے اپنے جانوروں کو سیراب کرتی تھیں۔

۶۔ وَ اَبُوۡنَا شَیۡخٌ کَبِیۡرٌ: گھر میں مرد صرف ایک باپ ہیں، وہ بھی عمر رسیدہ ہیں۔ وہ سبب اور وجہ بیان کر رہی ہیں جس سے ان کی یہ حالت ہے۔

سفر تکوین میں آیا ہے کہ ان دونوں کے والد مدین کے کاہن تھے۔ اس میں پہلی مرتبہ تو ان کاہن کا نام رعویل بتایا، پھر اس کا دوبارہ ذکر ہوا تو ان کا نام یثرون بتایا اور انہیں موسیٰ علیہ السلام کا حامی بتایا ہے۔[1]

ابن العبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

> یثرون بن رعویل کی سات بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے دو جانوروں کو پانی پلانے کے لیے نکلی تھیں۔ پس شعیب وہی شخصیت ہیں جنہیں یہود یثرون کہتے ہیں اور نبی کو کاہن کہنا ان کے اصطلاح ہے چونکہ کاہن بھی غیب کی خبر دینے کے مدعی ہوتے ہیں۔[2]
>
> ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات کے مطابق بھی یہ بزرگوار حضرت شعیب علیہ السلام ہی تھے۔

فَسَقٰی لَہُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤی اِلَی الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ موسیٰ نے ان دونوں (کے جانوروں) کو پانی پلایا پھر سائے کی طرف ہٹ گئے اور کہا: میرے مالک! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَسَقٰی لَہُمَا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر ان دونوں خواتین کے جانوروں کو پانی پلایا۔ حضرت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پاکیزہ طبیعت کا یہی تقاضا تھا کہ کمزوروں اور مظلوموں کی مدد کے لیے لپکیں۔ مصر سے اسی جذبہ ایثار کی وجہ سے ہجرت کرنا پڑی۔

۲۔ ثُمَّ تَوَلّٰۤی اِلَی الظِّلِّ: سفر کی خستگی اور گرسنگی سے گرمی کی شدت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے ان جانوروں کو پانی پلانے کے بعد سائے کی طرف لوٹ آئے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی حالت نہج البلاغۃ میں بیان ہوئی ہے۔

۳۔ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ: میرے پروردگار! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل

---

[1] التحریر والتنویر ۲۰: ۴۰ [2] حوالہ سابق

فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔ روایات کے مطابق یہاں خیر سے مراد طعام ہے۔ انداز طلب میں انتہائی نرمی ہے چونکہ خواہ انتہائی مجبوری ہی کیوں نہ ہو سوال دنیاوی مسئلے کا ہے۔ اگر اخروی مسئلہ ہوتا تو اصرار کے ساتھ مانگتے۔

مروی ہے کہ دنیا کی مذمت کے سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَ اللّٰہِ مَا سَاَلَہٗ اِلَّا خُبْزاً یَاْکُلُہٗ لِاَنَّہٗ کَانَ یَاْکُلُ بَقْلَۃَ الْاَرْضِ وَ لَقَدْ کَانَتْ خُضْرَۃُ الْبَقْلِ تُرَی مِنْ شَفِیفِ صِفَاقِ بَطْنِہٖ لِھُزَالِہٖ وَ تَشَذُّبِ لَحْمِہٖ۔[1]	خدا کی قسم! انہوں نے صرف کھانے کے لیے روٹی کا سوال کیا تھا چونکہ وہ زمین کا ساگ پات کھاتے تھے اور لاغری اور (جسم پر) گوشت کی کمی کی وجہ سے ان کے پیٹ کی نازک جلد سے گھاس پات کی سبزی دکھائی دیتی تھی۔

اہم نکات

۱۔ انتہائی گرسنگی کی حالت میں بھی طعام کا سوال اللہ سے ہونا چاہیے۔

۲۔ محروموں کی کمک کرنا سیرت انبیاء علیہم السلام ہے۔

فَجَآءَتۡہُ اِحۡدٰىہُمَا تَمۡشِیۡ عَلَی اسۡتِحۡیَآءٍ ۫ قَالَتۡ اِنَّ اَبِیۡ یَدۡعُوۡکَ لِیَجۡزِیَکَ اَجۡرَ مَا سَقَیۡتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَہٗ وَ قَصَّ عَلَیۡہِ الۡقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفۡ ٝ نَجَوۡتَ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۵﴾	۲۵۔ پھر ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک حیا کے ساتھ چلتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی اور کہنے لگی: میرے والد آپ کو بلاتے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے جانوروں کو جو پانی پلایا ہے اس کی اجرت آپ کو دیں، جب موسیٰ ان کے پاس آئے اور اپنا سارا قصہ انہیں سنایا تو وہ کہنے لگے: خوف نہ کرو، تم اب ظالموں سے بچ چکے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ فَجَآءَتۡہُ اِحۡدٰىہُمَا تَمۡشِیۡ عَلَی اسۡتِحۡیَآءٍ: ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی حیا کے ساتھ چلتی ہوئی موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی۔ شرم و حیا عورت کی زینت ہے۔ فطرت سلیمہ کی مالک خاتون مردوں سے شرم جیسی نسوانی اعلیٰ قدروں کی مالکہ ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ در حقیقت کے سائے میں اکیلے تھے۔ اس اکیلے مرد کے نزدیک آنے میں شرم و حیا کرنا ایک پاکیزہ ماحول کی پلی بچی کے لیے قدرتی بات ہے۔

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۱۶۰

۲۔ قَالَتۡ اِنَّ اَبِیۡ یَدۡعُوۡکَ لِیَجۡزِیَکَ اَجۡرَ: اس نامساعد ترین حالت میں جو امید اللہ تعالیٰ سے وابستہ کر رکھی تھی وہ بر آئی اور کڑی آزمائش کی گھڑی ختم ہونے والی ہے۔ جب اس لڑکی نے کہا کہ آپ کو میرے والد بلاتے ہیں تا کہ آپ نے ہمارے جانوروں کو جو پانی پلایا ہے اس کی اجرت آپ کو دیں تو ضرور سوچا ہو گا ان عظیم قدروں کا مالک، اہم شخصیت کا مالک ہو گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لڑکی کے ساتھ چل پڑتے ہیں لیکن لڑکی کے پیچھے چلنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

فَاِنَّا بَنُو یَعۡقُوبَ لَا نَنۡظُرُ فِی اَعۡجَازِ النِّسَآءِ الۡخَبَرَ۔[1] ہم اولاد یعقوب عورتوں کی پشت پر نظر نہیں ڈالتے۔

چنانچہ اس لڑکی کا یہ کہنا کہ یہ شخص قوی اور امین ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس قسم کی امانت کا مظاہرہ یقیناً ہوا ہو گا۔

۳۔ فَلَمَّا جَآءَہٗ وَقَصَّ عَلَیۡہِ الۡقَصَصَ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بزرگ کو اپنے سارے حالات بتا دیے کہ وہ قتل کے خوف سے مصر سے بھاگ کر یہاں پہنچے ہیں تو اس بزرگ نے کہا:

لَا تَخَفۡ ٝ نَجَوۡتَ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ: ہماری سرزمین پر فرعون کی حکومت نہیں ہے۔ بقول بعض اس وقت مدین پر کنعانی بادشاہ کی حکومت تھی۔

اس مرحلے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری دعائیں قبول ہوئیں اور فرعون جیسے دشمن سے نجات مل گئی۔

یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے مراحل میں سے ایک اہم مرحلہ طے ہو گیا۔ یہ مرحلہ قبطی کے قتل سے شروع ہوا اور نجات کی اس خوشخبری پر ختم ہوا۔

اہم نکات

۱۔ شرم و حیا عورت کی نسوانیت کے لیے اہم ترین زینت ہے۔

۲۔ حاجت مند کی حاجت پوری کرنے کے بعد اللہ سے اپنی حاجت کا سوال ہونا چاہیے۔

۳۔ رضاکارانہ کمک کے باوجود اجرت قبول کرنے میں حرج نہیں ہے۔

قَالَتۡ اِحۡدٰىہُمَا یٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡہُ ۫ اِنَّ خَیۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِیُّ الۡاَمِیۡنُ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکی نے کہا: اے ابا! اسے نوکر رکھ لیجیے کیونکہ جسے آپ نوکر رکھنا چاہیں ان میں سب سے بہتر وہ ہے جو طاقتور، امانتدار ہو۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۴: ۲۷۴ باب کراھۃ النظر فی ادبار النساء۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَتۡ اِحۡدٰىهُمَا: ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے کہا: اے ابا اسے نوکر رکھ لیجیے۔ یہ درخواست کرنے والی لڑکی وہی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلانے گئی تھی چونکہ اسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امانت کا مشاہدہ کیا تھا۔

۲۔ اِنَّ خَیۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِیُّ الۡاَمِیۡنُ: قوت کا اندازہ چاہ سے پانی نکالتے وقت کر لیا تھا اور امانت کا مشاہدہ ان کے ہمراہ گھر آتے ہوئے کیا تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خاتون کے پیچھے چلنے سے پرہیز کیا تاکہ ان کے جسم پر نگاہ نہ پڑے۔

قوت اور امانت دو ایسی طاقتیں ہیں جن سے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ امانت کے بغیر طاقت سرکش اور مفسد ہو جاتی ہے اور طاقت کے بغیر امانت کے نفاذ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کمزور کی امانت کے نتائج نہیں ہوتے۔

اہم نکات

۱۔ افراد خانہ مرد یا عورت، سربراہ خانہ کو اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں مشورہ دے سکتے ہیں۔

قَالَ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡکِحَکَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ ہٰتَیۡنِ عَلٰۤی اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِکَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اَشُقَّ عَلَیۡکَ ؕ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ (شعیب نے) کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح اس شرط پر تمہارے ساتھ کروں کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو اور اگر تم دس (سال) پورے کرو تو یہ تمہاری طرف سے (احسان) ہے اور میں تمہیں تکلیف میں ڈالنا نہیں چاہتا، انشاء اللہ تم مجھے صالحین میں پاؤ گے۔

تشریح کلمات

حِجَجٍ: (ح ج ج) الحجۃ سال کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع حجج ہے۔ چونکہ سال میں ایک مرتبہ حج ہوتا ہے اس لیے سال کو حجۃ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡکِحَکَ: آٹھ سال نوکری کرنے کی شرط عقد کے ضمن میں نہیں ہے۔ یہ عبارت عقد نکاح کی نہیں بلکہ واقعے کا بیان ہے چونکہ اس عبارت میں کسی ایک بیٹی کا تعین نہیں ہے نیز باپ کی نوکری کرنا بیٹی کا مہر قرار دینا بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا یہ فرمان بیان فرمایا:

هُوَ حَرَامٌ لِاَنَّهُ ثَمَنُ رَقَبَتِهَا وَ هِيَ اَحَقُّ بِمَهْرِهَا۔[1]

مہر عورت کا حق ہے، یہ حق عورت کو نہ ملے، کوئی اور اس سے فائدہ اٹھائے، جائز نہیں ہے۔

اس آیت سے کسی فقہی حکم کا استنباط نہیں ہوسکتا چونکہ آیت کسی فقہی مسئلہ کے بیان کے درپے نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آیت "مقام بیان" میں ہو۔

۲۔ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِکَ: اس کا مطلب یہ ہوا کہ آٹھ سال نوکری لازمی ہے۔ دو سال موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے رضاکارانہ ہو سکتے ہیں۔ یہ عقد نکاح سے الگ ایک معاہدہ ہوسکتا ہے جس میں یہ مصلحت کارفرما تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دس سال تک مدین میں رہنا ضروری تھا کہ مصر کی حکومت میں تبدیلی آجائے گی اور مصر جانا ممکن ہو جائے گا۔

۳۔ وَمَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اَشُقَّ عَلَیۡکَ: آٹھ سالہ نوکری تیرے لیے باعث مشقت نہ ہوگی بلکہ اسی میں آسودگی ہوگی۔

۴۔ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ: اس معاملے میں پوری طرح حسن نیت کا مظاہرہ ہوگا۔ صالحین میں شمار ہونے کی امید کا اظہار کسی نبی سے ہوسکتا ہے۔

قَالَ ذٰلِکَ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ ؕ اَیَّمَا الۡاَجَلَیۡنِ قَضَیۡتُ فَلَا عُدۡوَانَ عَلَیَّ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوۡلُ وَکِیۡلٌ ﴿۲۸﴾ ع

۲۸۔ موسیٰ نے کہا: یہ میرے اور آپ کے درمیان وعدہ ہے، میں ان دونوں میں سے جو بھی مدت پوری کروں مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہے اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس پر اللہ کارساز ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ ذٰلِکَ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا: جو معاہدہ میرے

[1] الفقیہ ۳: ۴۲۳

اور آپ کے درمیان طے پایا ہے اس میں سے جس مدت کو بھی پورا کروں، آٹھ یا دس سال، مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو گی۔ یہ کہنا حضرت شعیب علیہ السلام کے قول وَمَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اَشُقَّ عَلَیۡکَ ... میں تجھے تکلیف میں ڈالنا نہیں چاہتا، کا جواب معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ یا دس سال آپ کی نوکری کرنا مجھ پر زیادتی نہیں ہے کہ باعث تکلیف و مشقت ہو جائے۔

اس عقد کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آزمائشی زندگی کا ایک مرحلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس مدت کے پوری ہونے پر یہ مرحلہ ختم ہو جاتا ہے۔

فَلَمَّا قَضٰی مُوۡسَی الۡاَجَلَ وَ سَارَ بِاَہۡلِہٖۤ اٰنَسَ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَہۡلِہِ امۡکُثُوۡۤا اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ اَوۡ جَذۡوَۃٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّکُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مدت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل کو لے کر چل دیے تو کوہ طور کی طرف سے ایک آگ دکھائی دی، وہ اپنے اہل سے کہنے لگے: ٹھہرو! میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید وہاں سے میں کوئی خبر لاؤں یا آگ کا انگارا لے آؤں تاکہ تم تاپ سکو۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا قَضٰی مُوۡسَی الۡاَجَلَ: روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال پورے کیے اور قصر فرعونی کی تعیش کی زندگی کے بعد پردیس میں غربت کی زندگی کا مزہ چکھنے کا موقع ملا۔ ایک اولوالعزم نبی بننے کے لیے مدین میں انسانی معاشرے کے نچلے درجے کے لوگوں کے ساتھ زندگی گزار کر معاشرے کے درد و الم اور محرومیوں کا قریب سے مشاہدہ کرنا بھی ضروری تھا۔

۲۔ وَ سَارَ بِاَہۡلِہٖۤ: اور وہ اپنے اہل کو لے کر چل دیے۔ اس سفر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا اہم ترین مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اسی سفر میں وہ مبعوث برسالت ہوتے ہیں اور جس فرعونیت سے بچنے کے لیے ہجرت کرنا پڑی تھی اسی کا مقابلہ کرنے کا حکم ملتا ہے۔

۳۔ اٰنَسَ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ نَارًا: طور کی جانب سے ایک آگ دکھائی دی۔ وقت رات کا تھا اور سردی کا زمانہ تھا۔

۴۔ قَالَ لِاَہۡلِہِ امۡکُثُوۡۤا: اپنے اہل و عیال سے فرمایا: ٹھہرو۔

۵۔ اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا: میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ یہ آگ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام دیکھ رہے

تھے اس لیے فرمایا: میں نے دیکھی ہے۔ ورنہ تعبیر یوں ہوتی: دیکھو وہاں ایک آتش نظر آ رہی ہے۔ ہم نے یہ بات متعدد مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی کو دیگر عام انسانوں میں موجود حواس کے ذریعے ادراک نہیں کرتے بلکہ وحی کو اپنے پورے وجود کے ساتھ ادراک کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کیہ روشنی صرف آنکھوں سے نہیں دیکھی۔ آنکھیں دوسروں کی بھی ہیں وہ بھی دیکھ لیتے۔ اسی خصوصی ادراک کو لفظ اٰنَسۡتُ اُنس کے ساتھ بیان فرمایا۔ چنانچہ زمخشری کے مطابق الابصار البين الذى لاشبهة فيه۔ اُنس اس دکھائی دینے کو کہتے ہیں جس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

۶۔ لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ: اس آتش سے کوئی خبر مل جائے۔ یعنی اس آتش کے جلانے والے سے ہماری مطلوبہ خبر مل جائے۔ سورہ طٰہٰ آیت نمبر ۱۰ اَوۡ اَجِدُ عَلَی النَّارِ ہُدًی سے اشارہ ملتا ہے کہ اس سے مراد راستے کی خبر ہے کہ ہم راستہ بھٹک تو نہیں گئے ہیں۔

۷۔ اَوۡ جَذۡوَۃٍ مِّنَ النَّارِ: جاڑے کا زمانہ تھا سردی سے بچنے کے لیے اس آگ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس آگ کے گرد اگر کوئی انسان ہے تو اس سے خبر مل جائے۔ نہیں تو آگ سے فائدہ اٹھایا جائے۔

فَلَمَّاۤ اَتٰىہَا نُوۡدِیَ مِنۡ شَاطِیَٴ الۡوَادِ الۡاَیۡمَنِ فِی الۡبُقۡعَۃِ الۡمُبٰرَکَۃِ مِنَ الشَّجَرَۃِ اَنۡ یّٰمُوۡسٰۤی اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ پھر جب موسیٰ وہاں پہنچے تو وادی کے دائیں کنارے سے ایک مبارک مقام میں درخت سے ندا آئی: اے موسیٰ! میں ہی عالمین کا پروردگار اللہ ہوں۔

تشریح کلمات

شَاطِیٴ: (ش ط ط) الشط کنارہ۔ عام طور پر نہر اور دریا کے کناروں کے لیے بولا جاتا ہے۔

الۡبُقۡعَۃِ: (ب ق ع) زمین کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّاۤ اَتٰىہَا نُوۡدِیَ مِنۡ شَاطِیَٴ الۡوَادِ الۡاَیۡمَنِ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچ گئے تو وادی کے دائیں کنارے سے ندا آئی۔ یہ وادی کی دائیں جانب کا ذکر ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ وٰعَدۡنٰکُمۡ جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَیۡمَنَ ...[1] اور تمہیں طور کی دائیں جانب وعدہ دیا۔

اسی طرح ہے:

[1] ۲۰ طٰہٰ: ۸۰

وَنَادَيۡنٰهُ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنِ ...[۱] اور ہم نے انہیں طور کی داہنی جانب سے پکارا۔
ان دونوں آیتوں میں صراحت ہے کہ دائیں سے مراد طور کی دائیں جانب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب نہیں ہے جیسا کہ بعض نے سمجھ رکھا ہے۔

الۡاَیۡمَنِ: دائیں جانب، جہتوں میں بہتر جہت سمجھی جاتی ہے اس لیے مؤمنین کو قرآن نے اصحاب الیمین کہا ہے اور غیر مؤمن کو اصحاب الشمال کہا ہے۔

۲۔ فِی الۡبُقۡعَۃِ الۡمُبٰرَکَۃِ: مبارک مقام میں۔ یہ وادی کی دائیں جانب کا کنارہ ہے۔ ایک مبارک مقام ہے چونکہ بقعہ مبارکہ میں اللہ نے تجلی فرمائی۔ اسی بقعہ مبارکہ میں داخل ہونے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اتارنے کا حکم ملتا ہے اور اسی وادی کو اللہ نے مقدس قرار دیا ہے:

فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ ۚ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی ؕ[۲] پس اپنی جوتیاں اتار دیں، بتحقیق آپ طویٰ کی مقدس وادی میں ہیں۔

۳۔ مِنَ الشَّجَرَۃِ اَنۡ یّٰمُوۡسٰۤی: "یا موسیٰ علیہ السلام" ندا درخت سے آئی۔ اس جگہ اللہ سے ہمکلام ہونے کے لیے درخت کو حجاب کی حیثیت حاصل ہے۔ سورہ شوریٰ آیت ۵۱ میں اللہ سے ہمکلام ہونے کی تین صورتیں بتائی:

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحۡیًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَیُوۡحِیَ بِاِذۡنِہٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ○ اور کسی بشر میں یہ صلاحیت نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے ماسوائے وحی کے یا پردے کے پیچھے سے یا یہ کہ کوئی پیام رساں بھیجے پس وہ اس کے حکم سے جو چاہے وحی کرے بے شک وہ بلند مرتبہ حکمت والا ہے۔

اس ندا کا مضمون یہ تھا یّٰمُوۡسٰۤی اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ اے موسیٰ! میں کل کائنات کا مالک ہوں۔ عالمین کا واحد مالک آپ سے بات کر رہا ہے۔ یہ ندا حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف کانوں سے نہیں اپنے پورے وجود سے سنی۔ چنانچہ آگ کی روشنی اپنی آنکھوں سے نہیں اپنے پورے وجود سے دیکھی تھی۔ کوئی اور آنکھ اس روشنی کو دیکھ سکتی ہے نہ کوئی کان اس ندا کو سن سکتا ہے۔

وَاَنۡ اَلۡقِ عَصَاکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰہَا تَہۡتَزُّ کَاَنَّہَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدۡبِرًا وَّلَمۡ یُعَقِّبۡ ؕ یٰمُوۡسٰۤی اَقۡبِلۡ

۳۱۔ اور اپنا عصا پھینک دیجیے، پھر جب موسیٰ نے عصا کو سانپ کی طرح حرکت کرتے دیکھا تو پیٹھ پھیر کر پلٹے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا، (ہم

---

[۱] ۱۹ مریم: ۵۲ [۲] ۲۰ طٰہ: ۱۲

وَلَا تَخَفْ ۟ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

نے کہا) اے موسیٰ! آگے آیئے اور خوف نہ کیجیے یقیناً آپ محفوظ ہیں۔

تشریح کلمات

تَهۡتَزُّ : (ہ ز ز) ھزّ کے معنی کسی چیز کو زور سے ہلانے کے ہیں۔ تھتز ہلنے کے معنوں میں ہے۔

جَآنٌّ : (ج ن ن) ایک قسم کا سانپ۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَنۡ اَلۡقِ عَصَاكَ : حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملتا ہے: اپنا عصا پھینک دیں۔ حضرت موسیٰ نے حکم کی تعمیل کی تو دیکھا عصا یکا یک سانپ کی طرح حرکت کر رہا ہے۔

۲۔ وَّلّٰى مُدۡبِرًا: یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پیٹھ پھیر کر پلٹے وَّ لَمۡ يُعَقِّبۡ اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر میں اِنَّكَ مِنَ الۡاٰمِنِيۡنَ کی ضمانت سن کر واپس آ گئے۔

سانپ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف بتاتا ہے کہ جو معجزہ اللہ اپنے نبی کو دکھاتا ہے وہ فعل خدا ہی ہوتا ہے لیکن جب موسیٰ علیہ السلام خود عصا پھینکتے اور وہ اژدھا بن جاتا تو خوفزدہ نہیں ہوتے تھے۔

آج یہ بات مسلم ہے کہ تمام موجودات کا ابتدائی خمیر اور عناصر اولیہ ایک ہے۔ ان عناصر کی ترکیب و ترتیب مختلف ہونے سے چیزیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا عصا اور اژدھے کے عناصر ایک ہیں۔ اللہ اپنی قدرت کن فیکونی سے ان عناصر کی ترتیب و ترکیب بدل سکتا ہے اور عصا سے اژدھا اور اژدھے سے عصا بنا سکتا ہے۔ اس سے یہ بات، جو ہم نے پہلے بھی لکھی ہے واضح ہو جاتی ہے کہ معجزہ عام طبیعاتی دفعات کے مطابق نہ سہی لیکن قانون فطرت کے دائرے میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ معجزے کے علل و اسباب عام انسانوں کے لیے قابل تسخیر نہیں ہیں۔

اُسۡلُكۡ يَدَكَ فِىۡ جَيۡبِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ ۫ وَّ اضۡمُمۡ اِلَيۡكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهۡبِ فَذٰنِكَ بُرۡهَانٰنِ مِنۡ رَّبِّكَ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ (اے موسیٰ) اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال دیجیے وہ بغیر کسی عیب کے چمکدار ہو کر نکلے گا اور خوف سے بچنے کے لیے اپنے بازو کو اپنی طرف سمیٹ لیجیے، یہ دو معجزے آپ کے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے اہل دربار کے لیے ہیں تحقیق وہ بڑے فاسق لوگ ہیں۔

تشریح کلمات

برھان: (ب ر ہ) البرھان کے معنی دلیل اور حجت کے ہیں۔

الرَّھۡبِ: (ر ھ ب) ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اُسۡلُکۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دوسرا اہم معجزہ ید بیضاء کے بارے میں ہے جس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔

۲۔ وَّ اضۡمُمۡ اِلَیۡکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھۡبِ: اور خوف کی حالت میں اپنے بازو کو اپنی طرف سمیٹ لو۔ آیت کے اس جملے کی تشریح میں ہمارا موقف یہ ہے: آگے خطرناک حالات کا آپ کو مقابلہ کرنا ہے۔ ان حالات کے لیے آپ کمربستہ ہو جائیں۔ جس طرح پرندے خوف کے حالت میں اپنے پر پھیلاتے ہیں اور امن وسکون کی حالت میں پروں کو سمیٹ لیتے ہیں آپ بھی اپنے بازوؤں کو سمیٹ لیں۔ یعنی فرعون جیسے دشمن کے مقابلے میں امن وسکون کے ساتھ جرائت کا مظاہرہ کریں۔ البتہ یہ بات بھی ممکن ہے کہ اس عمل سے اللہ تعالیٰ دل سے خوف نکالے گا، یہ بھی ید بیضا کی طرح ایک خاص عنایت ہو۔

۳۔ فَذٰنِکَ بُرۡھَانٰنِ مِنۡ رَّبِّکَ: یہ دو برہان، دو قطعی واضح اور ٹھوس دلائل آپ کے ساتھ ہیں: عصا اور ید بیضاء۔ لہٰذا آپ کو کسی قسم کا خوف لاحق نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ: دونوں معجزے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے حجت پوری کرنے اور حق ثابت کرنے کے لیے ہیں۔ اگرچہ فسق و فجور میں غرق لوگ ہیں۔ ان پر ان معجزات کا اثر ہو یا نہ ہو اللہ نے اپنی حجت پوری کرنا ہے اور فرعون کے طاغوت کے مقابلے میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ قَتَلۡتُ مِنۡہُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ موسیٰ نے عرض کیا: پروردگارا! میں نے ان کا ایک آدمی قتل کیا ہے، لہٰذا میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف موت کا نہیں ہے بلکہ تکمیل رسالت میں رکاوٹ کا ہے۔ چونکہ آگے جس رسالت کو فرعون کے سامنے پیش کرنا ہے اس میں بڑی دشواریاں ہیں۔ ان میں سرفہرست میرا اپنا ذاتی مسئلہ ہے جو قبطی کا قتل ہے۔

وَ اَخِیۡ ہٰرُوۡنُ ہُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡہُ مَعِیَ رِدۡاً یُّصَدِّقُنِیۡۤ ۫ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے لہٰذا اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج کہ وہ میری تصدیق کرے کیونکہ مجھے خوف ہے کہ لوگ میری تکذیب کریں گے۔

تشریح کلمات

ردءً: (ر د ء) الردء جو دوسرے کا مددگار بن کر اس کے تابع ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَخِیۡ ہٰرُوۡنُ ہُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا: حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے اس تاریخ ساز جہاد میں قدم رکھنے کے لیے معاون کی درخواست کر رہے ہیں۔ اس معاون میں دو باتوں کا ذکر ہے: رِدۡاً وہ میرا مددگار ہو گا۔ یُّصَدِّقُنِیۡۤ میری رسالت کی تصدیق کرے گا۔ حضرت موسیٰ، حضرت ہارون علیہما السلام کے ذریعے نصرت و تصدیق کے خواہشمند تھے کہ وہ سب سے پہلے میری رسالت کی تصدیق کرے۔ انہی دو باتوں میں محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و علی اور موسیٰ و ہارون علیہما السلام کتنی زیادہ مشابہت ہے۔ رسالتماب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان بھی ہے:

یا علی اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ ھَارُونَ مِنْ مُوسَی اِلَّا اَنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعْدِی۔[۱]

اے علی! تجھے مجھ سے وہی مقام حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھا۔ صرف یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَکَ بِاَخِیۡکَ وَ نَجۡعَلُ لَکُمَا سُلۡطٰنًا فَلَا یَصِلُوۡنَ اِلَیۡکُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنۡتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَکُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ﴿۳۵﴾

معانقۃ ۱۱

۳۵۔ فرمایا: ہم آپ کے بھائی کے ذریعے آپ کے بازو مضبوط کریں گے اور ہم آپ دونوں کو غلبہ دیں گے اور ہماری نشانیوں (معجزات) کی وجہ سے وہ آپ تک نہیں پہنچ پائیں گے، آپ دونوں اور آپ کے پیروکاروں کا ہی غلبہ ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَکَ بِاَخِیۡکَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہو جاتی ہے، ہارون علیہ السلام کو

---

[۱] مسند احمد۔ الکافی ۸: ۱۰۶

تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے لیے قوت بازو قرار دیتا ہے اور مزید خوشخبری سناتا ہے۔

۲۔ وَنَجۡعَلُ لَکُمَا سُلۡطٰنًا: وہ خوشخبری یہ ہے کہ ہم آپ دونوں کو غلبہ دیں گے۔ معجزات کے ذریعہ دلیل و حجت کا غلبہ دیں گے۔

۳۔ فَلَا یَصِلُوۡنَ اِلَیۡکُمَا: فرعون و فرعونیوں کا دست ستم آپؑ تک نہیں پہنچے گا۔ غلبہ کی نوعیت یہ ہوگی کہ وہ آپ کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکیں گے بلکہ وہ مغلوب ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ جادوگروں کے مظاہرے میں شکست فاش اور غرق آب ہونے سے یہ وعدہ پورا ہوا۔

۴۔ بِاٰیٰتِنَاۤ: اس غلبے کا ذریعہ وہ معجزات ہوں گے جو آپؑ کے ہاتھ سے ظاہر ہوں گے۔ ان معجزات کی تعداد نو تھی جن کے مقابلے میں فرعون و فرعونی ہمیشہ مغلوب رہے۔

انس بن مالک راوی ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو فرمایا:

بابی انت و امی من شد اللّٰہ عضدی بہ کما شد عضد موسیٰ بھارون۔[1]	میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں، اس پر جس سے اللہ نے میرا بازو مضبوط کیا ہے جس طرح موسیٰ کا بازو ہارون سے مضبوط کیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَہُمۡ مُّوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًی وَّ مَا سَمِعۡنَا بِہٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ پھر جب موسیٰ ہماری واضح نشانیاں لے کر ان کے پاس پہنچے تو وہ کہنے لگے: یہ تو بس گھڑا ہوا جادو ہے اور ہم نے اپنے اگلے باپ داداؤں سے ایسی باتیں کبھی نہیں سنیں۔

تفسیر آیات

۱۔ معجزات حاصل ہونے اور کامیابی کی نوید سننے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ان معجزات کو فرعون کے سامنے پیش کیا تو فرعون اور اس کے درباریوں کا ردعمل وہی رہا جو ہر طاغوت کا ہوا کرتا ہے۔

۲۔ قَالُوۡا مَا ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًی: باطل جب حق کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ جاتا ہے تو الزام و بہتان کا سہارا لیتا ہے۔ حق کے مقابلے میں نہ دلیل پیش کر سکتا ہے، نہ منطق، صرف وہی بہتان کہ یہ تو جادو ہے۔

۳۔ وَّ مَا سَمِعۡنَا بِہٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ: یہ نعرہ یا تو موجودہ نسل کو گمراہ رکھنے کے لیے لگایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی حالانکہ ان سے پہلے حضرات نوح، ہود اور

[1] شواھد التنزیل ذیل آیت ۱: ۵۶۱۔ تفسیر البرھان ذیل آیت

صالح و دیگر انبیاء علیہم السلام کی دعوت تاریخ انسان میں ثبت ہے یا ہم نے ایسی باتیں نہیں سنیں اس لیے کہتے ہوں گے کہ ان کے آبا و اجداد نے بھی دعوت کو رد کیا تھا لہٰذا ان میں توحید کی کوئی روایت موجود نہ تھی۔

وَقَالَ مُوۡسٰی رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی مِنۡ عِنۡدِهٖ وَمَنۡ تَکُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔اور موسیٰ نے کہا: میرا پروردگار اسے جانتا ہے جو اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ آخرت کا گھر کس کے لیے ہے، بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے۔

تفسیر آیات

۱۔ جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی میرے مالک جانتا ہے ہے کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور میرا مالک یہ بھی جانتا ہے کہ انجام کس کا کیا ہو گیا۔ اگر میں جھوٹا ہوں تو میرا انجام برا ہو گا چونکہ اس صورت میں، میں ظالم ہوں اور ظالم فلاح نہیں پاتے اور اگر تم ظالم ہو تو تمہارا انجام برا ہو گا اور تمہیں کامیابی حاصل نہ ہو گی۔

وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَاُ مَا عَلِمۡتُ لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرِیۡ ۚ فَاَوۡقِدۡ لِیۡ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیۡنِ فَاجۡعَلۡ لِّیۡ صَرۡحًا لَّعَلِّیۡۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوۡسٰی ۙ وَاِنِّیۡ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔اور فرعون نے کہا: اے درباریو! میں تمہارے لیے اپنے سوا کسی معبود کو نہیں جانتا، اے ہامان! میرے لیے گارے کو آگ لگا (کر اینٹ بنا دے) پھر میرے لیے ایک اونچا محل بنا دے تاکہ میں موسیٰ کے خدا کو (جھانک کر) دیکھوں اور میرا تو خیال ہے کہ موسیٰ جھوٹا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَاُ مَا عَلِمۡتُ لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرِیۡ: اپنے سوا کسی اور معبود کو میں نہیں جانتا۔ فرعون کا اپنے درباریوں سے یہ اظہار ہے کہ اگر میرے علاوہ کوئی اور معبود ہوتا تو میرے علم میں ہوتا۔ چونکہ فرعون ان کے نزدیک معبود کا مظہر اور ابن معبود ہوتا ہے لہٰذا ان کی نظر میں یہ بات ممکن نہیں کہ کوئی معبود موجود ہو اور فرعون اس سے بے خبر ہو۔

۲۔ فَاَوۡقِدۡ لِیۡ یٰہَامٰنُ عَلَی الطِّیۡنِ: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فرعون کا ایک طنز ہوسکتا ہے۔ دیکھوں موسیٰ علیہ السلام کا خدا اوپر کس جگہ ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے اس سے لوگوں کو دھوکہ دینا مقصود ہو کہ موسیٰ کا خدا اگر آسمان میں نظر نہیں آتا تو اس کا وجود ہی نہیں جیسا کہ روسی خلا بازوں نے بھی یہی کہا تھا: ہمیں آسمان میں کہیں خدا نظر نہیں آیا۔

قرین واقع ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے کوئی ایسی عمارت نہیں بنوائی یہ بات صرف دعوت موسیٰ کا مذاق اڑانے کے لیے کہی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پختہ اینٹیں بنانے کا رواج تھا۔

قرآن پر بلا دلیل اعتراض اٹھانے والوں نے کہا ہے: اس زمانے میں پختہ اینٹ بنانے کا رواج نہ تھا۔ اس زمانے میں عمارتیں پتھر سے بناتے تھے جیسا کہ اہرام کی عمارت اور لبنان بعلبك کی ہیکل کبیر کی عمارت وغیرہ سب پتھروں سے بنائی گئی ہیں۔ لہٰذا ہامان کو پختہ اینٹ بنانے کا حکم تاریخی اعتبار سے ایک اشتباہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ پختہ اینٹ بنانے کی تاریخ، انسانی تمدن کی تاریخ کے ساتھ قدیم ہے۔ چنانچہ خود مصر میں پختہ اینٹ کی تاریخ پانچ ہزار قبل مسیح پرانی ہے۔ دریائے نیل کی تہ کی کھدائی سے پختہ بڑی اینٹیں نکل آئیں جو پانچ ہزار سال قبل مسیح کی ہیں اور دریائے نیل کے ساحل پر کچھ ایسی قبروں کا انکشاف ہوا ہے جو پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں اور تین ہزار سال قبل مسیح پرانی ہیں۔[1]

چنانچہ بابل کی قدیم عمارتیں اور آشور و سومری تمدن کے آثار ۲۵۰۰ سال قبل مسیح پرانے ہیں۔ یہ سب پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں اور طاق کسری، ایرانی بادشاہ شاہپور کی تعمیر کردہ ہے جو ۲۴۱ قبل مسیح پرانی ہے۔

خود توریت سفر تکوینی اصحاح ۱۱: ۲۔۴ میں آیا ہے:

> نوح کی اولاد میں سے کچھ لوگ مشرق کی طرف روانہ ہوئے اور شفعار (عراق) کی سرزمین پر پہنچے۔ وہاں رہائش پذیر ہوئے اور آگ پر پختہ کی ہوئی اینٹوں سے بڑا شہر بنایا۔

اس سلسلے میں مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف الاسلامیہ الکبری ۱: ۳۷۔ ۳۸ قدیم تاریخ مصر (الموسوعۃ المصریۃ) جلد اول۔

وَ اسۡتَکۡبَرَ ہُوَ وَ جُنُوۡدُہٗ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ اِلَیۡنَا لَا یُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ چنانچہ فرعون اور اس کے لشکر نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور یہ خیال کیا کہ وہ ہماری طرف پلٹائے نہیں جائیں گے۔

---

[1] شبہات وردود: ۳۵۴

تفسیر آیات

۱۔ فرعون اور اس کے لشکر کا اس سے زیادہ تکبر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے معبود کا مذاق اڑاتا ہے اور اپنے حیطہ علم میں آنا ممکن ہونے والا کا کوئی موجود فرض کرتا ہے بلکہ چند گز بلند عمارت کی بلندی پر فرض کر کے اپنے آپ کو بہت بڑا تصور کرتا ہے۔

۲۔ یہ گمان بھی اس قوم کی سرکشی کا سبب ہے کہ وہ اللہ کی گرفت میں آنے والے نہیں ہیں۔

فَاَخَذۡنٰہُ وَ جُنُوۡدَہٗ فَنَبَذۡنٰہُمۡ فِی الۡیَمِّ ۚ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ تو ہم نے اسے اور اس کے لشکر کو گرفت میں لے لیا اور انہیں دریا میں پھینک دیا، پس دیکھ لو ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

تفسیر آیات

۱۔ چنانچہ چنداں دیر نہیں ہوئی فرعون اور اس کے لشکر کو ہم نے دریا میں غرق کر دیا اور ان کا یہ گمان کہ وہ ہماری طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے، خاک میں مل گیا۔ غرق آب ہونے پر وہ ہمارے پاس پلٹ کر آ گئے اور ہماری گرفت سے نہیں بچ سکے۔

۲۔ یہ ایک کلی قانون ہے کہ ہر ظالم کا انجام بہت عبرتناک ہو گا۔

وَ جَعَلۡنٰہُمۡ اَئِمَّۃً یَّدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ۚ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اور ہم نے انہیں ایسے رہنما بنایا جو آتش کی طرف بلاتے ہیں اور قیامت کے دن ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

تفسیر آیات

۱۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود اللہ نے انہیں آتش کی طرف بلانے والے بنا دیا تو ان کا کیا قصور ہے۔ اس سے مسلک جبر پر استدلال کیا جاتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ جب کسی ناقابل ہدایت انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو قرآن اس کے لیے یہ تعبیر اختیار فرماتا ہے: ہم نے اسے گمراہ کیا:

وَ جَعَلۡنَا قُلُوۡبَہُمۡ قٰسِیَۃً ۚ یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ ....[1]

اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا، یہ لوگ (کتاب اللہ کے) کلمات کو اپنی جگہ سے الٹ پھیر کر دیتے ہیں۔

---

[1] ۵ مائدۃ: ۱۳

وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً ....[۱] لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔

جَعَلۡنَا فِیۡ كُلِّ قَرۡیَةٍ اَكٰبِرَ مُجۡرِمِیۡهَا لِیَمۡكُرُوۡا فِیۡهَا ....[۲] ہم نے ہر بستی میں وہاں کے بڑے بڑے مجرموں کو پیدا کیا....

یہاں بھی یہی صورت ہے کہ فرعون لوگوں کو گمراہ کر کے جہنم کی طرف لے جانے کے لیے رہنما بنا ہوا ہے۔ اللہ نے رسولوں اور معجزات کے ذریعے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ جب وہ نہیں مانا تو اللہ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس کا حال یہ تھا کہ وہ لوگوں کو جہنم کی طرف لے جا رہا تھا اور اللہ نے اسے جہنم کی طرف رہنمائی کرنے کی حالت میں چھوڑ دیا۔ اس چھوڑنے کو جَعَلۡنَا فرمایا ہے۔

۲۔ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ لَا یُنۡصَرُوۡنَ: قیامت کے دن ان کی شفاعت کرنے والا کوئی نہ ہو گا اور وہ ہماری گرفت سے نہیں بچ سکیں گے۔

اہم نکات

۱۔ سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ خدائے مہربان کسی سے ہاتھ اٹھا لے۔

وَاَتۡبَعۡنٰهُمۡ فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا لَعۡنَةً ۚ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ هُمۡ مِّنَ الۡمَقۡبُوۡحِیۡنَ ﴿۴۲﴾ ع

۴۲۔ اور ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے دن یہ قبیح (چہرہ والے) ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ چونکہ فرعون کفر و سرکشی کی ایک روایت قائم کر گیا اس لیے جب تک اس روایت کا سلسلہ جاری رہے گا اس پر لعنت کا تسلسل بھی قائم رہے گا۔

۲۔ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ هُمۡ مِّنَ الۡمَقۡبُوۡحِیۡنَ: روز حشر کے عذاب میں سے ایک چہروں کا مسخ ہونا، کالا ہونا ہے۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَهۡلَكۡنَا الۡقُرُوۡنَ الۡاُوۡلٰی بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًی وَّرَحۡمَةً لَّعَلَّهُمۡ یَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اور بتحقیق ہم نے پہلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد لوگوں کے لیے بصیرتوں اور ہدایت و رحمت (کا سرچشمہ) بنا کر موسیٰ کو کتاب دی، شاید لوگ نصیحت حاصل کریں۔

---

[۱] انعام: ۲۵ [۲] انعام: ۱۲۳

تفسیر آیات

ا۔سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے سرکشی کے نتیجے میں پچھلی نسلیں تباہ ہو گئیں۔ جیسے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود حتیٰ قوم فرعون کی ہلاکت کے بعد توریت عنایت ہوئی۔ گزشتہ کی ہلاکتوں کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے ہدایت کا ایک جدید سلسلہ شروع فرمایا:

ابوسعید خدری راوی ہیں: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما اهلك قوما ولا قرنا ولا امة ولا اهل قرية بعذاب من السماء منذ انزل التورية على وجه الارض۔[1]	اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو نہ کسی زمانے کے لوگوں کو، نہ کسی امت، نہ کسی بستی والے کو آسمانی عذاب سے توریت کے نازل ہونے کے بعد ہلاک نہیں کیا۔

۲۔ بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ: توریت لوگوں کے لیے باعث بصیرت تھی جس سے حق و باطل میں تمیز کر سکتے تھے۔

توریت ہدایت و راہنمائی کی کتاب ہے۔ اپنے اندر رحمتیں لیے ہوئے ہے۔ اسی رحمت کی بنا پر اس کتاب کے نازل ہونے کے بعد آسمانی عذاب نہیں آیا۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾	۴۴۔ اور آپ اس وقت (طور کے) مغربی جانب موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کی طرف حکم بھیجا اور آپ مشاہدہ کرنے والوں میں سے نہ تھے۔

تفسیر آیات

مکہ والوں کے حسی مشاہدے کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت موجود نہ تھے جب اللہ طور کی مغربی جانب موسیٰ علیہ السلام کو شریعت دے رہا تھا، مغربی جانب وہی ہے جس کے بارے میں آیت ۳۰ میں فرمایا: مِنۡ شَاطِیِٴ الۡوَادِ الۡاَیۡمَنِ وادی کے دائیں کنارے سے، تو سوال یہ کیا گیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو شریعت مل رہی تھی اس وقت یہ رسولؐ وہاں تمہارے مشاہدے کے مطابق موجود نہ تھے، نہ ہی یہ واقعات ان کی کتابوں سے لیے گئے چونکہ یہ واقعات جیسے قرآن بیان کرتا ہے، توریت وغیرہ میں بھی نہیں ہیں اور نہ مکہ میں ایسے وسائل فراہم تھے کہ ان واقعات کو حاصل کیا جا سکے۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے ذریعے موسیٰ کے حالات اس طرح بیان کر رہے ہیں جیسا کہ آپؐ وہاں موجود تھے۔ یہ صرف وحی کے ذریعہ ممکن ہے۔

---

[1] مجمع البیان ذیل آیت

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ لیکن ہم نے کئی امتوں کو پیدا کیا پھر ان پر طویل مدت گزر گئی اور نہ آپ اہل مدین میں سے تھے کہ انہیں ہماری آیات سنا رہے ہوتے لیکن ہم ہی (ان تمام خبروں کے) بھیجنے والے ہیں۔

تشریح کلمات

ثَاوِيًا: (ث و ی) الثواء کے اصل معنی کسی جگہ پر مستقل طور پر اقامت کرنا کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ: اس آیت میں لکن ”استدراک“ کا سابقہ آیت سے ربط پیدا کرنا بہت زیادہ دشوار ہے۔ ہماری فہم کے مطابق ربط کلام اس طرح ہے: مشرکین کو اس بات پر تعجب تھا کہ ہمارے درمیان اس قسم کا کوئی رسول آیا نہیں:

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ...[۱] ہم نے کبھی یہ بات کسی پچھلے مذہب سے بھی نہیں سنی....

اگلی آیت میں فرمایا:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ ...[۲] تاکہ آپ اس قوم کو تنبیہ کریں جن کے ہاں آپ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا۔

لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا دعویٰ ہماری روایات کے خلاف ہے۔ اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ ...[۳] اور بتحقیق ہم نے پہلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد لوگوں کے لیے بصیرتوں اور ہدایت و رحمت (کا سرچشمہ) بنا کر موسیٰ کو کتاب دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ایک لمبے وقفے کے بعد مبعوث ہوئے ہیں۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی ایک لمبے وقفے کے بعد مبعوث برسالت کر رہے ہیں۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ: لیکن ہوا یہ کہ ہم نے کئی امتوں کو پیدا کیا۔ پھر ان پر طویل مدت گزر گئی۔ یعنی اے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم! ہم آپ کو بھی موسیٰ علیہ السلام کی طرح طویل مدت کے بعد مبعوث

---

۱ ۳۸ ص: ۷ ۲ ۲۸ قصص: ۴۶ ۳ ۲۸ قصص: ۴۳

کر رہے ہیں۔اس وجہ سے بھی ان لوگوں کو آپؐ کی طرف وحی نازل ہونے کی بات کو سمجھنا دشوار ہو رہا ہے۔

۲۔ وَ مَا کُنۡتَ ثَاوِیًا فِیۡۤ اَہۡلِ مَدۡیَنَ: نہ ہی آپؐ اہل مدین میں مقیم تھے کہ آپؐ اپنے مشاہدے کے مطابق ان مشرکوں کو ہماری آیات پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ تَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا میں عَلَیۡہِمۡ کی ضمیر مشرکین کی طرف ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپؐ اپنے مشاہدے کی بنا پر مشرکین مکہ کو مدین سے متعلق آیات سنا رہے ہوں۔

۳۔ وَ لٰکِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ: لیکن ان خبروں کو بھیجنے والے ہم ہیں۔

وَ مَا کُنۡتَ بِجَانِبِ الطُّوۡرِ اِذۡ نَادَیۡنَا وَ لٰکِنۡ رَّحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰہُمۡ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ اور آپ طور کے کنارے پر موجود نہ تھے جب ہم نے ندا دی تھی بلکہ (آپ کا رسول بنانا) آپ کے پروردگار کی رحمت ہے تاکہ آپ اس قوم کو تنبیہ کریں جن کے ہاں آپ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا کُنۡتَ بِجَانِبِ الطُّوۡرِ اِذۡ نَادَیۡنَا: جیسے آپ مدین میں مقیم نہ تھے۔ اسی طرح آپ طور کے داہنی جانب بھی موجود نہ تھے۔ جب ہم نے موسیٰ کو ندا دی اور کوہ طور پر بلا کر ان کو شریعت دی۔

۲۔ وَ لٰکِنۡ رَّحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ: لیکن یہ اللہ کی رحمت آپ کے شامل حال رہی اور آپ کو رسالت سے نوازا اور وحی کے ذریعہ آپ طور کے واقعات ایسے بتلا رہے جیسے آپ وہاں موجود تھے۔

۳۔ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰہُمۡ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ: رسالت کی رحمت آپؐ کے شامل اس لیے رہی کہ آپؐ ایسی قوم کی تنبیہ کریں جس میں آپؐ سے پہلے ان کو تنبیہ کرنے والا کوئی نہیں آیا۔ ان میں انبیاء مبعوث نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ جاہلیت کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

عربوں میں حضرت ہود، صالح، شعیب اور اسماعیل علیہم السلام کے بعد صدیوں سے کوئی نبی نہیں آیا۔ البتہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی دعوتیں ان تک پہنچتی رہیں اور حجت پوری ہوتی رہی۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورہ سجدہ آیت ۳۔

مشرکین مکہ کی معلومات کے مطابق آپؐ ان مقامات پر موجود نہ تھے، ان پر طویل مدت بھی گزر گئی تھی اور مکہ کی ان پڑھ قوم میں ان واقعات کا علم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ پس اگر یہ قرآن وحی الٰہی نہیں ہے تو کون سا ذریعہ ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی ذریعہ موجود ہوتا تو آج کے مستشرقین سے کہیں زیادہ مکہ کے مشرکین کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ اسے برملا کر دیتے اور جنگ کرنے کی نوبت نہ آتی۔

وَلَوۡلَاۤ اَنۡ تُصِیۡبَہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ فَیَقُوۡلُوۡا رَبَّنَا لَوۡلَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَیۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ وَنَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔اور ایسا نہ ہو کہ اپنے ہاتھوں آگے بھیجی ہوئی حرکتوں کی وجہ سے اگر ان پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے تو وہ یہ کہنے لگیں: ہمارے رب! تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی اتباع کرتے اور ایمان لانے والوں میں شامل ہو جاتے۔

تفسیر آیات

۱۔وَلَوۡلَاۤ اَنۡ تُصِیۡبَہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ: کل جب یہ مشرکین عذاب میں مبتلا ہوتے تو وہ اس وقت یہ احتجاج کر سکتے تھے: ہماری طرف کسی رسول کو کیوں نہیں بھیجا ہم اس پر ایمان لے آتے۔

اس مضمون کو دوسری آیت میں اس طرح فرمایا:

لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ...[1]

تا کہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کسی حجت کی گنجائش نہ رہے۔

آیت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسول نہ بھیجتے تو کافروں کو اس سوال کا حق تھا کہ ہماری طرف رسول کیوں نہیں بھیجا؟ پھر یہ کہ حجت پوری کرنے سے پہلے عذاب دینا بھی عدل نہیں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَہُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُوۡتِیَ مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی ؕ اَوَلَمۡ یَکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ۚ قَالُوۡا سِحۡرٰنِ تَظٰہَرَا ۟ٝ وَقَالُوۡۤا اِنَّا بِکُلٍّ کٰفِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔پھر جب ہماری طرف سے حق ان کے پاس آ گیا تو وہ کہنے لگے: جیسی (نشانی) موسیٰ کو دی گئی تھی ایسی (نشانی) انہیں کیوں نہیں دی گئی؟ کیا انہوں نے اس کا انکار نہیں کیا جو قبل ازیں موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا: یہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے جادوگر ہیں اور کہا: ہم ان سب کے منکر ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔فَلَمَّا جَآءَہُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا: جب ان کے پاس ہمارے رسول آئے تو ان کے حیلے بہانے ختم نہیں ہوئے اور حق کو قبول نہ کیا۔

---

[1] ۴ نساء: ۱۶۵

۲۔ قَالُوۡا لَوۡ لَاۤ اُوۡتِیَ مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی: جیسے معجزے موسیٰ کو دیے گئے تھے انہیں کیوں نہیں دیے گئے۔ اس رسول کے پاس نہ عصا، نہ ید بیضاء ہے۔ نہ سمندر کا شق ہونے والا معجزہ ہے، نہ من و سلویٰ ہے۔

۳۔ اَوَ لَمۡ یَکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی: ان کے جواب میں فرمایا: تو کیا موسیٰ کے ان عظیم معجزات کو دیکھ کر لوگ ایمان لے آئے؟ ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ بڑے اہتمام کے ساتھ بیان فرماتا ہے کہ اس کی طرف سے عظیم معجزات کے باوجود قوم فرعون نے ایمان قبول نہ کیا۔ تاریخ انبیاء شاہد ہے معاندین کبھی بھی معجزات کو دیکھ کر ایمان نہیں لائے۔ نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آتش کو گلزار ہوتے دیکھ قوم نمرود کا کوئی فرد مؤمن بنا، نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو دیکھ قوم فرعون ایمان لائی۔

۴۔ قَالُوۡا سِحۡرٰنِ تَظٰہَرَا: ان معجزوں کے جواب میں فرعونیوں نے کہا: یہ تو جادو ہے ان دونوں نے اس جادو کو چلانے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کی ہے یعنی موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے۔ بعض کے نزدیک ان دونوں سے مراد موسیٰ علیہ السلام و رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اس صورت میں ایک دوسرے کی مدد سے مراد یہ ہوسکتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موسیٰ علیہ السلام کا جادو سے مدد لی ہے۔

قُلۡ فَاۡتُوۡا بِکِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ہُوَ اَہۡدٰی مِنۡہُمَاۤ اَتَّبِعۡہُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ کہد یجیے: پس اگر تم سچے ہو تو تم بھی اللہ کی طرف سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخش ہو، میں اس کی اتباع کروں گا۔

تفسیر آیات

اگر اس قرآن اور توریت میں کسی نقص کی وجہ سے تم ان پر ایمان نہیں لائے تو تم خود ایک ایسی کتاب پیش کرو جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت کے لیے مؤثر ہو۔ مشرکین اللہ کے وجود کو تو مانتے تھے مگر توریت و قرآن کو نہیں مانتے تھے۔ اس بنیاد پر فرمایا: اگر توریت و قرآن کو نہیں مانتے ہو تو کوئی ایسی کتاب پیش کرو جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو۔

فَاِنۡ لَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکَ فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا یَتَّبِعُوۡنَ اَہۡوَآءَہُمۡ ؕ وَ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ بِغَیۡرِ ہُدًی مِّنَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی

۵۰۔ پس اگر وہ آپ کی یہ بات نہیں مانتے تو آپ سمجھ لیں کہ یہ لوگ بس اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی پیروی کرنے والے سے بڑھ کر گمراہ کون ہو گا؟ اللہ ظالموں کو یقیناً ہدایت

الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۵۰ ع ۸　　نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِنۡ لَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَكَ: اگر وہ آپ کی یہ بات نہیں مانتے تو معلوم ہو جاتا ہے ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی کتاب موجود نہیں ہے، نہ ہی کوئی کتاب پیش کر سکتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا نہ ماننا اس لیے نہیں کہ آپؐ کی دعوت یا آپؐ کی طرف سے دلیل میں کوئی کمزوری ہے۔ ان کے نہ ماننے کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ تلاش حق میں مخلص نہیں ہیں۔ اس میں ان کی خواہش پرستی رکاوٹ ہے۔ یہ خواہش پرستی ہے جس کی وجہ سے کوئی دلیل مؤثر ہوتی ہے اور نہ معجزہ کارگر ہوتا ہے۔

۲۔ وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ: خواہش پرستی گمراہی کا آخری زینہ ہے۔ جب خواہش پرستی بِغَیۡرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ اللہ کی طرف سے ہدایت کے بغیر ہو تو اس خواہش پرستی سے زیادہ گمراہی ہو نہیں سکتی۔

وَ لَقَدۡ وَصَّلۡنَا لَهُمُ الۡقَوۡلَ لَعَلَّهُمۡ یَتَذَكَّرُوۡنَ ۵۱　　۵۱۔ اور تحقیق ہم نے ان کے لیے (ہدایت کی) باتیں مسلسل بیان کیں شاید یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر آیات

یعنی ہم نے ان مشرکین کی ہدایت کے لیے رہنمائی کا ایک مربوط تسلسل قائم کیا ہے۔ جو آیات، سورتوں، وعدوں، عبرتوں اور تاریخ کے اسباق پر مشتمل ہے۔

چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤی اَكۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوۡرًا ۝[1]　　اور تحقیق ہم نے اس قرآن میں ہر مضمون کو لوگوں کے لیے مختلف انداز میں بیان کیا ہے لیکن اکثر لوگ کفر پر ڈٹ گئے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِهٖ هُمۡ بِهٖ یُؤۡمِنُوۡنَ ۵۲　　۵۲۔ جنہیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

النصف

وَ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنۡ قَبۡلِهٖ　　۵۳۔ اور جب ان پر (یہ قرآن) پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لے آئے، یقیناً یہ ہمارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۹

مُسۡلِمِیۡنَ﴿۵۳﴾ ہے، ہم تو اس سے پہلے بھی فرمانبردار تھے۔

شان نزول: ان آیات کے شان نزول میں متعدد روایات ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ آیات اہل انجیل کے ان چالیس افراد کی شان میں نازل ہوئی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے مبعوث برسالت ہونے سے پہلے ان پر ایمان لا چکے تھے۔ ان میں سے ۳۲ افراد کا تعلق حبشہ سے تھا جو حضرت جعفر بن ابی طالب کے ہمراہ آئے۔ آٹھ افراد شام سے آ گئے تھے۔ ان میں بحیراء، ابرھۃ، الاشرف، ایمن، ادریس، نافع اور تمیم شامل تھے۔[1]

تفسیر آیات

۱۔ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِہٖ: رسولؐ سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی ہے ان کا ذکر ہے اور یہ اہل کتاب کے مؤمنین کے ایک گروہ کی تعریف ہے جو اپنی توریت میں موجود علامات کی بنیاد پر ایمان لا چکے تھے۔

۲۔ وَ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِہٖۤ: جب ان اہل کتاب پر آیات الٰہی کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس قرآن پر ایمان لے آئے ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور مبنی برحق ہے۔

۳۔ اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلِہٖ مُسۡلِمِیۡنَ: وہ کہتے ہیں ہم تو اس رسول کے مبعوث ہونے سے پہلے ان کو تسلیم کر چکے تھے۔ جن علامات کے حامل رسول آخر الزمان پر ہمیں پہلے ایمان تھا وہ یہی ذات ہے۔

اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَہُمۡ مَّرَّتَیۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَ یَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ﴿۵۴﴾

۵۴۔ انہیں ان کے صبر کے صلے میں دوبار اجر دیا جائے گا اور یہ لوگ برائی کو نیکی کے ذریعے دور کر دیتے ہیں اور ہم نے جو روزی انہیں دی ہے اس سے (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَہُمۡ مَّرَّتَیۡنِ: ایسے اہل کتاب کو جو دین اسلام کے ایک لحہ کے لیے بھی منکر نہیں رہے اور اپنے سابقہ دین پر بھی قائم رہے دو اجر و ثواب ملیں گے۔ بِمَا صَبَرُوۡا یہ دو اجر ان کے صبر و تحمل کے صلے میں ملیں گے۔ پرانے نظریے اور مذہب کو چھوڑ کر حق کی خاطر جدید مذہب کو اختیار کرنا بہت بڑا

[1] المیزان ذیل آیات

صبر وحوصلہ مانگتا ہے۔ مذہب بدلنے کولوگ برا سمجھتے ہیں۔ تمسخر و اہانت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ وَیَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ: وہ لوگ برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں۔ وہ مذہب بدلنے پر پیش آنے والی بدکلامیوں، طعنوں اور ملامتوں کا جواب بردباری، خوش اخلاقی اور خوش کلامی سے دیتے ہیں۔ شاید یہ جملہ صبر و استقلال کے ایک اہم مصداق کا ذکر ہے جو مذہب بدلنے والوں کو پیش آتا ہے۔

۳۔ وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ: صبر، حوصلہ اور جرأت کے مصادیق میں سے ایک اہم مصداق انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ پہلے اس بات کا ذکر تھا کہ وہ اپنی خواہشات کا مقابلہ کر کے مذہب بدلتے تھے۔ اس جملے میں فرمایا: اسی پاک جذبہ کے تحت وہ مال کی خواہش کا بھی مقابلہ کرتے ہیں۔ دونوں کا تعلق اعلیٰ و ارفع اقدار سے ہے۔

اہم نکات

۱۔ برائی کا مقابلہ نیکی سے کرنا ایک جرأت مندانہ قدم ہے۔

۲۔ حق کی خاطر مذہب بدلنا بھی جرات مندانہ قدم ہے۔

وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغۡوَ اَعۡرَضُوۡا عَنۡہُ وَ قَالُوۡا لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ۫ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ ۫ لَا نَبۡتَغِی الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اور جب وہ بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم پر سلام ہو ہم جاہلوں کو پسند نہیں کرتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغۡوَ اَعۡرَضُوۡا عَنۡہُ: جب وہ بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیرتے ہیں۔ اس میں الجھتے نہیں ہیں۔ لغو وہ باتیں ہیں جن میں کوئی معقول اور مفید مضمون نہ ہو۔ یہ باتیں وقت کا ضیاع ہیں۔ یہ جدید ایمان کے میدان میں قدم رکھنے والے ان بیہودہ گو لوگوں سے نہیں الجھتے۔ ان کی باتوں سے غصے میں نہیں آتے اور بیہودگی کا جواب بیہودگی سے نہیں دیتے۔

۲۔ وَ قَالُوۡا لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ: ان بیہودہ گو افراد کے ساتھ الجھنے کی جگہ یہ موقف اختیار کرتے ہیں: ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ نہ ہم تمہارے اعمال کے ذمے دار ہیں نہ تم ہمارے اعمال کے ذمے دار ہو۔ ہمارے لیے اپنا حلم و بردباری ہے اور تمہارے لیے تمہاری حماقت اور بیہودگی۔

۳۔ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ ۫ لَا نَبۡتَغِی الۡجٰہِلِیۡنَ: ہماری طرف سے تم پر کوئی ضرر نہ ہوگا۔ تمہاری بدکلامی کے مقابلے میں بدکلامی نہ ہوگی۔ تمہاری بیہودگی کے مقابلے میں ہماری طرف سے امن و سلام ہے۔ واضح رہے یہ سلام، تحیت و اکرام نہیں ہے بلکہ سلام وداع و جدائی اور بیزاری ہے جیسے آیہ وَّ اِذَا خَاطَبَہُمُ الۡجٰہِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا [1] میں سلام ہے۔

اہم نکات

۱۔ بیہودگی کا ردعمل بیہودگی نہیں، بیزاری اختیار کرنا ہے: لَا نَبۡتَغِی الۡجٰہِلِیۡنَ۔

اِنَّکَ لَا تَہۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ (اے رسول) جسے آپ چاہتے ہیں اسے ہدایت نہیں کر سکتے لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

شان نزول: اہل سنت کے مصادر میں کثرت سے یہ روایت موجود ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالب علیہ السلام کی وفات کے موقع پر نازل ہوئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوطالب علیہ السلام سے کہا: یا عم قل لا الہ الا اللّٰہ۔ اے چچا! لا الہ الا اللّٰہ پڑھیں۔ ابو طالب نے انکار کیا اور کہا: میں عبد المطلب کی ملت پر دنیا سے جانا پسند کروں گا۔ اس مضمون کی روایت کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جگہ مل گئی ہے۔

ہم روایات کے بارے میں بعد میں گفتگو کریں گے۔ پہلے ہم اس کے شان نزول کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں کہ کیا ہوسکتا ہے کہ تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ آیت وفات ابوطالب علیہ السلام کے موقع پر نازل ہوئی ہو۔

تحقیق کے مطابق حضرت ابوطالب علیہ السلام کی وفات سنہ دس بعثت میں ہجرت سے تین سال چار ماہ پہلے ہوئی ہے اور یہ سورہ ہجرت کے دنوں میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی یہ سورہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کی وفات کے تین سال بعد نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ آیہ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ اسی سورہ کی ۸۵ ویں آیت ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے: جس نے آپ پر قرآن (کے احکام) کو فرض کیا ہے وہ آپ کو بازگشت (مکہ) تک پہنچانے والا ہے۔ بغوی لکھتے ہیں: اکثر مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ معاد سے مراد مکہ ہے اور اکثر کے نزدیک یہ آیت مقام جحفہ میں نازل ہوئی جب آپؐ مدینہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ خود صحیح بخاری باب التفسیر، سنن نسائی باب التفسیر و دیگر مفسرین کے نزدیک ہجرت کے موقع پر مقام جحفہ میں نازل ہوئی ہے۔ اگر وفات حضرت ابوطالب علیہ السلام سے پہلے یہ آیت

---

[1] ۲۵ فرقان: ۶۳

نازل ہوگئی ہوتی تو یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ آیت از باب تطبیق وفات ابوطالب کے موقع پر تلاوت کی گئی ہے۔ اس طرح ابوطالب اس آیت کا مصداق قرار پاسکے۔ مفسرین یہ نہیں کہتے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت وفات ابوطالب کے موقع پر تلاوت فرمائی بلکہ کہتے ہیں: یہ آیت اسی مناسبت سے نازل ہوئی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّکَ لَا تَهۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ: آپ جسے چاہتے ہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔ ہدایت کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت راستہ دکھانا، دوسری صورت منزل تک پہنچانا ہے۔

اس آیت میں پہلی صورت کا ذکر نہیں ہے چونکہ ہدایت بمعنی راستہ دکھانا کی نفی رسول کریم ﷺ سلم سے نہیں ہوسکتی۔ رسولؐ تو ہر ایک کو راہ راست دکھائیں گے۔ آگے کوئی اس ہدایت کو قبول کرے یا نہ کرے۔ نجات کا راستہ دکھانا رسول کا فرض منصبی ہے۔

آیت کا موضوع دوسری صورت کی ہدایت ہے۔ یعنی منزل تک پہنچانا۔ ایمان کی منزل پر فائز کر دینا یہ رسول کی ذمہ داری نہیں ہے۔

ہدایت کے سلسلے میں پہلی صورت کا تعلق رسول سے ہے۔ یہاں آیات کا رخ رسول کریم ﷺ کی طرف ہوتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ...[1]	اے رسول! جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اس کو پہنچا دیجیے۔
اَنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ۝ [2]	ہمارے رسول کی ذمے داری تو بس واضح طور پر حکم پہنچا دینا ہے۔
فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ ۝ [3]	آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔

دوسری صورت کا تعلق انسانوں سے ہے۔ قبول ہدایت کے ذمہ دار رسول نہیں ہوتے بلکہ مکلّف انسان ذمہ دار ہوتے ہیں جن تک رسول کی تبلیغ اور دعوت پہنچ جاتی ہے۔

لَیۡسَ عَلَیۡکَ هُدٰىهُمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ... [4]	آپ کے ذمے نہیں ہے کہ انہیں (جبراً) ہدایت دیں بلکہ خدا ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

اس سلسلے میں فرمایا:

---

[1] ۵ مائدہ: ۶۷　[2] ۵ مائدہ: ۹۲　[3] ۱۳ رعد: ۴۰　[4] ۲ بقرۃ: ۲۷۲

اَفَاَنۡتَ تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَلَوۡ کَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ ۝ ۱	پھر کیا آپ اندھوں کو راہ دکھا سکتے ہیں خواہ وہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں۔
فَمَنِ اهۡتَدٰی فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡهَا ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِوَکِیۡلٍ ۝ ۲	جو ہدایت حاصل کرتا ہے وہ اپنے لیے حاصل کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔
لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ ۝ ۳	آپ ان پر مسلط نہیں ہیں۔

رسول کریم ﷺ کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ گمراہ لوگ ہدایت کی طرف آئیں بلکہ آپ اس سلسلے میں حد سے زیادہ مشتاق رہتے تھے۔ فرمایا:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا یَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ۝ ۴	شاید اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کھو دیں گے۔
فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا ۝ ۵	پس اگر یہ لوگ اس (قرآنی) مضمون پر ایمان نہ لائے تو ان کی وجہ سے شاید آپ اس رنج میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

اِنَّكَ لَا تَهۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ: ہدایت و ایمان کی منزل تک پہنچانا آپ کا کام نہیں ہے۔ خواہ آپ کی کتنی ہی خواہش ہو کہ اسے پورا ہوتے نہ دیکھ کر آپ ﷺ کو جان سے ہاتھ دھونے کی حد تک افسوس ہو جائے۔

اس آیت کا تعلق اس سلسلۂ آیات سے ہے۔ اس آیت کا لب و لہجہ ایک شخص کے عدم ایمان سے مربوط نہیں ہے۔

ابو طالب کا ایمان

ہم ان روایات کا جائزہ لیتے ہیں جو معاذ اللہ کفر ابوطالب کے بارے میں جعل ہوئی ہیں۔

i۔ پہلی روایت ابوہریرہ کی ہے:

جب ابوطالب کی وفات کا وقت آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے چچا! لا الہ الا اللّٰہ کہیں، میں قیامت کے دن آپ کے لیے گواہی دوں تو ابوطالب نے کہا: اگر قریش والوں کے طعنے کا ڈر نہ ہوتا کہ موت کے ڈر سے یہ کلمہ کہنے پر آمادہ ہوا ہے تو میں اس کلمہ کا اقرار کرتا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّكَ لَا تَهۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ ....

---

۱ ۱۰ یونس: ۴۳ ۲ ۳۹ زمر: ۴۱ ۳ ۸۸ غاشیۃ: ۲۲ ۴ ۲۶ شعراء: ۳ ۵ ۱۸ کہف: ۶

اس روایت میں دو باتیں قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ روایت سے کلمہ توحید پر عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ صرف عدم اظہار کی وجہ بتائی ہے۔ دوم یہ کہ کلمۂ توحید کا اقرار نہ کرنے اور موت سے ڈر میں کیا ربط ہے؟ اگر توحید کا عقیدہ دل میں تھا تو اظہار نہ کرنے کی صورت میں موت کا ڈر ہے، اگر توحید کا عقیدہ دل میں نہ تھا تو توحید کا اقرار کرنے نہ کرنے سے موت کا کوئی تعلق نہیں چونکہ مشرک موت کے بعد کی زندگی کا قائل نہیں ہے۔کلمہ کہنے سے موت ٹل نہیں سکتی کہ یہ کہے: موت کے ڈر سے کلمہ کہہ کر موت کو ٹال دیا۔

اس روایت پر اہم سوال یہ ہے کہ ابوہریرہ نے بالاتفاق ہجرت کے ساتویں سال، فتح خیبر کے سال اسلام قبول کیا۔ وہ حضرت ابوطالب رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی رحلت کے دس سال بعد مسلمانوں کے درمیان آئے تھے۔ وفات ابوطالب علیہ السلام کے وقت وہ ملک یمن کی دوس نامی بستی کے نہایت ناداروں میں لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوتے تھے اور ابوہریرہ نے بھی یہ نہیں کہا کہ اس نے یہ واقعہ کو کس سے سنا۔ اس قسم کی روایت کو مرسلہ کہتے ہیں جو قابل اعتنا نہیں ہے۔ ابوہریرہ کے بارے میں علامہ شرف الدین عاملی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ابوھریرہ اور مصری محقق محمود ابوریّہ کی کتاب ابوھریرۃ شیخ المضیرۃ کا مطالعہ ضروری ہے۔

ii۔ دوسری روایت حضرت ابن عباس کی طرف منسوب ہے کہ یہ آیت ابو طالب کے عدم ایمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ روایت بھی مرسلہ ہے چونکہ ابن عباس وفات ابوطالب کے وقت طفل شیر خوار تھے۔ چنانچہ ابن عباس کی ولادت وفات ابوطالب کے سال ہوئی۔[1]

دوسری اہم بات یہ ہے ابن عباس کی طرف منسوب روایت کی سند میں ابو سھل السری ہے جو کذّاب سارق الحدیث ہے۔ ملاحظہ ہو البدایۃ و النھایۃ ۵: ۳۷۶۔ میزان الاعتدال ۲: ۱۱۷ نمبر ۳۰۸۹۔ کتاب المجروحین ۱: ۳۵۵ نیز اس سند میں عبد القدوس ابوسعید الشامی الدمشقی ہے۔ عبدالرزاق کہتے ہیں: میں نے ابن المبارك کو عبد القدوس کے علاوہ کسی کو کذاب کہتے نہیں سنا۔ ابن حیان کہتے ہیں کہ یہ شخص ثقہ لوگوں کی طرف نسبت دے کر حدیث جعل کرتا تھا۔[2]

iii۔تیسری روایت۔ اسی موضوع پر انہی ابو سھیل السری کذاب اور عبدالقدوس کذاب نے ابن عمر کی طرف نسبت دی ہے۔[3]

iv۔ چوتھی روایت جسے صحیح بخاری میں جگہ ملی سعید بن المسیب کی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ موت کے وقت ابو طالب کے پاس ابو جھل اور عبد اللّٰہ بن ابی امیہ حاضر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے چچا! لا الہ الا اللّٰہ کہیں۔ ابو طالب نے یہ کلمہ کہنے سے انکار کیا۔

ہم سند کا حال دیکھتے ہیں: بدر الدین عینی عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ القصص باب انك لا تھدی جلد نہم صفحہ ۸۴ طبع قسطنطنیہ میں اور شاہ نور الحق

[1] الاصابۃ ۲: ۳۳۱　[2] میزان الاعتدال ۲: ۶۴۳ نمبر ۵۱۵۶　[3] الد المنثور ذیل آیت

دھلوی تیسیر القاری شرح صحیح بخاری جلد چہارم صفحہ۶۔۵ طبع مطبع علوی لکھنو میں لکھتے ہیں:

کرمانی نے کہا ہے کہ کہا جاتا ہے یہ اسناد صحیح بخاری کی شرط اور معیار کے مطابق نہیں ہیں چونکہ مسیب سے صرف اس کا بیٹا روایت کرتا ہے اور صاحب التلویح نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحابہ کی مرسل روایات میں سے ہے اور صاحب التواضیح نے اس کی تائید کی ہے۔ چونکہ مسیب بنابرقول مصعب فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والوں اور عسکری کے بقول زیر شجرہ بیعت کرنے والوں میں سے ہے۔ جو بھی ہو یہ شخص ابو طالب کی وفات کے وقت حاضر نہ تھا۔ چنانچہ ابو طالب اور خدیجہ رضی اللہ عنہا دونوں ایک سال میں وفات پا گئے۔ بعض نے یہ کہہ کر اس بات کو رد کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسیب کے بعد میں اسلام لانے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ابو طالب کی وفات کے وقت حاضر نہ تھے۔ جیسا کہ عبد اللّٰہ بن ابی امیہ حاضر تھا۔ وہ اس وقت کافر تھا۔ بعد میں اسلام قبول کیا۔ جواب یہ ہے: عبد اللہ بن ابی امیہ کا ابو طالب کی وفات کے وقت حاضر ہونا صحیح روایت میں ثابت ہے لیکن وفات ابوطالب کے وقت مسیب کا کفر کی حالت میں حاضر ہونا، نہ صحیح روایت سے ثابت ہے، نہ غیر صحیح روایت سے۔ جو بات احتمال کے بغیر کی گئی ہو وہ ایک احتمال سے مسترد نہیں ہو سکتی۔ فافھم۔

حدیث ضحضاح

بخاری اور مسلم نے سفیان ثوری سے، انہوں نے عبد الملك بن عمیر سے، انہوں نے عبداللہ بن حارث سے روایت کی ہے:

ہم سے عباس بن مطلب نے بیان کیا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ابوطالب آپ کی حفاظت کرتے اور آپ کی خاطر وہ لوگوں سے غیض و غضب میں آتے تھے تو اس سے ان کو کوئی فائدہ ملا؟ جواب میں فرمایا:

ان اباطالب فی ضحضاح من النار و لو لا انا لکان فی الدرك الاسفل۔[1]

ابوطالب آتش کے تالاب میں ہیں اگر میں نہ ہوتا تو (جہنم کے) نچلے طبقوں میں ہوتے۔

اس روایت کی سند میں واقع تینوں راویوں کا حال معلوم کرتے ہیں:

۱۔ سفیان ثوری کے متعلق مستند اصحاب رجال لکھتے ہیں:

---

[1] صحیح بخاری ابواب المناقب صحیح مسلم کتاب الایمان

انه کان یدلس ویکتب عن الکذابین۔[1]	وہ تدلیس کا مرتکب تھا اور کذاب راویوں سے روایت لکھتے تھے۔

ii۔ دوسرے راوی عبدالملك بن عمیر کوفی کے بارے میں ابو حاتم کہتے ہیں: لیس بحافظ تغیر حفظه۔ وہ حدیث کا حافظ نہیں ہے اس کا حافظہ خراب تھا۔ احمد کہتے ہیں: ضعیف یغلط۔ وہ ضعیف ہے اور غلطی کر جاتا ہے۔

کوسج نے احمد سے نقل کیا ہے: انّه ضعفه جداً۔ انہوں نے عبد الملک کو بہت ضعیف قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو میزان الاعتدال۔

قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ حدیث ضحضاح قرآن کی متعدد آیات کی صراحت کے ساتھ متصادم ہے کہ جو لوگ شرک و کفر کی حالت میں مرتے ہیں ان کے لیے عذاب میں نہ تخفیف ہو گی، نہ شفاعت نصیب ہو گی۔ حدیث ضحضاح میں حضرت ابوطالب رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے لیے تخفیف و شفاعت کا ذکر ہے۔

ایمان ابوطالب کے شواہد

ابوطالب رضوان اللہ تعالیٰ علیہ جیسے محافظ رسول مدافع و مجاہد اسلام کے ایمان کو ثابت کرنے کے لیے شواہد پیش کرنے کی نوبت آنا خود ایک المیہ اور تاریخ کے مظالم میں سے نہایت افسوسناک ظلم ہے۔

ا۔ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغة ۱۴: ۷۰ میں لکھا ہے:

روی باسانید کثیرة بعضها عن العباس بن المطلب و بعضها عن ابی بکربن ابی قحافة ان اباطالب ما مات حتی قال: لااله الاالله محمد رسول الله و الخبر مشهور ان ابا طالب عند الموت قال کلاماً خفیا فاصغی الیه اخوه العباس۔	کثیر سندوں سے، بعض عباس بن عبدالمطلب سے اور بعض ابوبکر بن ابی قحافہ سے روایت ہے کہ ابوطالب کلمہ لا اله الا الله محمد رسول الله کہے بغیر دنیا سے نہیں گئے اور یہ روایت مشہور ہے کہ ابوطالب نے اپنی موت کے وقت دھیمی آواز میں کچھ کلام کیا تو ان کے بھائی عباس نے کان لگا کر سنا تھا۔

الغدیر ۷: ۳۹۶ کے مطابق ابوالفداء نے اپنی تاریخ ۱: ۱۲۰ میں اور شعرانی نے کشف الغمة ۲: ۱۴۴ میں لکھا ہے:

فلما تقارب من ابی طالب الموت	جب ابو طالب کے لیے موت قریب آئی تو ہونٹ

[1] میزان الاعتدال

جعل يحرك شفتيه فاصغى اليه العباس باذنه و قال: و اللّٰه يا ابن اخى لقد قال الكلمة التي امرته ان يقولها، فقال رسول اللّٰه: الحمد للّٰه الذى هداك يا عمّ۔

ہلانے لگے تو عباس بن مطلب نے کان لگا کر سنا پھر کہا: اے میرے بھائی کے بیٹے قسم بخدا ابوطالب نے وہی کلمہ کہہ دیا جس کا آپ اسے حکم دیتے تھے۔ جس پر رسول اللہ نے فرمایا: حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے تجھے ہدایت دی ہے اے چچا!

۲۔ بستر رسولؐ پر

حضرت علی علیہ السلام شب ہجرت بستر رسول اللہ ﷺ پر نہیں سوئے بلکہ حضرت ابوطالب رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے حکم سے علی علیہ السلام کو بستر رسول پر سلاتے تھے تاکہ رات کی تاریکی میں کوئی گزند نہ پہنچ سکے۔ ملاحظہ ہو شرح نہج البلاغة ابن ابی الحدید۱۴: ۶۴۔ تفصیل ملاحظہ ہو الغدیر ۷: ۴۸۱

اگر ابو طالب کو رسول کی رسالت پر ایمان نہ ہوتا اور خاندانی غیرت وحمیت کی وجہ سے رسول کی حمایت کرتے تو اپنے فرزند علی علیہ السلام کو رسولؐ کی جگہ خطرے میں نہ ڈالتے چنانچہ شعب ابوطالب میں محاصرے کے دوران ہمیشہ بستر رسولؐ پر اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو سلا دیتے تھے۔

۳۔ شامی راہب (بحیرہ) کا واقعہ

رسول اللہ ﷺ حضرت ابو طالب علیہ السلام کے ہمراہ سفر شام کے راستے میں تھے۔ بحیرہ راہب نے آپؐ میں نبوت کی علامات دیکھیں تو ابو طالب نے اس موقع پر کہا:

ان ابن امنة النبی محمداً
عندی یفوق منازل الا ولاد
آمنہ کا بیٹا نبی محمد میرے نزدیک
اولاد سے زیادہ عزیز ہے۔

الخصائص الکبریٰ ۱: ۴۴ میں بھی اس موقع کے حضرت ابو طالب علیہ السلام کے اشعار مذکور ہیں۔

۴۔ خشک سالی میں حضرت ابو طالب علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو طلب باران کے لیے وسیلہ بنایا اور اس موضوع پر آپؐ کی مدح میں ایک شعر کہا جو بڑے شہنشاہوں کی شان میں کہا جاتا ہے:

وابیض یستقی الغام بوجهه
ثمالی الیتامی عصمة للارامل
آپ کے نورانی چہرے سے باران طلب کیا جاتا ہے۔
آپ یتیموں کے سرپرست اور بیواؤں کے محافظ ہیں۔[1]

---

[1] شرح صحیح بخاری قسطلانی ۲: ۲۲۷

۵۔ ابو طالب رضوان اللہ علیہ نے حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دائیں طرف نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے بیٹے جعفر سے فرمایا: اپنے ابن عم کے بائیں طرف نماز پڑھو۔[1]

قریش نے ایک عہد نامہ لکھا کہ جب تک بنی ہاشم محمد کو ہمارے حوالہ نہیں کرتے مقاطعہ جاری رکھا جائے گا۔ اس عہد نامے کو کعبہ پر آویزاں رکھا کچھ دن بعد رسول اللہؐ نے حضرت ابو طالب کو خبر دی مجھے وحی کے ذریعہ خبر ملی ہے کہ اس عہد نامہ کو دیمک نے چاٹ دیا ہے صرف اسم اللہ کو باقی رکھا ہے۔

حضرت ابو طالب نے قریش سے کہا: اس عہد نامہ کو بغرض ترمیم دیکھا جائے۔ قریش نے سمجھا ابو طالب محمد کو ہمارے حوالہ کرنے کے لیے کچھ ترمیم چاہتے ہوں گے۔ جب نیچے اتارا، کھولنے سے پہلے حضرت ابو طالب نے قریش کو بتا دیا کہ میرے بیٹے محمد نے خبر دی ہے کہ اس عہد نامے کو سوائے اسم اللہ کے دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ اگر خبر صحیح نہ نکلی تو میں محمد کو تمہارے حوالہ کر دوں گا۔ کھولا گیا تو دیکھا نام خدا کے علاوہ عہد نامے کا کوئی حصہ باقی نہیں ہے۔ اس پر قریش نے کہا: محمد جادوگر ہے۔

اس موقع پر حضرت ابو طالبؓ کے اشعار کے حرف حرف سے ایمان کی روشنی پھوٹتی ہے۔ چشم بینا رکھنے والوں کے لیے طبقات ابن سعد، تاریخ یعقوبی، سیرت ابن ہشام، تاریخ ابن کثیر، الاستیعاب وغیرہ میں یہ روشنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آئے گی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الغدیر ۷: ۴۸۹۔ صرف ایک شعر ملاحظہ ہو:

نبی الإله والکریم باصله
واخلاقه وهو الرشید المؤید

وہ معبود کے نبی ہیں۔ وہ ذات و اخلاق دونوں اعتبار سے مکرم ہیں
اور وہ صاحب عقل و خرد ہیں جس کو (اللہ کی) تائید حاصل ہے۔

۶۔ قریش کے لیے ابو طالبؓ کی وصیت

موت جب قریب آ گئی تو قریش کے لیے ایک وصیت فرمائی۔ اس کا ایک حصہ یہ الفاظ ہیں:

واوصیکم بمحمد خیراً فانه الامین	میں وصیت کرتا ہوں کہ محمد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو
فی قریش والصدیق فی العرب	چونکہ وہ قریش میں امین عربوں میں راستگو، وہ ان
وهو الجامع لکل ما اوصیتکم به وقد	تمام اوصاف حمیدہ کے مالک ہیں جو میں نے اس
جاء نا بامر قبله الجنان وانکره	وصیت میں بیان کیے ہیں وہ ہمارے پاس ایک ایسا

[1] اسد الغابة ۱: ۳۴۱

اللسان مخافة الشنئان...[۱] امر لے کر آئے ہیں جسے دلوں نے تو مان لیا مگر زبانوں نے دشمنی کے خوف سے انکار کیا۔

۷۔ بنی ہاشم کے لیے وصیت:

لن تزالو بخير ما سمعتم من محمد وما اتبعتم امره فاتبعوه واعينوه ترشدوا۔[۲] جب تک تم محمد کا فرمان سنتے رہو گے اور ان کی اتباع کرتے رہو گے تمہاری خیر ہو گی۔ پس ان کی اتباع کرو اور اس کی مدد کرو، کامیاب رہو گے۔

۸۔ ادیان عالم میں بہتر دین

اس سلسلے میں ایک شعر ہے جس سے نہ صرف ان کا ایمان ثابت ہوتا ہے بلکہ اس ایمان کی قوت کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

ولقد علمت ان دين محمد
من خير اديان البرية دينا
مجھے علم ہو گیا ہے کہ محمد کا دین تمام
انسانوں کے دین سے بہتر ہے۔

(دیوان ابو طالب)

۹۔ ابوطالب کے لیے استغفار

قرآن میں صریح حکم ہے کہ حالت شرک میں مرنے والوں کے لیے استغفار ممنوع ہے:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝[۳] نبی اور ایمان والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت طلب کریں خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں جب کہ یہ بات ان پر عیاں ہو چکی ہے کہ وہ جہنم والے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حضرت ابو طالبؑ کے لیے بعد وفات استغفار کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے تاہم ملاحظہ ہو ابو داؤد، نسائی، بیهقی، دلائل النبوۃ وغیرہ جب کہ قرآن کا اٹل فیصلہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ...۔[۴] اللہ اس بات کو یقیناً معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا جائے....

سوال ہوا: کیا آپ ابو طالب کے لیے خیر کی امید رکھتے ہیں؟ فرمایا:

---

[۱] تاریخ خمیس، السيرة الحلبية [۲] الطبقات الكبرى ۱:۱۲۳ [۳] ۹ توبۃ: ۱۱۳ [۴] ۴ نساء: ۴۸

کل الخیر ارجو من ربی۔ میں اپنے رب سے تمامتر خیر کی امید رکھتا ہوں۔

ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حضرت ابوطالب رضوان اللہ علیہ کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

لعلۃ تنفعہ شفاعتی یوم القیامۃ امید ہے قیامت کے دن میری شفاعت انہیں فائدہ دے گی۔

ملاحظہ ہو بخاری صفحہ ۶۵۲ رقم ۳۸۸۵ بحوالہ خصائص علی علیہ السلام قاری ظہور احمد صفحہ ۳۳۷۔

یہ حدیث بھی نہایت قابل توجہ ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

رسول اللہ ؐ نے مجھ سے ایک بات فرمائی جو پوری دنیا سے میرے لیے بہتر تھی۔ قال لی کلمۃ ما احب ان لی بھا الدینا۔ بعض روایات میں اس جملہ کے بعد یہ الفاظ ہیں: یعنی فی ابی طالب حین مات۔ وہ ابو طالب کے بارے میں فرمائی ان کی وفات کے وقت۔[1]

۱۰۔ میں دین احمد پر ہوں

حضرت ابو طالب نے اپنے ایک شعری اقرار میں کہا:

یا شاھد الخلق علی فاشھد
انی علی دین النبی احمد
اے مخلوق پر شہادت والے تو گواہ
رہ میں احمد نبی کے دین پر ہوں۔[2]

۱۱۔ ابو طالب کے ایمان کا منکر جہنمی ہے

روایت ہے حضرت امام رضا علیہ السلام سے ایمان ابوطالبؑ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے سائل سے فرمایا:

انک ان لم تقر بایمان ابی طالب کان مصیرك النار۔[3] اگر کوئی ایمان ابو طالب کا اقرار نہیں کرتا ہے تو وہ جہنمی ہے۔

۱۲۔ بغض ابو طالب کفر ہے

یہ فتویٰ کسی شیعہ کا نہیں بلکہ امام اہل سنت احمد بن الحسین الموصلی الحنفی نے اپنی کتاب

---

[1] خصائص نسائی صفحہ ۳۳۷۔ تحقیق قاری ظھور احمد [2] دیوان ابو طالب [3] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۱۴: ۶۸

شرح شهاب الاخبار تالیف علامه محمد بن سلامة القضاعی متوفی ۴۵۴ھ میں لکھا ہے:

ان بغض ابی طالب کفر

علامه علی اجهوری مالکی نے بھی اپنے فتاویٰ اور تلمسانی نے حاشیة علی الشفاء میں لکھا ہے:

ابو طالب کی حمایت و نصرت کا ذکر کرنا چاہیے اور ان کو برا کہنا اذیت رسولؐ کا باعث ہے اور رسولؐ کو اذیت دینا کفر ہے اور کافر کو قتل کیا جاتا ہے۔[۱]

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ۔[۲]

وَقَالُوۡۤا اِنۡ نَّتَّبِعِ الۡہُدٰی مَعَکَ نُتَخَطَّفۡ مِنۡ اَرۡضِنَا ؕ اَوَ لَمۡ نُمَکِّنۡ لَّہُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجۡبٰۤی اِلَیۡہِ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اور کہتے ہیں: اگر ہم آپ کی معیت میں ہدایت اختیار کریں تو ہم اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے، کیا ہم نے ایک پرامن حرم ان کے اختیار میں نہیں رکھا جس کی طرف ہر چیز کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں؟ یہ رزق ہماری طرف سے عطا کے طور پر ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالُوۡۤا اِنۡ نَّتَّبِعِ الۡہُدٰی: بعض مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی حقانیت کو مان لینے کے بعد ان پر ایمان لانے کے لیے یہ عذر پیش کیا: اگر ہم ایمان لے آئیں تو عرب مشرکین ہمیں مکہ کی سرزمین سے اٹھا کر اپنا اسیر بنا کر لے جائیں گے۔ اس خوف کی وجہ سے ہم ایمان نہیں لاتے۔

۲۔ اَوَ لَمۡ نُمَکِّنۡ لَّہُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا: تمہیں ہم نے ایک ایسے حرم میں بسایا ہے جس میں امن و سلامتی ہے۔ عرب آپس کے قتل و غارت اور جنگ وقتال میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن شہر مکہ میں ہر قسم کا امن و سلامتی ہے۔ کسی قسم کی جنگ اور اسیری کا یہاں کوئی خوف نہیں ہے۔

۳۔ یُّجۡبٰۤی اِلَیۡہِ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیۡءٍ: حرم مکہ میں نہ صرف کوئی خوف نہیں ہے بلکہ یہاں کی معیشت کی حالت بھی دوسرے علاقوں سے بہتر ہے۔

---

[۱] الغدیر ۷: ۵۱۳ [۲] ۵۰ ق: ۳۷

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾	۵۸۔ اور کتنی ہی ایسی بستیوں کو ہم نے تباہ کر دیا جن کے باشندے اپنی معیشت پر نازاں تھے؟ ان کے بعد ان کے مکانات آباد ہی نہیں ہوئے مگر بہت کم اور ہم ہی تو وارث تھے۔

تشریح کلمات

بَطِرَتْ : (ب ط ر) البطر وہ دہشت جو خوشحالی کے غلط استعمال، حق نعمت میں کوتاہی اور نعمت کے غلط استعمال سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ: نعمتوں کی فراوانی پر طغیانی کی وجہ سے گذشتہ قوموں کی بہت سی بستیاں تباہ ہوئیں۔

۲۔ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ : ان کے بعد ان کے مکانات کو آباد کرنے والے بھی نہ رہے۔ ان کی نسلیں بھی تباہ ہوئیں۔ صرف چند ہی لوگ رہ گئے۔

۳۔ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ : اللہ فرماتا ہے: ہم ہی وارث بنے۔ ہمارے علاوہ ان گھروں کا مالک بننے کے لیے کوئی باقی نہ رہا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾	۵۹۔ اور آپ کا رب ان بستیوں کو تباہ کرنے والا نہ تھا جب تک ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات پڑھ کر سنائے اور ہم بستیوں کو تباہ کرنے والے نہ تھے مگر یہ کہ وہاں کے باشندے ظالم ہوئے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى : یہ ایک حکم کلی اور قانون عام ہے کہ جب تک حجت پوری نہیں ہوتی، احکام بیان نہیں ہوتے اور اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچ نہیں جاتا، اس وقت تک انسان اس حکم کا

جوابدہ نہیں ہے جو ابھی بیان ہی نہیں ہوا۔

۲۔ حَتّٰی یَبۡعَثَ فِیۡۤ اُمِّہَا رَسُوۡلًا: جب تک بستیوں کے مرکز میں رسول نہ بھیج دے۔ یہ ایک کلی دستور کا بیان ہے جس پر تاریخ انبیاء میں عمل ہوتا رہا۔ بستیوں کے مرکز کہیے یا دارالحکومت، اس میں رسول مبعوث کر کے اللہ تعالیٰ انسانوں تک پیغام حق پہنچانا آسان بنانا چاہتا ہے۔ صدر مقام کی طرف اطراف کی بستیوں کا رجوع ہوتا ہے۔ مرکز میں پیش آنے والا ہر واقعہ اطراف کی بستیوں تک آسانی اور سرعت کے ساتھ پہنچ جاتا ہے۔ مرکز میں پیش آنے والے واقعہ کو اہمیت مل جاتی ہے۔

ثانیاً صدر مقام اور مرکز کے رہنے والے تمدن یافتہ، تہذیب کے مالک ہوتے ہیں۔ جب کہ پسماندہ علاقوں کے لوگوں میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا ...۔[۱] مرکز میں رونما ہونے والے واقعات سے اطراف کی بستیاں متاثر ہوتی ہیں جب کہ بستیوں کے واقعات سے مرکز کے لوگ اثر نہیں لیتے۔

۳۔ وَ مَا کُنَّا مُہۡلِکِی الۡقُرٰۤی: رسول مبعوث ہونے کے بعد اگر وہ اس رسول کی تکذیب اور اس پر ظلم نہ کریں تو صرف ایمان نہ لانے پر بھی ہم انہیں ہلاکت میں نہیں ڈالتے بلکہ اتمام حجت ہونے پر جواباً قبول حجت کی جگہ تکذیب و ایذاء کی صورت میں انہیں ہلاکت میں ڈال دیا جاتا ہے۔

یہ مکہ کے مشرکین کی طرف اشارہ ہے کہ ان پر عذاب نازل ہونے کی تمام شرائط موجود ہیں۔ ان کے صدر مقام مکہ میں رسول مبعوث ہوئے۔ اس رسول کی طرف سے آیات کی تلاوت بھی ہو رہی ہیں اور اہل مکہ اس رسول پر ظلم کا پہاڑ توڑ رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اتمام حجت اللہ کی طرف سے، جواباً ظلم و ستم لوگوں کی طرف سے ہوا تو اس قوم پر ہلاکت آ جائے گی۔

وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ زِیۡنَتُہَا ۚ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ع

۶۰۔ اور جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ اس دنیاوی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ (اس سے) زیادہ بہتر اور پائیدار ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ: جو لوگ حق کے ظاہر ہونے کے باوجود دنیوی زندگی کے متاثر ہونے

---
[۱] ۹ توبۃ: ۹۷

کے خوف سے ایمان نہیں لا رہے ہیں ان سے یہ خطاب ہے جیسا کہ ان لوگوں نے کہا تھا:

اِنۡ نَّتَّبِعِ الۡهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفۡ مِنۡ اَرۡضِنَا۔۔۔۔ اگر ہم آپ کی معیت میں ہدایت اختیار کریں ہم اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔

اس کے جواب میں فرمایا: اول تو ایمان لانے سے تمہاری دنیوی زندگی متاثر نہیں ہوگی۔ ثانیاً اگر متاثر ہو بھی جائے تو یہ چند روزہ فانی زندگی متاثر ہوگی مگر تمہاری ہمیشہ کی ابدی زندگی سنور جائے گی اور ایمان نہ لانے سے ابدی زندگی متاثر ہوگی اور چند روزہ فانی زندگی بحال رہے گی۔

۲۔ اَفَلَاتَعۡقِلُوۡنَ: کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ چند روز کی زندگی کے لیے ابدی زندگی کو ختم کر رہے ہو جب کہ تمام عقلاء اپنے مستقبل کی آسائش کے لیے بہت مشقت اٹھاتے ہیں۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ بڑے مفادات کے لیے چھوٹے مفادات اور لمبی آسائش کے لیے مختصر آسائش کی قربانی دی جائے اور عمر بھر کے آرام کے لیے وقتی درد والم پر صبر کیا جائے۔

اہم نکات

۱۔ عقل کا تقاضا ہے کہ ایک تابناک مستقبل سنوارنے کے لیے کچھ دن مشقت برداشت کی جائے۔

اَفَمَنۡ وَّعَدۡنٰهُ وَعۡدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيۡهِ كَمَنۡ مَّتَّعۡنٰهُ مَتَاعَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ثُمَّ هُوَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ کیا وہ شخص جسے ہم نے بہترین وعدہ دیا ہے اور وہ اس (وعدے) کو پا لینے والا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف دنیاوی زندگی کا سامان فراہم کر دیا ہے؟ پھر وہ قیامت کے دن پیش کیے جانے والوں میں سے ہوگا۔

تفسیر آیات

اس آیت میں بھی دو زندگیوں کا موازنہ ہے کہ ایک زندگی یہ ہے کہ اللہ نے جس جنت اور نعمت سے مالا مال ابدی زندگی کا وعدہ کیا ہے، فَهُوَ لَاقِيۡهِ وہ وعدۂ الٰہی ہے۔ اس پر وعدہ خلافی کا امکان نہیں ہے:

اَلَاۤ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۔۔۔[۱] اس بات پر بھی آگاہ رہو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

جس زندگی میں وہ وعدہ الٰہی سے بہرہ ور ہو رہا ہے کیا یہ اس زندگی کی طرح ہو سکتی ہے جو چند روز کی زندگی کے وقتی عیش و آرام کے لیے گناہ کا بوجھ اٹھائے اور یہ بوجھ لے کر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اس مقدمہ

---

[۱] ۱۰ یونس: ۵۵

کے لیے حاضر ہو جائے جس کے ہارنے کے نتیجے میں وہ اپنی ابدی زندگی ہار جاتا ہے؟

ابن عباس کی روایت ہے: اَفَمَنۡ وَّعَدۡنٰہُ ... حمزہؓ، جعفرؓ اور علی علیہ السلام کی شان میں ہے اور کَمَنۡ مَّتَّعۡنٰہُ ... ابوجہل کے بارے میں ہے۔[1] اسی مضمون کی روایت مجاھد سے ابان بن تغلب اور ابن جریح نے بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر طبری ذیل آیت۔

اہم نکات

۱۔ وعدہ الٰہی پر بھروسے سے ہی سعادت کی زندگی ملتی ہے۔

۲۔ دنیا کی زندگی میں کامیابی ابدی نجات کی علامت نہیں ہے۔

۳۔ غافلانہ زندگی کا انجام ذلت و رسوائی ہے۔

وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ فَیَقُوۡلُ اَیۡنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیۡنَ کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اور جس دن اللہ انہیں پکارے گا اور کہے گا: کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک گمان کرتے تھے؟

قَالَ الَّذِیۡنَ حَقَّ عَلَیۡہِمُ الۡقَوۡلُ رَبَّنَا ہٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَغۡوَیۡنَا ۚ اَغۡوَیۡنٰہُمۡ کَمَا غَوَیۡنَا ۚ تَبَرَّاۡنَاۤ اِلَیۡکَ ۫ مَا کَانُوۡۤا اِیَّانَا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ جن پر (اللہ کا) فیصلہ حتمی ہو چکا ہو گا وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار! یہی لوگ ہیں جنہیں ہم نے گمراہ کیا، جس طرح ہم خود گمراہ ہوئے تھے اسی طرح ہم نے انہیں گمراہ کیا تھا، (اب) ہم تیری طرف متوجہ ہو کر ان سے بیزار ہوتے ہیں کہ وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ: قیامت کے دن جب ان کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے گا۔ حقائق سامنے آئیں گے تو ان سے سوال ہوگا: کہاں ہیں وہ تمہارے معبود جن کو تم نے میرا شریک بنایا تھا؟

۲۔ قَالَ الَّذِیۡنَ حَقَّ عَلَیۡہِمُ الۡقَوۡلُ: ان میں سے جن پر عذاب الٰہی حتمی ہو چکا ہو گا اور نجات کے سارے راستے بند ہو چکے ہوں گے۔ قسمت کا فیصلہ دیکھ چکے ہوں گے۔ وہ اس طرح اعتراف کریں گے:

---

[1] شواھد التنزیل ذیل آیہ

۳۔ ہٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَغۡوَیۡنَا: یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ یعنی مخاطبین میں سے کفر کے سرکردہ لوگ جواب دیں گے: ان لوگوں کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔

۴۔ اَغۡوَیۡنٰہُمۡ کَمَا غَوَیۡنَا: ان لوگوں کو ہم نے گمراہ کیا۔ ہمارے اشارے پر یہ گمراہ ہوئے۔ ہم نے کسی پر جبر نہیں کیا۔ جس طرح ہم خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے تھے۔ ہم پر بھی کسی نے جبر نہیں کیا۔

۵۔ تَبَرَّاۡنَاۤ اِلَیۡکَ: اب ہم تیری طرف متوجہ ہو کر ان سے بیزار ہوتے ہیں۔ ان کے مشرکانہ عمل سے بیزاری اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ ہم نے انہیں مجبور نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے اختیار سے شرک کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی بنا پر ان لوگوں نے اگلا جملہ کہا:

۶۔ مَا کَانُوۡۤا اِیَّانَا یَعۡبُدُوۡنَ: یہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے۔ ہماری پرستش اس وقت ہوتی جب ہم ان کو مجبور کرتے۔ اب چونکہ ان لوگوں نے اپنے اختیار سے شرک کیا ہے لہٰذا اس کے خود ذمہ دار ہیں۔ ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔

ان کی منطق یہ ہے کہ اگر ہم نے ان سے جبراً شرک کا کام لیا ہوتا تو یہ ہمارا عمل شمار ہوتا۔ ہم نے تو صرف ان کو دعوت دی تھی اس کو ان لوگوں نے اپنے اختیار سے قبول کیا ہے لہٰذا یہ خود ان کا عمل شمار ہو گا۔

(استفادہ از المیزان)

اہم نکات

۱۔ غیر خدا پر بھروسہ ایک واہمہ ہے۔

۲۔ ہمیشہ دوسروں کو وہ لوگ گمراہ کرتے ہیں جو خود گمراہ ہیں۔

وَ قِیۡلَ ادۡعُوۡا شُرَکَآءَکُمۡ فَدَعَوۡہُمۡ فَلَمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَہُمۡ وَ رَاَوُا الۡعَذَابَ ۚ لَوۡ اَنَّہُمۡ کَانُوۡا یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اور (ان سے) کہا جائے گا: اپنے شریکوں کو بلاؤ تو یہ انہیں پکاریں گے لیکن وہ انہیں جواب نہیں دیں گے اور وہ عذاب کو بھی دیکھ رہے ہوں گے، (اس وقت تمنا کریں گے) کاش وہ ہدایت پر ہوتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قِیۡلَ ادۡعُوۡا شُرَکَآءَکُمۡ: ان سے کہا جائے گا: جنہیں تم نے شریک بنایا ہے انہیں آج کمک کے لیے بلاؤ کہ وہ تمہیں اس عذاب سے بچا لیں۔ یہ ان کی رسوائی کا اعلان ہے۔

۲۔ فَدَعَوۡہُمۡ فَلَمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَہُمۡ: پس انہوں نے ان شریکوں کو پکارا۔ قیامت کے دن حقائق

سامنے آ چکے ہوتے ہیں۔ ان کو علم ہو گیا ہوتا ہے کہ ان کے شریک تو ایک واہمہ کے علاوہ کچھ نہ تھے تو ان کو کیسے بلایا ہو گا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنے شریکوں کو بلاتے تو بھی کوئی جواب نہیں ملنا تھا یا اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے: اُدۡعُوۡا شُرَکَآءَکُمۡ ان مشرکین کی رسوائی کی ایک تعبیر ہے۔ اور فَدَعَوۡہُمۡ ان مشرکین کی حسرت کی تعبیر ہے کہ دنیا میں انہی بتوں اور غیر اللہ کو پکارتے رہے۔ آج اگر کچھ ان سے بنتا تو ضرور ان کو پکارتے۔

۳۔ وَ رَاَوُا الۡعَذَابَ: خود معبودوں سے کسی قسم کا جواب تو کیا ملنا تھا اس کی جگہ عذاب کا مشاہدہ ہونے لگا۔ اس وقت وہ آرزو کریں گے: کاش ہم ہدایت یافتہ ہوتے۔ آج کا یہ سیاہ دن دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔ لَوۡ اَنَّہُمۡ کَانُوۡا یَہۡتَدُوۡنَ میں لَوۡ بمعنی تمنا لیا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ غیر مومن کے لیے قیامت کا دن حسرت کا دن ہے۔

وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اَجَبۡتُمُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۶۵﴾
فَعَمِیَتۡ عَلَیۡہِمُ الۡاَنۡۢبَآءُ یَوۡمَئِذٍ فَہُمۡ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۵۔ اور اس دن اللہ انہیں ندا دے گا اور فرمائے گا: تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا؟
۶۶۔ تو ان کو ان باتوں کا پتہ نہیں چلے گا (جن سے رسولوں کو جواب دیا ہے) اور اس دن وہ ایک دوسرے سے پوچھ بھی نہ سکیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ: قیامت کے دن جب منکروں سے سوال ہو گا کہ تم نے پیغمبروں کی دعوت کا کیا جواب دیا ہے تو ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑے گا۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھ بھی نہیں سکیں گے کہ مشورہ کر کے کوئی عذر گڑھ دیا جائے۔

۲۔ فَعَمِیَتۡ عَلَیۡہِمُ الۡاَنۡۢبَآءُ: ایسی کسی قسم کی بات کا وجود نہیں جس سے یہ لوگ جواب دیں۔

۳۔ فَہُمۡ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ: چونکہ منکرین سب اس مسئلے میں برابر ہیں۔ لہٰذا ایک دوسرے پوچھنے کا بھی کوئی نتیجہ نہیں ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن منکروں سے کوئی عذر نہیں بنے گا۔

فَاَمَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مِنَ الۡمُفۡلِحِیۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ لیکن جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل بجا لائے تو امید ہے کہ وہ نجات پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔

تفسیر آیات

مگر وہ لوگ جو منکر ہونے کے بعد توبہ کر کے ایمان لے آئے تو ایمان ان کے سابقہ شرک و انکار جیسے عظیم گناہوں کا کفارہ بنتا ہے اور عَمِلَ صَالِحًا عمل صالح ان کا زاد آخرت بنتا ہے تو ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے یہ لوگ نجات پانے والوں میں ہو جائیں گے۔ عَسٰی اللہ کی طرف سے نوید نجات ہے۔

اہم نکات

۱۔ توبہ، ایمان، عمل صالح نجات کے ضمانت شدہ وسیلے ہیں۔

وَ رَبُّکَ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ وَ یَخۡتَارُ ؕ مَا کَانَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اور آپ کا پروردگار جسے چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور منتخب کرتا ہے، انہیں انتخاب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، اللہ پاک بلند و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ رَبُّکَ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ وَ یَخۡتَارُ : خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ہے کہ یہ مشرکین آپؐ کے رب کے اقتدار اعلیٰ میں مداخلت کرتے ہیں جب کہ خلق و اختیار اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح خلق میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح اختیار و انتخاب میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ مشرکین اپنے لیے وسیلہ (بت) کو خود اختیار کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ میں مداخلت ہے حالانکہ جس طرح تخلیق میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، تشریع و قانون سازی میں بھی کوئی شریک نہیں ہے بلکہ اختیار، تخلیق کا لازمہ ہے۔ جب اللہ کے علاوہ کوئی خلق نہیں کر سکتا تو اس کے علاوہ اختیار و انتخاب بھی نہیں کر سکتا۔

۲۔ مَا کَانَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ : تشریعی امور کے اختیار کی نفی ہے کہ غیر اللہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی حکم کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اس کے مقابلے میں اپنا فیصلہ اور انتخاب لے آئے۔ واضح رہے کہ یہ افعال عباد سے متعلق نہیں ہے کہ نظریہ جبر کی نفی و اثبات پر اس سے استدلال کیا جائے بلکہ قانون سازی و تشریعی امور کے بارے میں ہے۔

۳۔ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ: اللہ کی ذات پاکیزہ و منزہ ہے اس خیال و تصور سے کہ کسی غیر اللہ کو اللہ کی شان میں گستاخی کرنے کا حق ہو۔ چونکہ یہ مداخلت گستاخی ہے۔

۴۔ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ: اس کی ذات بلند و برتر ہے اس بات سے کہ کسی غیر اللہ کو اس کے اقتدار اعلیٰ میں شریک ہونے کا حق ہو۔

وَ رَبُّکَ یَعۡلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوۡرُہُمۡ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ﴿۶۹﴾

۶۹۔ اور آپ کا پروردگار وہ سب باتیں جانتا ہے جنہیں ان کے سینے پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس بات کی حکمت کا بیان ہے کہ اختیار و انتخاب کا حق صرف اللہ کے لیے کیوں مخصوص ہے؟

اللہ تعالیٰ کا احاطہ علمی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو منتخب فرماتا ہے تو اس علم کی بنا پر انتخاب کرتا ہے جو اس منتخب کے ظاہر و باطن کا ہے، اس علم سے اس کا لائق انتخاب ہونے یا نہ ہونے کا تعین ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ کے پاس وہ احاطہ علمی نہیں ہے جو انتخاب و اختیار کے لیے ضروری ہے۔

وَ ہُوَ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاُوۡلٰی وَ الۡاٰخِرَۃِ ۫ وَ لَہُ الۡحُکۡمُ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ﴿۷۰﴾

۷۰۔ اور وہی تو اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ثنائے کامل اسی کے لیے ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ ہُوَ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ: آپ کا رب ہی وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں ہے۔ معبود ہونے کے اعتبار سے بھی انتخاب کا حق اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ چونکہ عبادت رب، یعنی مالک کی ہوتی ہے لہٰذا مملوک کا انتخاب صرف مالک کرے گا۔

۲۔ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاُوۡلٰی وَ الۡاٰخِرَۃِ: عبادت تعظیم قول و عمل کو کہتے ہیں اور حمد و ثنا سے ہی تعظیم ہوتی ہے۔ حمد و ثنا بھی دنیا و آخرت میں اللہ کے ساتھ مختص ہے کیونکہ کسی غیر اللہ کی حمد و ثنا ہوتی ہے تو

اس کمال کی بنیاد پر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عنایت فرمایا ہے۔ واضح رہے جو تعظیم رب اور خالق سمجھ کر نہ ہو وہ عبادت نہیں ہے۔

۳۔ وَ لَهُ الْحُكْمُ: فیصلے کا حق بھی صرف اللہ کو حاصل ہے۔ فیصلہ اللہ تعالیٰ کی حاکیت اعلیٰ سے عبارت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکیت اعلیٰ میں کسی غیر کو مداخلت کا حق نہیں ہے۔ کسی غیر اللہ کے فیصلے سے کوئی چیز حلال وحرام یا جائز و ناجائز نہیں ہوتی۔ غرض کسی قسم کا قانون زیست بنانا صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

۴۔ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: جو قانون بنائے گا اسی کے سامنے جوابدہی ہوگی۔ وہی باز پرسی کر سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ فیصلہ اسی کا ہوگا جو لائق حمد و ثنا اور معبود ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ کہد یجیے: یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ کہد یجیے: یہ تو بتاؤ کہ اگر قیامت تک اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے دن کو مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے جس میں تم سکون حاصل کرو؟ کیا تم (چشم بصیرت سے) دیکھتے نہیں ہو؟

تشریح کلمات

سَرْمَدًا: (س ر م د) السرمد کے معنی دائم، ہمیشہ کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَرَءَيْتُمْ: یہ ترکیب اخبرنی مجھے بتاؤ کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔

۲۔ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا: اس آیت کا مطمع نظر تدبیر عالم ہے جس میں شب و روز کی آمد و رفت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ تدبیر حیات میں شب و روز کے تبادل کو اگر بالفرض ختم کر دیا جائے اور ہمیشہ رات رہے تو تدبیر حیات میں جو خلل رونما ہوگا، کون ہے جو اس خلل کو دور کرے، روشنی لے

آئے اور اہل ارض کو نابودی سے بچائے؟

۳۔ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِضِیَآءٍ: اگر کوئی تدبیر عالم میں واقع ہونے والے خلل کو درست کرنے والا ہوگا تو وہ معبود ہوگا۔ صرف معبود یہ کام کر سکتا ہے۔ کوئی معبود جو ایسے خلل کو درست کر کے اپنی معبودیت کو ثابت کر دے، اگر نہیں ہے تو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

اس آیت سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ خلق اور تدبیر ناقابل تفریق ہے۔ چنانچہ روز و شب کے خالق نے ان دونوں کی تخلیق اس طرح فرمائی ہے کہ تدبیر عالم کا نظام قائم رہے۔ نہ رات کو دائمی خلق کیا، نہ دن کو۔

۴۔ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ النَّہَارَ سَرۡمَدًا: اگر اللہ کے علاوہ تمہارے معبودوں کے ہاتھ میں اس کائنات کی تدبیر ہے تو اس جاری نظام میں موجود لیل و نہار میں اپنے تدبیری عمل کا چھوٹا سا مظاہرہ کر کے دکھائیں اور رات کا سلسلہ اگر جاری رہے تو دن لانا اگر ممکن نہیں تو تھوڑی سی روشنی ہی لا کر اپنی قدرت نمائی کریں۔ سب کو معلوم ہے کہ اللہ کے علاوہ یہ کام کوئی نہیں کر سکتا تو پھر غیر اللہ کے پاس کون سی تدبیر ہے۔

وَمِنۡ رَّحۡمَتِہٖ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور یہ اللہ کی رحمت ہی تو ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن کو (یکے بعد دیگرے) بنایا تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کر سکو اور (دن میں) اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو اور شاید کہ تم شکر بجا لاؤ۔

تفسیر آیات

دن اور رات کے بارے میں انسان غور نہیں کرتے کہ دن کی روشنی حیات بخش اور رات کی تاریکی سکون بخش ہونے کے باوجود یہ دونوں اگر یکے بعد دیگرے نہ آتے بلکہ ہمیشہ دن ہوتا یا ہمیشہ رات ہوتی تو اس کرہ ارض پر زندگی مفقود ہوتی۔ اللہ اس نظام کو زندگی کے لیے مناسب اور مربوط نہ بناتا تو کون ہے جو اسے مربوط بنائے۔

وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ فَیَقُوۡلُ اَیۡنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیۡنَ کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ اور جس دن اللہ انہیں ندا دے گا اور فرمائے گا: کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک گمان کرتے تھے؟

اس مضمون کی آیت کا دوبارہ اس لیے ذکر ہوا چونکہ آنے والے مضمون کے لیے یہ تمہید ہے۔

وَ نَزَعۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیۡدًا فَقُلۡنَا ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ فَعَلِمُوۡۤا اَنَّ الۡحَقَّ لِلّٰہِ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۷۵﴾ ع

۷۵۔ اور ہم ہر امت سے ایک گواہ نکال لائیں گے پھر ہم (مشرکین سے) کہیں گے: اپنی دلیل پیش کرو، (اس وقت) انہیں علم ہو جائے گا کہ حق بات اللہ کی تھی اور جو جھوٹ باندھتے تھے وہ سب ناپید ہو جائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ ہر امت سے ایک گواہ پیش کیا جائے گا۔ یہ گواہ ایسے ہوں گے جن کی گواہی کے بعد اللہ تعالیٰ کی حقانیت بھی واضح ہو جائے گی اور اس کے خلاف کسی قسم کی دلیل بھی کارگر ثابت نہیں ہو گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس گواہی کی نوعیت وہ نہ ہو گی جو ہماری دنیا میں متعارف ہے۔ گواہ کے بارے میں پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ گواہ وہ ہستی بن سکتی ہے جو اعمال کا مشاہدہ کرے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ گواہ وہ ہوگا جس کی گواہی کے بعد حقائق آشکار اور اللہ کی حقانیت روشن ہو جائے گی چونکہ یہ گواہی مشرکین کے معبودوں کے بارے میں قائم ہونے والے مقدمہ میں پیش ہو گی۔

۲۔ فَقُلۡنَا ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ: مشرکین سے کہا جائے گا۔ ان غیر اللہ کے معبود ہونے پر اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ دلیل گواہوں کی گواہی کے مقابلے میں پیش ہونی چاہیے یا یہ کہیے مشاہدے اور عیاں ہونے کے مقابلے کی ہونی چاہیے۔

۳۔ فَعَلِمُوۡۤا اَنَّ الۡحَقَّ لِلّٰہِ: اس جگہ ان مشرکین پر یہ حقیقت کھلے گی کہ صرف اللہ تعالیٰ کا معبود ہونا برحق تھا۔ یہ حقیقت دنیا میں کھلی تھی لیکن قیامت کے دن مشاہدے کے ساتھ حقیقت سامنے آئے گی۔

۴۔ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ: جن موہومات کی وہ پرستش کرتے تھے ان کا وہاں نام و نشان نہ ہو گا۔

اِنَّ قَارُوۡنَ کَانَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰی فَبَغٰی عَلَیۡہِمۡ ۪ وَ اٰتَیۡنٰہُ مِنَ الۡکُنُوۡزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَہٗ لَتَنُوۡٓاُ بِالۡعُصۡبَۃِ اُولِی الۡقُوَّۃِ ٭ اِذۡ قَالَ لَہٗ

۷۶۔ بے شک قارون کا تعلق موسیٰ کی قوم سے تھا پھر وہ ان سے سرکش ہو گیا اور ہم نے قارون کو اس قدر خزانے دیے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کے لیے بھی بارگراں تھیں، جب

قَوۡمُہٗ لَا تَفۡرَحۡ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡفَرِحِیۡنَ ﴿۷۶﴾ اس کی قوم نے اس سے کہا: اترانا مت یقیناً اللہ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

تشریح کلمات

تنوء: (ن و ء) ناء۔ مثل ناع کے ہے جس کے معنی رکھنے کے ہیں۔

العصبۃ: (ع ص ب) وہ جماعت جس کے افراد ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ قَارُوۡنَ کَانَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰی: قارون کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔ اس نے اپنی قوم سے غداری کی، فرعون سے جا ملا اور اس کا مقرب بن گیا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں فرعون اور ہامان کے بعد سب سے آگے تھا۔ بائبل میں اس کا نام قاروح آیا ہے اور اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی بتایا ہے۔

۲۔ وَ اٰتَیۡنٰہُ: بائبل نے قارون کی دولت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی کنجیاں تین سو خچروں کا بوجھ بن جاتی تھیں۔ قرآن نے اس کی واقعی صورت حال بیان فرمائی: اس کے خزانوں کی چابیوں کی تعداد اس قدر تھی کہ ایک طاقتور جماعت کے لیے بارگراں تھیں۔

۳۔ اِذۡ قَالَ لَہٗ قَوۡمُہٗ لَا تَفۡرَحۡ: جب قارون کی قوم نے اس سے کہا: دولت کے نشے میں اترانا مت۔ دولت کا نشہ ایک ایسی چیز ہے جس کے بعد قدریں بدل جاتی ہیں۔ حتیٰ اسے بھی بھول جاتا ہے جس نے مال دیا، نعمت دی۔ اپنے محسن کو بھول جاتا ہے۔ صرف مالی قدروں کو جانتا ہے۔ وہ غریبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ دولت انسان سے تمام انسانی قدریں چھین لیتی ہے۔ جب وہ دولت کے نشے میں اتراتا ہے، تکبر سے تمام رشتوں کو توڑ دیتا ہے۔ باغی اور سرکش ہو جاتا ہے۔

۴۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡفَرِحِیۡنَ: ایسے اترانے والے چونکہ بندگی کے تمام رشتے توڑ دیتے ہیں، اللہ انہیں پسند نہیں فرماتا۔

اہم نکات

۱۔ دولت کی بہتات انسان سے تمام انسانی قدریں چھین لیتی ہے۔

وَ ابۡتَغِ فِیۡمَاۤ اٰتٰىکَ اللّٰہُ الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ وَ لَا تَنۡسَ نَصِیۡبَکَ مِنَ ۷۷۔ اور جو (مال) اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر حاصل کر، البتہ دنیا سے بھی اپنا

الدُّنۡیَا وَ اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ وَ لَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُفۡسِدِیۡنَ﴿۷۷﴾	حصہ فراموش نہ کر اور احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد پھیلنے کی خواہش نہ کر یقیناً اللہ فسادیوں کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

انسانی قدروں سے آشنا اور مال کی حقیقی حالت کی شناخت رکھنے والے لوگوں نے دولت کے نشے میں بدمست لوگوں کو درج ذیل نصیحتیں کیں:

۱۔ وَ ابۡتَغِ فِیۡمَاۤ اٰتٰىکَ اللّٰہُ الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ: اس مال سے اپنی آخرت کا گھر آباد کرو۔ اس صورت میں مال، ذخیرہ آخرت کے لیے بہترین ذریعہ ہے اور وہ مال کا انفاق ہے۔ غریبوں پر اور راہ خدا میں ہو۔ صرف مال کے ذریعے وہ نیکی حاصل کی جا سکتی ہے جس میں ایک نیکی سات سو نیکیوں کے برابر ہوتی ہے اور مال ہی کے ذریعے بڑی منزل پر فائز ہو سکتا ہے۔

۲۔ وَ لَا تَنۡسَ نَصِیۡبَکَ مِنَ الدُّنۡیَا: البتہ دنیا سے وہ حصہ جو تمہاری بااحترام زندگی اور جائز ضروریات کے لیے ہے اسے فراموش نہ کرو۔ دنیاوی مال کا وہ حصہ جو اس دنیا کی جائز ضروریات سے مربوط ہے اس کا حصول عبادت بلکہ جہاد ہے۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی روایت ہے:

یاَ ابۡنَ آدَمَ مَا کَسَبۡتَ فَوۡقَ قُوتِکَ فَاَنۡتَ فِیهِ خَازِنٌ لِغَیۡرِکَ۔[1]	اے فرزند آدم! جو تو نے اپنی غذا سے زیادہ کمایا ہے اس میں تو دوسرے کا خزانچی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے۔

لَا تَنۡسِ صِحَّتَکَ وَ قُوَّتَکَ وَ فَرَاغَکَ وَ شَبَابَکَ وَ نَشَاطَکَ اَنۡ تَطۡلُبَ بِهَا الآخِرَۃَ۔[2]	اپنی صحت، قوت، فراغت، جوانی اور شادابی سے آخرت کا حصول فراموش نہ کر۔

۳۔ وَ اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ: جس طرح یہ مال و دولت اللہ کی طرف سے تم پر احسان ہے، تو بھی اسی مال کے ذریعے لوگوں پر احسان کر۔ اس مال سے غریبوں کی مدد کر کے شکر نعمت، شعور نعمت، قبول نعمت کا حق ادا کرو۔

۴۔ وَ لَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِی الۡاَرۡضِ: اس مال کے ذریعے زمین میں فساد نہ کرو۔ دوسروں پر

---

[1] نہج البلاغۃ۔ کلمات قصار: ۱۹۲ [2] الوسائل ۱۶: ۸۳

زیادتی اور حصول دولت کے لیے ان کا استحصال کر کے فساد پیدا نہ کرو۔

اہم نکات

۱۔ ترک دنیا کے بغیر دولت سے آخرت کو آباد کرو۔

۲۔ اللہ کے احسان کا شکر یہ ہے کہ دوسروں پر احسان کرو۔

۳۔ بے ایمان دولت مند فساد پھیلاتا ہے۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُہٗ عَلٰی عِلۡمٍ عِنۡدِیۡ ؕ اَوَ لَمۡ یَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَہۡلَکَ مِنۡ قَبۡلِہٖ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مَنۡ ہُوَ اَشَدُّ مِنۡہُ قُوَّۃً وَّ اَکۡثَرُ جَمۡعًا ؕ وَ لَا یُسۡـَٔلُ عَنۡ ذُنُوۡبِہِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ قارون نے کہا: یہ سب مجھے اس مہارت کی بنا پر ملا ہے جو مجھے حاصل ہے، کیا اسے معلوم نہیں ہے کہ اللہ نے اس سے پہلے بہت سی ایسی امتوں کو ہلاکت میں ڈال دیا جو اس سے زیادہ طاقت اور جمعیت رکھتی تھیں اور مجرموں سے تو ان کے گناہ کے بارے میں پوچھا ہی نہیں جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُہٗ عَلٰی عِلۡمٍ عِنۡدِیۡ: قارون نے ان نصیحتوں کے جواب میں کہا: یہ دولت میں نے خود اپنی مہارت اور سمجھداری کی بنیاد پر جمع کی ہے۔ اس دولت کے حصول میں کسی اور کی طرف سے کوئی احسان نہیں۔ دوسرے لفظوں میں قارون نے کہا: یہ مال و دولت میری اپنی مہارت اور ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس میں کسی غیبی طاقت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مادی انسان کی سوچ قدیم ایام سے یہی رہی ہے کہ جو عقل و فکر مہارت، ہنر اور دولت اس کے پاس ہے وہ کسی کی عطا کردہ نہیں ہے بلکہ خود اس نے پیدا کی ہے۔

۲۔ اَوَ لَمۡ یَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَہۡلَکَ: اگر اس نے یہ دولت صرف اپنی مہارت اور ہنر مندی سے حاصل کی ہے تو اسی مہارت کے ذریعے اس دولت کو بچا لینا اور تحفظ دینا چاہیے جب کہ قارون سے زیادہ طاقتور لوگ اپنی طاقت و مہارت کے ذریعے اپنے اموال کو تحفظ نہیں دے سکے۔ پس معلوم ہوا اصل مال و دولت کا سرچشمہ تو وہی ہے جو اسے تحفظ دے سکتا ہے۔

۳۔ وَ لَا یُسۡـَٔلُ عَنۡ ذُنُوۡبِہِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ: مجرموں کو بغیر حساب کے جہنم بھیج دیا جائے گا۔ جن کے جرم کی نوعیت یہ ہو کہ وہ اللہ کی نعمتوں کے سرے سے منکر ہوں ایسے مجرموں سے قیامت کے دن سوال و حساب

نہ ہوگا۔ جیسا کہ سورہ الرحمٰن آیت ۳۹ میں فرمایا:

فَیَوۡمَئِذٍ لَّا یُسۡـَٔلُ عَنۡ ذَنۡۢبِہٖۤ اِنۡسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝ پھر اس روز کسی انسان سے اور کسی جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔

اس عدم سوال کی وجہ اگلی آیت ۴۱ میں بتائی:

یُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِیۡمٰہُمۡ فَیُؤۡخَذُ بِالنَّوَاصِیۡ وَالۡاَقۡدَامِ ۝ مجرم اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے پھر وہ پیشانیوں اور پیروں سے پکڑے جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ نعمتوں پر ادائے شکر نہ کرنا قابل اغماض ہے لیکن انکار نعمت قابل درگزر نہیں ہے۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوۡمِہٖ فِیۡ زِیۡنَتِہٖ ؕ قَالَ الَّذِیۡنَ یُرِیۡدُوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا یٰلَیۡتَ لَنَا مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ قَارُوۡنُ ۙ اِنَّہٗ لَذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ ۝

۷۹۔(ایک روز) قارون بڑی آرائش کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا تو دنیا پسند لوگوں نے کہا: اے کاش! ہمارے لیے بھی وہی کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے، بے شک یہ تو بڑا ہی قسمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَخَرَجَ عَلٰی قَوۡمِہٖ فِیۡ زِیۡنَتِہٖ: ایک روز قارون بڑی آرائش کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے آیا۔ اس میں اس نے اپنی دولت کی نمائش کی اور اپنی ثروت کا مظاہرہ کیا۔

دولت کی اس نمائش کی نوعیت کیا تھی؟ اسرائیلیات پر مبنی بڑی کہانیاں آپ کو پڑھنے کو ملیں گی لیکن ہم اس کی نوعیت کی طرف نہیں جاتے۔ قرآن کی صراحت سے اتنا ضرور علم ہوتا ہے کہ قارون نے اپنی دولت و ثروت کا ایک قابل توجہ مظاہرہ کیا تھا۔

ثروت مند لوگ مختلف مناسبات میں، مثلاً شادیوں میں اپنی دولت کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں جس سے وہ اپنی شخصیت کا قد بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادھر مادی سوچ رکھنے والے متاثر ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کو عظیم سمجھتے ہیں اور کچھ غریب لوگوں میں احساس محرومیت بڑھ جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے دلوں میں حسرت پیدا ہوتی ہے کاش ہم بھی اس شخص کی طرح ثروت مند ہوتے۔ کچھ لوگوں کے دلوں میں جذبہ انتقام بیدار ہو جاتا ہے۔ کچھ کے دلوں میں حسد پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ قَالَ الَّذِیۡنَ یُرِیۡدُوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا : دنیا پرست، سطحی سوچ رکھنے والے اور راز حیات سے ناواقف لوگ دنیا کے مال و منال کو ہی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ ہمارے معاشروں میں بھی ایسے ثروت مند لوگوں کو خوش حال کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے صرف دنیا کی زندگی ہے۔ وہی لوگ دل میں یہ حسرت رکھتے ہیں: کاش ہمیں بھی قارون کی طرح کی دولت حاصل ہو جاتی۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَیۡلَکُمۡ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّمَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۚ وَ لَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ اور جنہیں علم دیا گیا تھا وہ کہنے لگے: تم پر تباہی ہو! اللہ کے پاس جو ثواب ہے وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل انجام دینے والوں کے لیے اس سے کہیں بہتر ہے اور وہ صرف صبر کرنے والے ہی حاصل کریں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ : جو لوگ راز حیات کا علم رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ صرف مال و منال خوش قسمتی نہیں ہے، نہ ہی ایسے لوگ خوشحال ہوتے ہیں بلکہ دولت مند لوگ بے چین اور بے سکون ہوتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ دولت انسان سے سکون چھین لیتی ہے۔ ایک شخص کو دنیا بھر کی دولت مل جائے وہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ بے سکون ہو گا۔ اس سے یہ راز بھی منکشف ہو جاتا ہے کہ انسان اس دنیا کی آسائش کے لیے پیدا نہیں ہوا ورنہ دنیا کی دولت و آسائش سے ایسا سکون ملتا جیسے مچھلی کو پانی میں سکون ملتا ہے۔

چنانچہ آیت میں اس جگہ علم والوں کا حوالہ دیا کہ جن کو علم دیا گیا ہے وہ مال و دولت کے بارے میں وہ موقف نہیں رکھتے جو دنیا دار لوگ رکھتے ہیں۔

۲۔ وَیۡلَکُمۡ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّمَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا : علم رکھنے والا ثواب اور مال دنیا میں موازنہ کر سکتا ہے چونکہ دونوں چیزیں اس کے سامنے ہیں۔ علم کی تیز نگاہ ان دونوں میں موازنہ کر سکتی ہے، پھر موقف بنا سکتی ہے۔ وہ علمی موقف یہ ہو گا: جو ثواب اہل ایمان اور عمل صالح کے لیے اللہ کے پاس ہے وہ اس مال و دولت سے بہتر ہے جو اس انسان سے موجود سکون کو بھی چھین لیتی ہے۔

۳۔ وَ لَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوۡنَ : یہ ثواب ان لوگوں کو مل سکے گا جو مال و دولت سے محرومی پر صبر کرتے اور اسی صبر سے اپنی خواہشات پر تسلط رکھتے ہیں۔

وَلَا يُلَقّٰهَا میں ضمیر ثواب کی طرف ہے۔ ثواب مثوبۃ کے معنی میں ہے یا اس کلمہ کی طرف ہے جو اہل علم نے کہا۔ وہ کلمہ ثواب خیر ہے۔

اہم نکات

۱۔ علم ہی دولت کی قدروں کا تعین کر سکتا ہے۔

فَخَسَفۡنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الۡاَرۡضَ ۟ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنۡ فِئَةٍ يَّنۡصُرُوۡنَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ٗ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُنۡتَصِرِيۡنَ ۝۸۱

۸۱۔ پھر ہم نے قارون اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا تو اللہ کے مقابلے میں کوئی جماعت اس کی نصرت کے لیے موجود نہ تھی اور نہ ہی وہ بدلہ لینے والوں میں سے تھا۔

تشریح کلمات

فَخَسَفۡنَا: (خ س ف) الخسف زمین میں دھنس جانا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَخَسَفۡنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الۡاَرۡضَ: صرف قارون اور اس کے گھر کا گھر والوں سمیت زمین میں زندہ در گور ہونا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ ممکن ہے ایک ایسا محدود زلزلہ آیا ہو جس سے زمین شق ہو گئی ہو۔ روایت ہے کہ اس میں قارون اور اس کی حامی جماعت کے دو سو پچاس افراد زمین میں دفن ہو گئے۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف قارون کے حامی تھے۔

۲۔ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنۡ فِئَةٍ يَّنۡصُرُوۡنَهٗ: جب قارون زمین میں دفن ہو رہا تھا اس وقت اس کی دولت اور اس کے حامی و رشتے دار اسے نہیں بچا سکے۔

یعنی جب بھی کوئی مجرم اپنے جرم سے باز نہیں آتا اور اپنے جرم پر اسے ناز ہوتا ہے اس وقت جب جرم کی سزا ملنے لگے گی دنیا کی کوئی طاقت اسے اس سزا بچا نہیں سکتی۔

اہم نکات

۱۔ قارون کے قوم موسیٰ علیہ السلام ہونے کی وجہ سے اس پر حجت پوری ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود اس نے نعمت کا انکار کیا اسے فوری سزا مل گئی۔

وَاَصۡبَحَ الَّذِيۡنَ تَمَنَّوۡا مَكَانَهٗ

۸۲۔ اور جو لوگ کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے

بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۸۲ ع ۸ ۱۱

تھے وہ کہنے لگے: دیکھتے نہیں ہو! اللہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے روزی کشادہ اور تنگ کر دیتا ہے، اگر اللہ ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا، دیکھتے نہیں ہو! کافر فلاح نہیں پا سکتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ: کل جو لوگ دولت کی تمنا کرتے تھے آج اس کا انجام دیکھ کر سمجھ گئے دولت خوشحالی نہیں ہے اور دولت کا حصول کسی کا ذاتی کمال اور ہنرمندی کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ دولت دینا، نہ دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے دولت دیتا ہے۔ انعام کے طور پر یا آزمائش اور سزا کے طور پر۔

۲۔ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا: اگر مال و دولت نہ دے کر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا اور مال حاصل کر کے سرکش و دولت مند ہوتے تو ہمارا بھی حشر قارون کی طرح ہوتا۔

سرکش دولت مندوں کا انجام دیکھ کر یہ نکتہ ہر ایک کی سمجھ میں آتا ہے کہ دولت نہ دینا اللہ کا احسان ہے لیکن انجام دیکھنے سے پہلے صرف راز حیات سے واقف لوگ سمجھتے ہیں کہ دولت نہ دینا اللہ کا بڑا احسان ہے چونکہ تنگی کی آزمائش میں انسان کامیاب ہو جاتا ہے لیکن آسائش میں نہایت کم لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔

۳۔ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ: اللہ کی نعمتوں سے مالا مال ہو کر منکر نعمت ہونے والے اور اس نعمت کو اپنی مہارت اور ہنرمندی کا نتیجہ قرار دینے والے زندگی کے امتحان میں کامیاب نہیں ہوتے۔

۲۷۷

وَيْكَاَنَّهٗ بعض کہتے ہیں یہ ویك ہے اس پر كَاَنَّ داخل ہوا ہے۔ اس کے معنی الم تر دیکھتے نہیں ہو کے ہیں۔ بعض کے نزدیک ویك تہدید کے معنوں میں ہے۔

پہلے معنی کے لیے شاہد پیش کیا جاتا ہے: ایک دیہاتی عرب خاتون نے اپنے شوہر سے کہا: تیرا بیٹا کہاں ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا: ویکانه وراء البیت دیکھتی نہیں ہو وہ گھر کے پیچھے ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی ویلك اعلم ہے۔ ہم نے پہلے معنی کو سیاق کے مطابق ہونے کی وجہ سے ترجیح دی ہے۔

اہم نکات

۱۔ بہت سے افراد کے لیے دولت نہ دینا اللہ کا احسان ہے: مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا...۔

تِلۡکَ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ نَجۡعَلُہَا لِلَّذِیۡنَ لَا یُرِیۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَ الۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۸۳﴾

۸۳۔ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بنا دیتے ہیں جو زمین میں بالادستی اور فساد پھیلانا نہیں چاہتے اور (نیک) انجام تو تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تِلۡکَ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ: آخرت کی زندگی ان لوگوں کے لیے ہے جو دنیوی زندگی میں دوسرے بندگان خدا پر برتری اور انہیں زیر کرنا نہیں چاہتے۔ دوسروں پر برتری حاصل کرنا ظلم و زیادتی کے مترادف ہے۔ وہ دوسروں پر ظلم کر کے انہیں زیر کرتے اور خود برتری حاصل کرتے ہیں جیسا کہ فرمایا:

وَ جَحَدُوۡا بِہَا وَ اسۡتَیۡقَنَتۡہَاۤ اَنۡفُسُہُمۡ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا ۔۔۔ [1]

وہ ان نشانیوں کے منکر ہوئے حالانکہ ان کے دلوں کو یقین آ گیا تھا، ایسا انہوں نے ظلم اور غرور کی وجہ سے کیا۔۔۔

۲۔ وَ لَا فَسَادًا: دوسروں پر ظلم کر کے ان پر بالا دستی قائم کرنا، فساد کا بہت بڑا مصداق ہے۔ اس لیے اس کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ فساد میں ہر قسم کی ناہمواری اور غیر عادلانہ کردار شامل ہے۔

۳۔ وَ الۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ: نیک انجام دوسروں پر ناجائز بالا دستی اور فساد سے بچنے والوں کے لیے ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے قائم کردہ نظام میں بگاڑ (فساد) پیدا کرنے والوں کا انجام برا ہوگا۔

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ خَیۡرٌ مِّنۡہَا ۚ وَ مَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجۡزَی الَّذِیۡنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ اِلَّا مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ جو شخص نیکی لے کر آئے گا اسے اس سے بہتر (اجر) ملے گا اور جو کوئی برائی لائے گا تو برے کام کرنے والوں کو صرف وہی بدلہ ملے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ خَیۡرٌ مِّنۡہَا: ایک نیکی کے لیے جو اجر و ثواب علم خدا میں مناسب ہے اللہ اس اجر سے بہتر عنایت فرمائے گا۔ ایک نیکی کا اجر دس سے سات سو تک اور جن کے لیے اللہ کی مشیت

[1] ۲۷ نمل: ۱۴

ہو، سات سو کا دو گنا یعنی چودہ سو تک دیا جائے گا۔ چنانچہ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ...[۱] میں دس نیکیوں کا ذکر آیا ہے۔ راہ خدا میں انفاق کے لیے سات سو نیکیوں کا ذکر فرمایا ہے اور وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ ...[۲] سے چودہ سو تک کے امکان کا ذکر فرمایا۔ نیکی کے لیے اس سے بہتر اجر عنایت فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے۔

۲۔ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ: جو کوئی برائی لے کر قیامت کے دن اللہ کی عدالت میں حاضر ہو گا تو اسے اسی برائی کا بدلہ دیا جائے گا جس کا وہ ارتکاب کرتا رہا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

دیگر آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ برائی کا بدلہ اسی برائی کے برابر دینا بھی ہمیشہ نہیں ہے۔ یہ صرف اس صورت کی بات ہے کہ جب گناہ نے اس شخص کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ نیکیوں پر غالب ہے یا نیکی کا وجود نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:

بَلٰی مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ...[۳]

البتہ جو کوئی بدی اختیار کرے اور اس کے گناہ اس پر حاوی ہو جائیں تو ایسے لوگ اہل دوزخ ہیں....

لیکن اگر برائی نے احاطہ نہیں کیا ہوا تو اس برائی کو معاف کیا جائے گا فرمایا:

وَاٰخَرُوۡنَ اعۡتَرَفُوۡا بِذُنُوۡبِهِمۡ خَلَطُوۡا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ○[۴]

اور کچھ دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا انہوں نے نیک عمل کے ساتھ دوسرے برے عمل کو مخلوط کیا، بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے، بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یہاں ایک اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ نیکیوں میں توحید بھی ہے۔ توحید سے بہتر کیا اجر مل سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ خود توحید سے بہتر اجر نہیں ہوتا لیکن عقیدۂ توحید کے لیے جو اجر مناسب ہے اللہ اس اجر سے بہتر عنایت فرمائے گا۔

اس آیت کے ذیل میں حدیث ہے:

وَيْلٌ لِمَنْ غَلَبَتْ آحَادُهُ اَعْشَارَهُ..[۵]

حسرت اس شخص کے لیے جس کی اکائیاں (برائیاں) اس کی دہائیوں (نیکیوں) پر غالب آ جائیں۔

اہم نکات

۱۔ نیکی کا اجر زیادہ دینا اللہ کا تفضّل ہے اور برائی کی سزا اسی کے برابر دینا اللہ کا عدل ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ ۸۵۔ (اے رسول) جس نے آپ پر قرآن (کے

[۱] انعام: ۱۶۰ [۲] بقرۃ: ۲۶۱ [۳] بقرہ: ۸۱ [۴] توبۃ: ۱۰۲ [۵] وسائل الشیعۃ ۱۶: ۱۰۳

لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی وَ مَنۡ هُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۸۵﴾

احکام کو) فرض کیا ہے وہ یقیناً آپ کو بازگشت تک پہنچانے والا ہے، کہدیجیے: میرا رب اسے خوب جانتا ہے جو ہدایت لے کر آیا ہے اور اسے بھی جو واضح گمراہی میں ہے۔

شان نزول: اس آیت کے شان نزول میں بخاری نے اپنی صحیح باب التفسیر میں ابن عباس سے روایت کی ہے: لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ میں بازگشت سے مراد مکہ ہے۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

اس روایت کو نسائی نے اپنی سنن باب تفسیر میں اور ابن جریر نے نقل کیا ہے۔

بغوی لکھتے ہیں:

اکثر مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ یہاں مَعَادٍ سے مراد مکہ ہے اور یہ آیت اکثر کے نزدیک مقام جحفہ میں نازل ہوئی جب آپؐ مدینہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور حضور ﷺ کو وطن یاد آیا۔ اس لیے اس آیت کے بارے میں کہتے ہیں نہ مدنی ہے، نہ مکی لیکن ایک نظریہ کے مطابق مدینہ سے پہلے نازل ہونے والی آیات سب مکی ہیں خواہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں یا غیر مکہ میں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ: جس ذات نے آپؐ پر قرآن پڑھ کر سنانے اس کی تبلیغ و اشاعت کی ذمے داری ڈالی ہے وہ آپ کو اپنی جائے بازگشت (مکہ) کی طرف فاتحانہ طور پر واپس کرنے والی ہے جہاں سے آپ کو نکلنا پڑ رہا ہے۔

۲۔ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ: اللہ آپ کو اپنے مَعَادٍ کی طرف واپس کرنے والا ہے۔ مَعَادٍ کے معنی عادت ہے تو معنی یہ ہوں گے: جس جگہ کی رہائش کی عادت و الفت ہے۔ وہ روایات کے مطابق مکہ ہے۔ اور اگر عود سے ہے تو بھی مکہ مراد ہے چونکہ معاد الرجل بلدہ ہر شخص کی جائے بازگشت اپنا شہر ہوتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ لوگ حج کے لیے ہر سال مکہ کی طرف آتے ہیں مکہ کو مَعَادٍ کہتے ہیں۔

۳۔ قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی: یہ مشرکین کے اس طعنے کا جواب ہے جو کہتے تھے: محمد نے قوم کو گمراہ کیا۔ آپ کہدیجیے: میرا رب بہتر جانتا ہے کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون گمراہی میں ہے۔ آنے والا وقت بھی بتائے گا کہ کون کیا ہے۔ جس کی طرف سے میں ہدایت لے کر آیا ہوں اس کا علم مؤثر ہے۔ تمہارے واہموں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ راہ خدا میں ہجرت کرنے والے باعزت اپنے وطن واپس ہو جاتے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ اور آپ کو یہ امید نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل کی جائے گی مگر آپ کے رب کی رحمت سے لہٰذا آپ کافروں کے پشت پناہ ہرگز نہ بنیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ: رسالت ایسا منصب نہیں ہے جو اس کی توقع رکھنے والوں کو مل جائے یہ مقام کسی بشر کی سوچ سے بالاتر اور کسی انسان کے فکری افق سے وسیع تر ہے۔

اگر رحمت رب آپؐ کے شامل حال نہ ہوتی تو آپؐ بذات خود یہ امید تک نہیں کر سکتے تھے کہ یہ قرآن آپؐ پر نازل کیا جائے گا۔ ظاہر ہے اللہ کی رحمت سے ہٹ کر نہ نبوت مل سکتی ہے، نہ قرآن نازل ہو سکتا ہے۔ یہ رحمت آپؐ سے کبھی جدا نہ رہی، نہ ہی کوئی ایسا زمانہ آیا جس میں آپؐ ہوں اور یہ رحمت آپؐ کے ساتھ نہ ہو۔

تعجب ہے بعض اہل قلم نے اس بات کے اثبات کے لیے کئی صفحات لکھ ڈالے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو پہلے نبوت ملنے کی امید تک نہ تھی اور آپؐ نے کبھی سوچا بھی نہ تھا بلکہ آپؐ وحی نازل ہونے کے بعد بھی شک میں رہے کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ آپؐ نبوت پر فائز ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا اللہ نے ایسے شخص سے رابطہ فرمایا جسے اتنا بھی علم نہ تھا جتنا ایک دوسرے شخص ورقہ بن نوفل کو تھا۔

ہم نے یہ بات کئی بار لکھی ہے کہ وحی کا تعلق صرف ظاہری حواس سے نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام وحی اپنے پورے وجود کے ساتھ حاصل کرتے ہیں جس میں شک و تردید کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جس قدر انہیں اپنے وجود پر یقین ہوتا ہے اسی قدر یقین سے وحی وصول کرتے ہیں۔

چنانچہ انبیاء وحی کی آواز سنتے ہیں۔ وہ ان کانوں سے نہیں سنتے اسی لیے جو لوگ نزول وحی کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بالکل پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ آواز نہیں سنتے تھے اور نہ ہی فرشتۂ وحی کو دیکھ سکتے تھے۔ البتہ حضرت علی علیہ السلام کا ایک مقام ایسا آتا ہے جس میں وہ بھی ایسی آوازوں کو سن سکتے تھے۔ خطبہ

قاصعہ ۱۹۲ نہج البلاغة میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَلَقَدْ سَمِعْتُ رَنَّةَ الشَّيْطَانِ حِيْنَ نَزَلَ الْوَحْيُ عَلَيْهِ۔ جب آپ پر (پہلے پہل) وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی۔

میں نے پوچھا یا رسول اللہ! یہ آواز کیسی ہے ہے؟ آپ نے فرمایا:

هذا الشيطان قد آيس من عبادته انك تسمع ما اسمع و ترى ما ارى الا انك لست بنبي۔۔۔۔ یہ شیطان ہے جو اپنے پوجے جانے سے مایوس ہوگیا ہے۔ (اے علی) جو میں سنتا ہوں تم بھی سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھتے ہو۔فرق اتنا ہے کہ تم نبی نہیں ہو....۔

شرح نہج البلاغه میں ابن ابی الحدید، مسند احمد بن حنبل سے ایک روایت نقل کرتے ہیں جس میں اس آواز کا ذکر ہے جسے رسول اللہ کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام نے بھی سن لیا تھا۔

۲۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ بات قابل تصور نہیں کہ آپ کافروں کے پشت پناہ بن جائیں۔ اس کے باوجود یہ خطاب اس لیے ہوا کہ مشرکین آپ کے قتل کے درپے تھے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ حکم مل رہا ہے کہ اس مذموم کوشش میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ابن عباس کہا کرتے تھے۔قرآن، اياك اعنى فاسمعي باجاره خطاب کسی سے، سمجھانا کسی اور کو مقصود ہے کی بنیاد پر نازل ہوا ہے۔ یعنی سر دلبران در حدیث دیگران کی بنیاد پر۔ اس آیت میں دوسروں کو بتانا مقصود ہے کہ کافروں کے پشت پناہ نہ بنیں۔

اہم نکات

۱۔ نبوت رحمت الٰہی ہے اور رسول رحمت کبھی بھی اس رحمت سے جدا نہ تھے۔

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ جب یہ آیات آپ کی طرف نازل ہو چکی ہیں تو کہیں یہ آپ کو اللہ کی آیات (کی تبلیغ) سے روک نہ دیں اور آپ اپنے رب کی طرف دعوت دیں اور آپ مشرکین میں ہرگز شامل نہ ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ: مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دعوت توحید سے برگشتہ کرنے کے لیے

ہر حربہ استعمال کیا۔ آخر میں وہ آپ کو شہید کرنے کے لیے دار الندوۃ میں جمع ہو گئے۔ ایسے حالات میں آپ کو سہارا دینے اور مشرکین کو مایوس کرنے کے لیے یہ آیات نازل ہوتی ہیں۔ ان میں ارشاد فرمایا: کسی سے ہو نہیں سکتا کہ آیات الٰہی آپؐ پر نازل ہونے کے بعد آپ کی دعوت کی راہ میں رکاوٹ ڈالے۔ آیات الٰہی کے نزول کے بعد ممکن نہیں ان کو غیر مؤثر کیا جا سکے یا ان آیات کی تبلیغ ممکن نہ ہو سکے۔ آیات کا نزول اپنے مقصد نزول میں ناکام ہو جائے۔

۲۔ وَادۡعُ اِلٰی رَبِّکَ: اپنی دعوت جاری رکھیں۔ یہ دعوت جاری رہنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔

۳۔ وَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ: مشرکین کی یہ کوشش ناکام ہو جائے گی کہ آپؐ اس دعوت کو چھوڑ کر مشرکین کے ساتھ ہو جائیں۔ اس میں مشرکین کے لیے ناامیدی کی نوید ہے کہ ان کی مذموم کوشش بارآور نہیں ہو سکے گی۔

اہم نکات

۱۔ آیات الٰہی نزول کے بعد مقصد نزول میں ناکام نہیں ہو سکتیں۔

وَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۟ کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ ؕ لَہُ الۡحُکۡمُ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے، حکومت کا حق اسی کو حاصل ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ: اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو۔ غیر اللہ معبود نہیں ہو سکتے۔ اگلی آیت میں اس کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ غیر اللہ کیوں معبود نہیں ہو سکتے۔

۲۔ کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ: وجهه ذاته۔ الوجه سے ذات مراد لی جاتی ہے۔ جیسے وجه النهار سے مراد خود ''دن'' لیا جاتا ہے۔

۳۔ لَہُ الۡحُکۡمُ: جس فیصلے پر نظام کائنات قائم ہے، اس فیصلے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ لہٰذا کائنات پر جس کا فیصلہ نافذ ہو گا اسی کے ہاتھ میں کائنات کی تدبیر ہو گی۔ پس وہی معبود ہے۔

۴۔ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ: جس کا فیصلہ نافذ ہو گا اور جس نے فیصلہ دیا ہے اسی کے سامنے جوابدہی ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ معبود وہ ہوتا ہے جو فنا پذیر نہ ہو: کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ ...۔

۲۔ حاکمیت صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے: لَہُ الۡحُکۡمُ ...۔

سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورۃ المبارکۃ کا نام العنکبوت اس لیے ہے کہ اس میں العنکبوت کا ذکر آیا ہے:

مَثَلُ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡلِیَآءَ کَمَثَلِ الۡعَنۡکَبُوۡتِ ۚۖ اِتَّخَذَتۡ بَیۡتًا ؕ وَ اِنَّ اَوۡہَنَ الۡبُیُوۡتِ لَبَیۡتُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ۝[1]

جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بنایا ہے ان کی مثال اس مکڑی کی سی ہے جو اپنا گھر بناتی ہے اور گھروں میں سب سے کمزور یقیناً مکڑی کا گھر ہے اگر یہ لوگ جانتے ہوتے۔

یہ سورۃ ٦٩ آیات پر مشتمل ہے۔ آیات کی تعداد میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

بعض آیات سے عندیہ ملتا ہے کہ یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی جب بعض مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور مشرکین کی طرف سے مظالم اس قدر زیادہ تھے کہ کچھ لوگ ایمان کے بعد کفر کا اظہار کرنے لگے۔ اسی کو نفاق کہا گیا ہے جس سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ یہ آیات مدنی ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابوبصیر راوی ہیں:

مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْعَنْكَبُوتِ وَ الرُّومِ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ لَيْلَةَ ثَلَاثٍ وَ عِشْرِينَ فَهُوَ وَ اللّٰهِ يَا اَبَا مُحَمَّدٍ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ لَا اَسْتَثْنِي فِيهِ اَبَداً وَ لَا اَخَافُ اَنْ يَكْتُبَ اللّٰهُ عَلَيَّ فِي يَمِينِي اِثْماً وَ اِنَّ لِهَاتَيْنِ السُّورَتَيْنِ مِنَ اللّٰهِ مَكَاناً۔[2]

جو شخص سورۃ العنکبوت اور سورۃ الروم کی تلاوت رمضان کی ۲۳ ویں شب کو کرے اللہ کی قسم اے ابو محمد! (ابو بصیر) وہ اہل جنت میں سے ہے۔ اس میں کسی قسم کا استثنا نہیں کروں گا، نہ ہی مجھے اس کا خوف ہے کہ میں نے جو قسم کھائی ہے اس پر اللہ میرے لیے گناہ مقرر کرے گا چونکہ ان دونوں سورتوں کو اللہ کے نزدیک ایک مقام و منزلت حاصل ہے۔

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۴۱ [2] مجمع البیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾

وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۳﴾

بنام خدائے رحمٰن رحیم

۱۔ الف، لام، میم۔

۲۔ کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے سے چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور یہ کہ وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟

۳۔ اور بتحقیق ہم ان سے پہلوں کو بھی آزما چکے ہیں کیونکہ اللہ کو بہرحال یہ واضح کرنا ہے کہ کون سچے ہیں اور یہ بھی ضرور واضح کرنا ہے کہ کون جھوٹے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَحَسِبَ النَّاسُ: ناس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو مکہ میں مشرکین کے نرغے میں ہیں اور مشرکین کی طرف سے اس حد تک اذیت برداشت کر رہے ہیں کہ اسلام سے برگشتہ ہونے کے خطرے میں ہیں۔ ان مسلمانوں کو سامنے رکھ کر ایک کلی حکم بیان ہو رہا ہے: ایمان صرف ایک لفظ اٰمَنَّا کے تلفظ سے عبارت نہیں ہے بلکہ ایمان ایک نظام اور دستور حیات کو اپنانے اور اسے اپنانے کی راہ میں پیش آنے والی تمام مشکلات و مصائب کا مجاہدانہ مقابلہ کرنے نیز کردار و امانت کا نام ہے۔ ایسے ایمان کی کوئی قیمت نہیں جس کا انسان کے کردار پر کوئی اثر نہ ہو۔

اگر ایمان کا رتبہ اتنا ارزاں ہوتا کہ لب ہلانے سے حاصل ہو جائے تو صادق و کاذب میں تمیز نہ ہوتی۔ مجاہد اور فراری میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ ایمان کے لیے قربانی دینے اور ایمان کے نام پر مفاد حاصل

کرنے والوں میں کوئی امتیاز نہ ہوتا۔

فلسفہ امتحان کے بارے میں ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۱۲۴ و آیت ۲۱۴۔

۲۔ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ : آزمائش اور امتحان اللہ تعالیٰ کا دائمی قانون ہے جو تمام امتوں میں جاری رہا ہے۔

۳۔ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ : اللہ کو قدیم سے علم ہے کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے لیکن امتحان کے ذریعے اللہ کا علم ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اللہ کا قدیم علم منصۂ شہود میں آتا ہے۔ علم کے مرحلے سے عمل کے مرحلے میں آتا ہے اور عمل سے استحقاق کا مرحلہ آتا ہے۔ نیک عمل سے ثواب اور بدعمل سے عذاب کا مستحق ہونے کا مرحلہ آتا ہے چونکہ امتحان و آزمائش کے ذریعے عملی شکل میں استحقاق کا مرحلہ آنے سے پہلے بلا استحقاق ثواب دے تو سب کو دے۔ نیک کردار اور بدکردار دونوں کو دے۔ یہ ایک عبث کام بن جاتا ہے۔ اس لیے حکمت الٰہی کا یہ تقاضا ہوا کہ کامیابی کے راستوں کو دشوار بنایا جائے۔

فضائل: حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے بابا حضرت علی علیہ السلام کو روایت کرتے ہیں:

> جب آیۂ اَحَسِبَ النَّاسُ.... نازل ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا یہ آزمائش کیا ہے فرمایا: یا علی انك تبتلی و تبتلی بك۔ یا علی یہ آزمائش آپ کی بھی ہوگی اور آپ کے ذریعے بھی۔ یعنی اس آزمائش سے آپ بھی دوچار ہوں گے اور آپ کے سلسلے میں بھی لوگ آزمائش سے دوچار ہوں گے۔
>
> ملاحظہ ہو: کشف الغمۃ ۱: ۳۱۳ ط بیروت۔ شرح ابن ابی الحدید ۴: ۱۰۸۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کی منزل پر کڑی آزمائشوں سے گزر کر فائز ہوا جا سکتا ہے۔

اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّسۡبِقُوۡنَا ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ۝

۴۔ برائی کے مرتکب افراد کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بچ نکلیں گے؟ کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں ان مشرکین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے مسلمانوں کو سخت ترین آزمائش میں ڈال رکھا تھا۔ ان مشرکین کی یہ کوشش تھی کہ اپنی مکاری اور فتنہ بازی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نکلیں اور اللہ نے جو مہلت دے رکھی ہے اس سے انہیں یہ گمان ہو چلا ہے کہ ہم اللہ کی گرفت میں آنے والے نہیں ہیں۔

سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ: ان کا یہ فیصلہ خود ان کے حق میں بدترین فیصلہ ہے۔ اس غلط فیصلے کی وجہ سے وہ اللہ کے بدترین عذاب میں ہمیشہ کے لیے مبتلا ہو رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ عذاب الٰہی سے بچ نکلنے کا گمان ایک بدترین گمان ہے۔

مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ ؕ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ۝

۵۔ جو اللہ کے حضور پہنچنے کی امید رکھتا ہے تو (وہ باخبر رہے کہ) اللہ کا مقرر کردہ وقت یقیناً آنے ہی والا ہے اور وہ بڑا سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ: اس آیہ شریفہ میں لِقَآءَ اللّٰہِ سے مراد اللہ کے سامنے حساب کے لیے حاضر ہونا ہے جہاں وہ تمام حجاب ہٹ جائیں گے جو دنیا میں اس کی آنکھوں کے سامنے تھے اور حقائق روشن ہو کر سامنے آئیں گے۔

اس آیت کا رخ کلام مؤمنین مکہ کی طرف ہو سکتا ہے کہ جس طرح مشرکین اللہ کی گرفت سے نکل نہیں سکتے بالکل اسی طرح جو اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے پر ایمان رکھتے ہیں وہ بھی جان لیں کہ وہ مقررہ وقت آنے والا ہے جس میں وہ اپنے رب کے پاس سے اجر و ثواب حاصل کریں گے۔

۲۔ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ: جس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے وہ تمام آوازوں کا سننے والا، تمام افعال و کردار کا جاننے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ نہ ایمان کے مدعی امتحان سے بچ سکتے ہیں، نہ منکرین انتقام سے۔

وَ مَنۡ جَاہَدَ فَاِنَّمَا یُجَاہِدُ لِنَفۡسِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

۶۔ اور جو شخص جفاکشی کرتا ہے تو وہ صرف اپنے فائدے کے لیے جفاکشی کرتا ہے، اللہ تو یقیناً سارے عالمین سے بے نیاز ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَنۡ جَاہَدَ فَاِنَّمَا یُجَاہِدُ لِنَفۡسِہٖ: جو جدوجہد اور مصائب و آلام کا مقابلہ کرے گا اور ہر قیمت پر

اپنا ایمان بچائے گا، اس کا نتیجہ خود اس کے حق میں ہوگا۔ وہ اپنا مستقبل سنوارے گا۔ اپنی ابدی زندگی کو آباد کرے گا۔ اسی سعی و کوشش سے خود تمہیں ارتقا حاصل ہوگا اور تمہارے ایمان کی صداقت ثابت ہوگی۔ ورنہ خدا تمہاری سعی و کوشش کا محتاج نہیں ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ لَنَجۡزِیَنَّہُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷﴾

۷۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے ہم ان سے ان کی برائی ضرور دور کر دیں گے اور انہیں ان کے بہترین اعمال کا صلہ بھی ضرور دیں گے۔

تفسیر آیات

ا۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: ایمان اور عمل صالح دونوں کے اثرات کا ذکر ہے۔ ایمان کے اثرات یہ ہیں کہ ایمان کی وجہ سے ایمان سے پہلے حالت کفر کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ایمان لے آنا حالت کفر کے تمام گناہوں کا کفارہ ہے۔

ایمان کے بعد بجا لائے جانے والے تمام اعمال صالحہ قابل قبول ہیں۔ ان کا ثواب ملے گا۔ چونکہ ایمان کے بغیر نہ عمل صالح سود مند ہوگا اور نہ ہی گناہوں سے نجات ملے گی۔

اہم نکات

ا۔ ایمان گناہوں کا کفارہ اور قبول اعمال کا وسیلہ ہے۔

وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ حُسۡنًا ؕ وَ اِنۡ جَاہَدٰکَ لِتُشۡرِکَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡہُمَا ؕ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸﴾

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّہُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۹﴾

۸۔ اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اگر تیرے ماں باپ میرے ساتھ شرک کرنے پر تجھ سے الجھ جائیں جس کا تجھے کوئی علم نہ ہو تو تو ان دونوں کا کہنا نہ ماننا، تم سب کی بازگشت میری طرف ہے، پھر میں تمہیں بتا دوں گا تم کیا کرتے رہے ہو؟

۹۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے انہیں ہم بہرصورت صالحین میں شامل کریں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ وَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ: پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنے والی نسل (اولاد) کی محبت تکویناً انسان میں ودیعت فرمائی ہے اور جانے والی نسل (والدین) سے محبت کرنا تشریعاً واجب گردانا ہے چونکہ جانے والی نسل کی جدائی اکثر ہر صورت میں ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی مہربانی کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے کہ اس جدائی کو سنگین نہیں بنایا۔

والدین پر احسان کے بارے میں سورہ بقرہ آیت ۸۳، النساء آیت ۳۶، الانعام: ۱۵۱، بنی اسرائیل: ۲۳ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِیۡ: اگر والدین تجھے مشرک بنانے کے لیے تجھ پر دباؤ ڈالیں اور شرک کے ارتکاب کرانے کی کوشش کریں تو ان کی اطاعت نہ کرو۔ جَاهَدٰكَ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ والدین تجھے شرک اختیار کرنے کے لیے صرف حکم نہیں کرتے بلکہ وہ اس میں کوشش کرتے ہیں، تجھ پر دباؤ ڈالتے ہیں تو بھی ان کی اطاعت نہ کر۔

۳۔ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ: شرک ایک موہوم چیز ہے۔ اس کا واقع اور نفس الامر سے کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا اس کا علم بھی نہ ہوگا۔ جس کا وجود نہیں اس کا علم کیسے ہوگا۔

اسی مطلب کو سورہ لقمان ۱۵ میں بھی بیان فرمایا ہے لیکن وہاں فَلَا تُطِعۡهُمَا ان دونوں کی اطاعت نہ کرو کے بعد ایک جملے کا اضافہ ہے: وَ صَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا خواہ والدین مشرک ہی کیوں نہ ہوں۔ البتہ انسانی پہلو کے تحت ان مشرک والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اسی لیے آیت میں فرمایا: ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس مسئلے کو انسان کی انسانیت سے مربوط فرمایا۔

۴۔ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ: ان دونوں مشرک والدین کی اطاعت نہ کرو۔ تمہیں اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اللہ کو جواب دینا ہے:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ۔[1] — خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہوتی۔

۵۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی صورت میں اللہ کا اٹل قانون یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر فیصلے ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ والدین کو صرف خالق کے مقابلے ترجیح حاصل نہیں ہے۔

---

[1] الفقیہ ۴: ۳۸۱

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتۡنَۃَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰہِ ؕ وَ لَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکَ لَیَقُوۡلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمۡ ؕ اَوَ لَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِیۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے تو ہیں: ہم اللہ پر ایمان لائے لیکن جب اللہ کی راہ میں اذیت پہنچتی ہے تو لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی اذیت کو عذاب الٰہی کی مانند تصور کرتے ہیں اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے مدد پہنچ جائے تو وہ ضرور کہتے ہیں: ہم تو تمہارے ساتھ تھے، کیا اللہ کو اہل عالم کے دلوں کا حال خوب معلوم نہیں ہے؟

وَ لَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ اور اللہ نے یہ ضرور واضح کرنا ہے کہ ایمان والے کون ہیں اور یہ بھی ضرور واضح کرنا ہے کہ منافق کون ہیں؟

تفسیر آیات

۱۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ: یہ دو آیات روایات کے مطابق ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں جو مکے میں اسلام لائے لیکن بعد میں مشرکین کی طرف سے اذیت پہنچنے پر دوبارہ کفر اختیار کیا۔

۲۔ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰہِ: جب انہیں ایمان کی وجہ سے اذیت اٹھانا پڑی تو انہوں نے لوگوں کی طرف سے ہونے والی اذیت کو عذاب الٰہی کی مانند قرار دیا۔ جس طرح عذاب الٰہی سے بچنے کے لیے ایمان کی طرف آیا جاتا ہے بالکل اسی طرح یہ لوگ، لوگوں کی اذیت سے بچنے کے لیے کفر کی طرف چلے جاتے ہیں۔

۳۔ وَ لَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکَ: اذیت سے بچنے کے لیے کفر کی طرف جانے والے لوگ اگر دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اللہ کی طرف سے فتح و نصرت مل جاتی ہے تو وہ ضرور کہتے ہیں: ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔

آیت کے اس جملے کی وجہ سے کچھ مفسرین اس آیت کو مدنی خیال کرتے ہیں چونکہ مکہ میں مسلمانوں کو کوئی فتح و نصرت نہیں ملی تھی۔

ساتھ دوسری آیت میں منافقین کے وجود کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ مکہ میں نفاق کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اسلام کا اظہار کرے اور دل میں کفر رکھے۔ مکہ میں اس کا بالعکس ہو سکتا ہے، دل میں ایمان رکھے اور کفر کا اظہار کرے۔ یہ نفاق نہیں ہے۔ ضرورت کے وقت اس کی اجازت بھی ہے۔

اس موقف پر یہ سوال آتا ہے کہ مدینہ میں کسی مسلمان کو ایسی اذیت نہیں ہوتی تھی کہ وہ دوبارہ کفر کی طرف چلا جائے۔ لہٰذا فتح و نصرت اور نفاق کی ایسی تشریح درکار ہے جو مکی حالات کے ساتھ سازگار ہو۔

المیزان فتح ونصرت کی تشریح کرتی ہے:

نصرت، فتح وغنیمت میں منحصر نہیں ہے بلکہ آسودگی بھی اس کا مصداق ہوسکتی ہے۔ ساتھ قرآن میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ نصرت حاصل بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ ان شرائط کے ساتھ وَلَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ اگر نصرت آگئی کی تعبیر اختیار فرمائی جو واقع ہونے پر دلالت نہیں کرتی اور نفاق سے مراد یہ ہے کہ اسلام کا اظہار کرنے کے بعد وہ دوبارہ کفر کی طرف سے لوٹ گئے۔

میرے نزدیک لغوی اعتبار سے نفاق ایسے لوگوں پر بیشتر صادق آتا ہے جو ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں چونکہ نفق اس سرنگ کو کہتے ہیں جس میں ایک طرف سے داخل ہوتا ہے دوسری طرف سے نکل جاتا ہے۔ ان میں ایک طرف سے ایمان داخل ہوا پھر نکل گیا تو یہ نفاق ہوگیا۔

بعض مکی نفاق کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ یہ لوگ اذیت کی وجہ سے دوبارہ کفر کی طرف لوٹ گئے تھے مگر وہ مسلمانوں سے اس کفر کو چھپاتے تھے اور اسلام کا اظہار کرتے تھے۔

چنانچہ سورہ نحل آیت ۱۰۶ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مرتد ہو گئے اور دل کھول کر (شرح صدر کے ساتھ) کفر اختیار کیا۔ ان پر اللہ کا غضب ہے۔

اہم نکات

۱۔ دنیا کی اذیت کا عذاب الٰہی کے ساتھ موازنہ نہیں ہوسکتا۔

۲۔ ایمان راسخ نہیں ہے تو آزمائش کا متحمل نہیں ہوتا۔

وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوۡا سَبِیۡلَنَا وَلۡنَحۡمِلۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ وَمَا ہُمۡ بِحٰمِلِیۡنَ مِنۡ خَطٰیٰہُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور کفار اہل ایمان سے کہتے ہیں: ہمارے طریقے پر چلو تو تمہارے گناہ ہم اٹھالیں گے حالانکہ وہ ان گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہیں، بے شک یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: مشرکین مکہ اہل ایمان سے کہتے ہیں کہ تم شرک کا راستہ جو ہمارا راستہ ہے اختیار کرو۔ اگر یہ گناہ ہوا تو تمہارے گناہ ہم اٹھالیں گے۔ اہل ایمان کو کفر کی طرف مائل کرنے اور ان

کی سادگی سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ گمراہ کن تجویز سامنے رکھی کہ اگر یہ شرک گناہ ہے تو تمہارے گناہ کا بوجھ ہم اٹھائیں گے۔ تمہارا گناہ ہماری گردن پر ہو گا۔ آج بھی بعض سادہ لوح لوگ یہی بات کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ اگر یہ جرم ہے تو یہ میری گردن پر ہو گا۔

۲۔ وَمَا هُمۡ بِحٰمِلِیۡنَ مِنۡ خَطٰیٰهُمۡ : جب کہ کوئی اور کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ تمام دنیا کے قوانین میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ مجرم کی سزا کسی اور کو دی جائے۔ قرآن نے تو متعدد آیات میں اس بات کی صراحت کی ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ...[۱] اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

یہ ایسا ہے جیسے کوئی کسی سے یہ کہے: اس چیز کو کھا لو۔ اگر اس میں بیماری ہے تو تیری جگہ میں بیمار ہو جاؤں گا۔

اہم نکات

۱۔ ہر ایک کو اپنے گناہ کا بوجھ اٹھانا ہے کوئی اور اس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

وَلَیَحۡمِلُنَّ اَثۡقَالَهُمۡ وَاَثۡقَالًا مَّعَ اَثۡقَالِهِمۡ ۫ وَلَیُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ عَمَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ البتہ یہ لوگ اپنے بوجھ ضرور اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ مزید بوجھ بھی اور قیامت کے دن ان سے ضرور پرسش ہو گی اس بہتان کے بارے میں جو وہ باندھتے رہے ہیں۔

تفسیر آیات

البتہ دوسروں کا گناہ کے بوجھ اپنے سر آنے کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی کسی کو جرم کے ارتکاب پر اکسائے تو اس صورت میں اس اکسانے والے پر بھی اس گناہ کا بوجھ آئے گا جس کا دوسرے نے ارتکاب کیا ہے اور اس دوسرے کے گناہ میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔ چنانچہ حدیث ہے:

وَ مَنِ اسۡتَنَّ بِسُنَّۃِ بَاطِلٍ کَانَ عَلَیۡهِ وِزۡرُهَا وَ وِزۡرُ مَنۡ عَمِلَ بِهَا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیَامَۃِ ...[۲] جو ایک باطل کا رواج ڈالے اس کا گناہ اس کے ذمے ہے اور جس نے اس پر عمل کیا قیامت تک اس کا بھی گناہ اس کے ذمے ہے۔

اہم نکات

۱۔ کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

---

[۱] ۳۵ فاطر: ۱۸ [۲] مستدرک الوسائل ۱۲: ۲۳۰

۲۔ کوئی کسی کو گناہ پر اکسائے تو اس شخص کے گناہ کا بوجھ اس پر آئے گا اور اس شخص کے گناہ میں کمی نہ ہو گی۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَہُمُ الطُّوۡفَانُ وَ ہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور تحقیق ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو وہ ان کے درمیان پچاس سال کم ایک ہزار سال رہے، پھر طوفان نے انہیں اس حال میں اپنی گرفت میں لیا کہ وہ ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ: حضرت نوح علیہ السلام بارے میں الاعراف: ۵۹، یونس: ۷۱، ھود آیات از ۲۵ تا ۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا: وہ اپنی قوم میں پچاس سال کم ایک ہزار سال رہے۔ بظاہر یہ حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت کی مدت ہے، عمر کی نہیں۔ رسالت پر مبعوث ہونے سے پہلے کی عمر اور قوم کی تباہی کے بعد کی مدت کا اس میں ذکر نہیں ہے۔ اس قدر لمبی مدت تبلیغ و ارشاد اور قوم کی طرف سے تکذیب و آزار کا ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے باعث تسلی و تقویت ہے۔

توریت میں آیا ہے کہ طوفان کے وقت حضرت نوح علیہ السلام کی عمر چھ سو سال تھی اور طوفان کے بعد ساڑھے تین سو سال زندہ رہے۔ مجموعاً ان کی عمر ساڑھے نو سال ہو جاتی ہے۔ (پیدائش باب نہم)

قرآن نے اس کی تصحیح فرمائی کہ ان کی رسالت کی مدت ساڑھے نو سو سال ہے۔

۳۔ فَاَخَذَہُمُ الطُّوۡفَانُ وَ ہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ: طوفان نوح کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ آسمان سے ایک یا چند بڑے اجرام سمندر میں گرے جس کی وجہ سے سمندروں کا پانی خشکی کے ایک بڑے علاقے پر طوفان کی شکل میں آ گیا۔

فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَ اَصۡحٰبَ السَّفِیۡنَۃِ وَ جَعَلۡنٰہَاۤ اٰیَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ پھر ہم نے نوح اور کشتی والوں کو نجات دی اور اس کشتی کو اہل عالم کے لیے نشانی بنا دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ نے اس طوفان سے حضرت نوح علیہ السلام اور کشتی والوں کو نجات دی۔

۲۔ وَجَعَلۡنٰہَاۤ : ھا کی ضمیر اکثر کے نزدیک کشتی کی طرف ہے چونکہ اس کشتی نے مؤمن اور کافر میں امتیاز قائم کیا اور یہ حضرت نوح علیہ السلام کی سچائی کی علامت اور حضرت نوح علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ یہ آیت بھی دلیل ہے کہ اٰیَۃً سے مراد کشتی ہی ہے:

وَاٰیَۃٌ لَّہُمۡ اَنَّا حَمَلۡنَا ذُرِّیَّتَہُمۡ فِی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ ۝ [1]　اور یہ بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔

اہم نکات

۱۔ طبیعتاً انسان طولانی عمر کی قابلیت رکھتا ہے خود انسانی تصرفات سے عمریں مختصر ہو گئیں۔

۲۔ بدتوفیق پر ہزار سالہ تبلیغ بھی اثر نہیں کرتی۔

وَ اِبۡرٰہِیۡمَ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور ابراہیم کو بھی (بھیجا) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو، اگر سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا ذکر ہے: ہم نے ابراہیم کو بھی رسول بنا کر بھیجا۔

۲۔ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ : ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو عبادت خدا و تقویٰ کی دعوت دی۔ یہ دعوت بندگی کی دونوں اہم پہلوں پر مشتمل ہے۔ واجبات کی بجا آوری اور محرمات سے پرہیزگاری، عبادت و تقویٰ سے عبارت ہے۔ اللہ کے ہر حکم کی تعمیل عبادت ہے اور اللہ کے غضب سے بچنے کی صورت تقویٰ ہے۔

۳۔ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ : اگر انسان جان جاتا۔ اس کی سعادت ان دونوں باتوں، اپنے دین و دنیا کے لیے مفید باتوں پر عمل کرنے اور مضر چیزوں سے بچنے میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی سعادت مندی کے لیے دستور حیات عبادت اور تقویٰ ہے۔

اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡثَانًا　۱۷۔ تم تو اللہ کو چھوڑ کر بس بتوں کو پوجتے ہو اور

---

[1] ۳۶ یس: ۴۱

وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡکًا ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ وَ اعۡبُدُوۡہُ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ ؕ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾	جھوٹ گھڑ لیتے ہو، اللہ کے سوا تم جن کی پوجا کرتے ہو وہ تمہیں رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے، لہٰذا تم اللہ کے ہاں سے رزق طلب کرو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کا شکر ادا کرو، تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

تشریح کلمات

اوثان: (و ث ن) وثن۔ بت۔ اوثان ان پتھروں کو کہا گیا ہے جن کی پرستش جاہلیت میں کی جاتی تھی۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡثَانًا: سابقہ آیت میں اللہ کی عبادت اور تقویٰ کی دعوت دینے کے بعد دیگر جعلی معبودوں کی نفی ہو رہی ہے۔ اللہ کی جگہ تم تو بتوں کی پوجا کرتے ہو۔ اللہ کی جگہ بت!!! کوئی موازنہ نہیں، کوئی مقابلہ نہیں۔ کل ہستی اور نیستی میں کیا مقابلہ ہے؟

۲۔ وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡکًا: تم ایک جھوٹ گھڑ لیتے ہو۔ بت کے متعلق ساری باتیں خود تمہاری گھڑی ہوئی ہیں۔ یہ بت نہ تو تمہارے خالق ہیں، نہ تمہارے رازق ہیں۔ یہ تو صرف تمہاری ذہنی تخلیق ہے۔ ان سے منسوب باتیں ہی صرف گھڑی ہوئی نہیں ہیں بلکہ خود ان کا ظاہری وجود بھی خود تمہارا تراشا ہوا ہے۔

۳۔ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ رِزۡقًا: جن معبودوں کی یہ لوگ پوجا کرتے ہیں وہ ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ وہ ان بتوں کی پوجا صرف دنیوی مفادات کے لیے کرتے ہیں۔ آخرت کے تو یہ لوگ قائل نہیں ہیں۔ مشرکین جن بتوں کی پوجا کرتے تھے وہ فرشتوں اور جنوں کی شبیہ تھے۔ وہ ان شبیہوں کی پوجا اس لیے کرتے تھے کہ وہ فرشتے اور جنات خوش ہو جائیں جن کے ہاتھ میں ان کے خیال میں ان کا رزق ہے۔ فرمایا: ان بتوں کے ہاتھ میں تمہارا رزق نہیں ہے۔

۴۔ فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ وَ اعۡبُدُوۡہُ: تمہارا رزق اللہ کے پاس ہے۔ اللہ سے اپنا رزق طلب کرو اور عبادت بھی اسی رازق کی کرو۔ اس سے یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ عبادت رازق کی ہوتی ہے۔ ہم نے عبادت کی یہ تعریف کئی بار واضح کی ہے کہ کسی ذات کو خالق اور رب سمجھ کر اس کی تعظیم کی جائے وہ تعظیم عبادت ہے، نہ ہر تعظیم۔ اس جگہ مشرکین اپنے بتوں کو رازق سمجھ کر ان کی تعظیم کرتے تھے۔ رازق ہونا رب ہونے کے تقاضوں میں سے ایک ہے۔

۵۔ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ ؕ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ: عبادت صرف دنیوی مفادات کے لیے نہیں ہوتی بلکہ عبادت

کا اصل مقصد سعادت ابدی ہے اور اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے اور حساب دینے کے بعد اس سعادت کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ رازق صرف اللہ ہے۔ عبادت بھی صرف اسی کی ہونی چاہیے۔

۲۔ غیر اللہ سے مفادات وابستہ کرنا ایک واہمہ ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَ اِنۡ تُکَذِّبُوۡا فَقَدۡ کَذَّبَ اُمَمٌ مِّنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ وَ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور اگر تم تکذیب کرو تو تم سے پہلے کی امتوں نے بھی تکذیب کی ہے اور رسول کی ذمے داری بس یہی ہے کہ واضح انداز میں تبلیغ کرے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ تُکَذِّبُوۡا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم سے خطاب ہے یا مکہ کے مشرکین سے خطاب ہے۔ دونوں صورتوں میں بتانا یہ مقصود ہے: اگر تم رسول کی تکذیب کرتے ہو تو یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے کہ تم کہہ سکو کہ اگر تم رسول ہوتے تو تمہاری کوئی تکذیب نہ کرتا۔

۲۔ وَ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ: تکذیب اس لیے واقع ہوتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا تعلق طاقت کے ساتھ نہیں، قلب و ضمیر کے ساتھ ہے۔ لہٰذا قلب و ضمیر تک آواز حق پہنچائی جاتی ہے۔ جن کا قلب و ضمیر زندہ ہے وہ اس آواز کو پہچان لیتے ہیں اور مردہ ضمیر اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ تکذیب انبیاء کا تعلق ضمیروں سے ہے خود پیغام حق سب کے لیے یکساں ہے۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ کیا انہوں نے (کبھی) غور نہیں کیا کہ اللہ خلقت کی ابتدا کیسے کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے، یقیناً اللہ کے لیے یہ آسان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا: کیا ان لوگوں نے کبھی غور نہیں کیا۔ رویت سے مراد رویت قلبی لیا جائے تو عقل و فکر

کو سوچنے کی دعوت ہے کہ جو ذات، خلقت کی ابتدا کر سکتی ہے وہ اعادہ بھی کر سکتی ہے۔

۲۔ کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ: غور و فکر اس بات میں کرنا ہے کہ اللہ خلقت کی ابتدا کیسے کرتا ہے۔ اگر خلقت کی ابتدا سمجھ میں آ جائے تو اعادہ سمجھ میں آنا آسان ہو جائے گا۔ خلقت کی ابتدا میں مشرکین کو اختلاف نہیں ہے تو اعادہ میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا سے مراد اگر ہم رویت حسی و بصری لیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کیا تم روز نہیں دیکھتے کہ اللہ خلقت کی ابتدا و اعادہ کس طرح کرتا ہے۔ اعادہ کا مطلب یہ ہے کہ تحلیل شدہ عناصر کو دوبارہ تخلیقی عناصر میں شامل کرنا۔ اس کا ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسے کیمیکل تبدیلی کہتے ہیں۔ انسان کا اپنا مادی وجود خلق و اعادہ خلق سے عبارت ہے۔ انسانی خلیات (Cells) ہمیشہ گرتے، ختم ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی جگہ خون کے ذریعے دوبارہ ان خلیات کا اعادہ تخلیق ہوتا رہتا ہے۔ انسان کا ڈھانچہ اسی خلق و اعادہ خلق پر قائم ہے۔ ایک لذیذ غذا فضلہ میں، پھر یہ فضلہ کھاد کی صورت میں ایک پھول کی تخلیق میں، پھر یہ پھول تحلیل ہو کر دیگر کسی نبات کا عنصر تخلیق بن جاتا ہے۔

لاوازیہ (Lavazieh) کے نظریے کے بعد تو اب یہ بات سب پر واضح ہے کہ دنیا میں کوئی چیز معدوم نہیں ہوتی اور کسی چیز کو دوام بھی نہیں ہے۔ مظاہر قدرت خلق و اعادہ خلق سے عبارت ہے۔ خلق و اعادہ خلق کے ذریعے دنیا میں شادابی اور زندگی کو رونق حاصل ہے۔

۳۔ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ: خود تمہارا اعادہ خلق اللہ کے لیے آسان ہے۔ اللہ کے لیے آسان اور مشکل کا تصور نہیں ہے۔ انسانی سوچ کے مطابق ابتدا کی بہ نسبت اعادہ اور نقش دوم آسان ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کی رونق، خلق و اعادہ خلق سے ہے۔

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنۡشِیٴُ النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ کہد یجیے: تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ خلقت کی ابتدا کیسے ہوئی پھر اللہ دوسری خلقت پیدا کرے گا، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ: سیر فی الارض سے احساس وشعور بیدار ہو جاتا ہے۔ مانوس مناظر

سے شاید آنکھ نہ کھلے لیکن جدید مناظر سے آنکھیں کھل سکتی ہیں۔ پھر سیر فی الارض سے کرہ ارض کے مختلف گوشوں سے ابتدائے خلقت کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

آیندہ نسلوں کو مزید معلومات حاصل ہونے کے بعد اگر راز حیات مزید منکشف ہو جائے تو ممکن ہے اعادہ حیات کا مسئلہ سائنسی بنیادوں پر حل ہو جائے:

وَ لَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَۃَ الۡاُوۡلٰی ...[1] اور بتحقیق پہلی پیدائش کو تم جان چکے ہو،

۲۔ ثُمَّ اللّٰہُ یُنۡشِئُ النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ: جب نشاۃ اولی کا علم ہو جائے تو نشاۃ اخریٰ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ طلب علم کے لیے سیر فی الارض اہمیت رکھتا ہے۔

یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡحَمُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ اِلَیۡہِ تُقۡلَبُوۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ وہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ نشأۃ اخریٰ میں جانے والوں میں سے کچھ لوگوں کو اگر اللہ چاہے عذاب دے گا اور جن پر چاہے رحم کرے گا۔ اللہ کا چاہنا ایک عادلانہ قانون کے تحت ہو گا۔ عدل و انصاف کی بنیادوں پر رحم کرے گا اور عذاب دے گا۔

۲۔ وَ اِلَیۡہِ تُقۡلَبُوۡنَ: اس فیصلے کے لیے کہ کس پر عذاب اور کس پر رحم کیا جائے گا؟ اللہ کی بارگاہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ۫ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۲۲﴾ ع

۲۲۔ اور تم اللہ کو نہ زمین میں عاجز بنا سکتے ہو اور نہ آسمان میں اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی کارساز ہو گا اور نہ مددگار۔

تفسیر آیات

۱۔ قیامت کے دن تم اللہ کے فیصلے سے نہیں بچ سکتے، نہ تم اللہ کو اپنے فیصلے پر عمل کرنے سے عاجز بنا سکتے ہو، نہ اللہ کی حکومت سے فرار ہو سکتے ہو۔ تمہارے لیے نہ زمین میں کوئی جائے فرار ہے، نہ آسمان میں۔

---

[1] ۵۶ واقعۃ: ۶۲

۲۔ اللہ کے فیصلے سے بچنے کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی تمہاری مدد کو آ جائے۔ قیامت کے دن ایسا بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی کسی کی مدد کر سکے۔

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ لِقَآئِہٖۤ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوۡا مِنۡ رَّحۡمَتِیۡ وَ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور جنہوں نے اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا وہ میری رحمت سے ناامید ہو چکے ہیں اور انہی کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرنے والی آیات و دلائل کو رد کیا اور اللہ کی معبودیت تسلیم نہیں کی، نتیجتاً اللہ سے اپنی امیدیں وابستہ نہیں کیں۔

۲۔ وَ لِقَآئِہٖۤ: اور روز آخرت کا بھی انکار کیا اور تسلیم نہیں کیا کہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔

۳۔ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوۡا مِنۡ رَّحۡمَتِیۡ: جب ان لوگوں نے دنیا میں اللہ کی رحمت کو قبول نہیں کیا تو لازمی طور پر قیامت کے دن وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائیں گے۔ انہیں خود سمجھ میں آ جائے گا کہ ہم اللہ کی رحمت کے اہل نہیں رہے۔

اہم نکات

۱۔ جو لوگ دنیا میں اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کا اہل نہیں بناتے، قیامت کے دن وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائیں گے۔

فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا اقۡتُلُوۡہُ اَوۡ حَرِّقُوۡہُ فَاَنۡجٰىہُ اللّٰہُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ تو اس (ابراہیم) کی قوم کا صرف یہ جواب تھا کہ وہ کہیں: انہیں قتل کر ڈالو یا جلا دو لیکن اللہ نے انہیں آگ سے بچا لیا، ایمان والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے قائم کردہ دلائل اور نصیحتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

۲۔ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا اقۡتُلُوۡہُ اَوۡ حَرِّقُوۡہُ: آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ ابراہیم علیہ السلام کو کس قسم کی سزا دینی چاہیے۔ چنانچہ آخر یہ طے ہوا کہ قتل کرنے سے سزا کو شہرت نہیں ملے گی، آگ میں جلانے سے زیادہ شہرت مل جائے گی۔ اس طرح یہ سزا زیادہ عبرتناک ثابت ہو گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت الی الحق کے مقابلے میں اس طاغوت کے پاس کوئی منطقی جواب نہیں تھا۔ اس لیے طاقت کی زبان استعمال کرتے ہوئے انہیں قتل کرنے یا آگ میں ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آتش سے بچنے کے مادی وسائل نہ تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور آگ کو گلزار بنا دیا۔

یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ جہاں اس کے بندے اپنے دفاع کے لیے مادی وسائل نہ رکھتے ہوں اور دشمن پوری طاقت کے ساتھ مقابلے میں آ جائے تو اللہ کی مدد معجزے کی صورت میں آ جاتی ہے اور اگر بندوں کے پاس اپنے دفاع کے لیے وسائل موجود ہوں، پھر بھی وہ دشمن کا مقابلہ نہ کریں تو اللہ کی مدد نہیں آتی۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ نمرود والے اس عظیم معجزے کے مشاہدے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کل کے مادہ پرست محسوس معجزوں پر بھی ایمان نہیں لائے۔

۳۔ فَاَنۡجٰىہُ اللّٰہُ مِنَ النَّارِ: اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو آتش سے نجات دی۔ تفصیل کے لیے سورۃ الانبیاء ملاحظہ فرمائیں۔ روایت ہے کہ آتش نے صرف اس رسی کو جلایا جس سے حضرات ابراہیم علیہ السلام کا ہاتھ پیر باندھے گئے تھے۔

۴۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آتش سے نجات دینا اللہ کی قدرت کاملہ، وعدہ الٰہی کے سچا ہونے، اپنے رسول کی حفاظت، دشمن کی خواری، بت شکنی کو جاودانی ملنے اور ایمان والوں کی فتح کی نشانی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان باللہ کی طاقت، باطل کی آتش پر غالب آنا ہے۔

وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡثَانًا ۙ مَّوَدَّۃَ بَیۡنِکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ ثُمَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یَکۡفُرُ بَعۡضُکُمۡ بِبَعۡضٍ وَّ یَلۡعَنُ بَعۡضُکُمۡ بَعۡضًا ۫ وَّ مَاۡوٰىکُمُ	۲۵۔ اور ابراہیم نے کہا: تم صرف اس لیے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو لیے بیٹھے ہو کہ تمہارے درمیان دنیاوی زندگی کے تعلقات ہیں پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے اور جہنم تمہارا ٹھکانا ہو

النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ گا اور تمہارا کوئی مددگار بھی نہ ہوگا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ: بظاہر آتش نمرود سے نجات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام ارشادات کا ذکر ہے۔

۲۔ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ: ان معجزوں کے بعد بھی بت پرستی کو ترک نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اب بھی بتوں پر تمہارا عقیدہ و ایمان پختہ ہے بلکہ ان کی پرستش کا واحد محرک آپس کے روابط اور رشتے ہیں۔ وہ گہرے روابط اور محبت و ہمدردی کو حق پر قربان کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔

آپس کے تعلقات اور برادری کی بندش ہی سبب ہے کہ تم اپنی برادری کے رسم و رواج سے باہر سوچتے نہیں ہو۔ اگر برادری کی بندش سے آزاد ہو جاتے تو تم حق کو ترجیح دیتے۔

آج بھی ہم اپنے معاشروں میں ایمانی قدروں کو برادری کی بندش پر قربان کرتے نظر آتے ہیں۔

۳۔ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ: قیامت کے دن نہ صرف یہ کہ یہ بندش ٹوٹ جائے گی بلکہ ایک دوسرے کے منکر ہو جائیں گے۔ مرید اپنے آقا کے، آقا اپنے مریدوں کے منکر ہو جائیں گے۔ نہ صرف انکار بلکہ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ایک دوسرے پر لعنت کریں گے:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝[1] اس دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے پرہیزگاروں کے۔

اہم نکات

۱۔ ہر چیز ایمان پر قربان ہو سکتی ہے، ایمان کسی چیز پر نہیں۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٦﴾ ۲۶۔ اس وقت لوط ان پر ایمان لے آئے اور کہنے لگے میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں، یقیناً وہی بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام لے آئے۔ یعنی حضرت لوط علیہ السلام آپؑ کی تصدیق کی۔ حضرت لوط آپ علیہ السلام کے بھانجے تھے اور خود بھی نبوت کی منزل پر فائز تھے۔ وہ پہلے مؤمن باللہ تھے۔

[1] ۴۳ زخرف: ۶۷

۲۔ وَقَالَ اِنِّیۡ مُہَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ یعنی اپنے رب کی خوشنودی کی طرف۔ چنانچہ حضرت ابراہیم لوط علیہما السلام اور اپنی زوجہ سارہ کے ساتھ کلدان (عراق) سے ہجرت کر کے ماوراء اردن چلے گئے۔

وَوَہَبۡنَا لَہٗۤ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ وَ جَعَلۡنَا فِیۡ ذُرِّیَّتِہِ النُّبُوَّۃَ وَالۡکِتٰبَ وَاٰتَیۡنٰہُ اَجۡرَہٗ فِی الدُّنۡیَا ۚ وَاِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عنایت کیے اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی اور انہیں دنیا ہی میں اجر دے دیا اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَوَہَبۡنَا لَہٗۤ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ: ہم نے ابراہیم کو اولاد کی نعمت سے نوازا۔ کہتے ہیں یہاں اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اس لیے نہیں آیا چونکہ عمر کے آخری حصے میں اولاد سے مایوس ہونے کے بعد اسحاق علیہ السلام عنایت ہوئے تھے۔ اس لیے اس احسان کا خاص طور پر ذکر فرمایا:

۲۔ وَجَعَلۡنَا فِیۡ ذُرِّیَّتِہِ النُّبُوَّۃَ وَالۡکِتٰبَ: چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے مبعوث ہوئے۔ خاندانی نجابت اور وارثتی خصوصیات کو اس بار امانت کو اٹھانے کی اہلیت میں بڑا دخل ہے۔

اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ ...[۱] اللہ (ہی) بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔

اس لیے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ الٰہی منصب کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا حصہ ہے۔

۳۔ وَاٰتَیۡنٰہُ اَجۡرَہٗ فِی الدُّنۡیَا: دنیا میں جو نیک نامی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حاصل ہے وہ کسی اور نبی کو نہیں۔ آپ علیہ السلام تمام ادیان سماوی کے امام ہیں اور سب اپنی حقانیت کے لیے آپ علیہ السلام کو سند قرار دیتے ہیں۔

نمرود کا تخت و تاج مٹ گیا لیکن نمرود کے ہاتھوں اسیر ہونے والے ابراہیم علیہ السلام آج تمام ادیان کی امامت کر رہے ہیں اور قیامت تک آپ علیہ السلام کی امامت قائم رہے گی۔

۴۔ وَ اِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ: ابراہیم علیہ السلام کو دنیا و آخرت دونوں میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ دنیا میں امامت کا مقام حاصل ہے اور آخرت میں صالحین کا اعلیٰ مقام حاصل ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ نے نبوت کو ایک خاندان میں مختص کر دیا ہے۔

---

[۱] ۶ انعام: ۱۲۴

۲۔ خاندانی نجابت کو منصب الٰہی کی اہلیت میں دخل ہے۔

وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ ۫ مَا سَبَقَکُمۡ بِہَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور لوط کو بھی (رسول بنایا) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: بلاشبہ تم اس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جس کا تم سے پہلے اہل عالم میں سے کسی نے بھی ارتکاب نہیں کیا۔

۱۔ وَلُوۡطًا: اور ہم نے لوط کو نبی بنا کر بھیجا۔

۲۔ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ: قوم لوط سے پہلے اس دنیا میں اس حرکت بد سے کوئی آشنا نہ تھا یا دنیا میں یہ بدفعلی اس قدر نہیں پھیلی جیسے اس قوم میں پھیلی۔

اَئِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ وَ تَقۡطَعُوۡنَ السَّبِیۡلَ ۬ۙ وَ تَاۡتُوۡنَ فِیۡ نَادِیۡکُمُ الۡمُنۡکَرَ ؕ فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا ائۡتِنَا بِعَذَابِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ کیا تم (شہوت رانی کے لیے) مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی محافل میں برے کام کرتے ہو؟ پس ان کی قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ وہ کہیں: ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ اگر تم سچے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اَئِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ: کیا تم شہوت رانی کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو۔ چونکہ اس قوم میں یہ بدفعلی اس قدر عام ہو گئی کہ کسی مہمان کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔

۲۔ وَ تَقۡطَعُوۡنَ السَّبِیۡلَ: اس جملے کی ایک تفسیر یہ ہے کہ تم افزائش نسل کا راستہ روکتے ہو چونکہ عورتوں سے نکاح نہ کرنے اور مردوں کے پاس جانے سے نسل کشی ہو جاتی ہے۔

دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے: یہ لوگ رہزنی کرتے اور راہ گزر مسافروں کو پتھر مارتے تھے۔ جسے پتھر لگ جاتا وہ اس کا ہو جاتا۔ اس کا مال چھین لیتا، اس کے ساتھ بدفعلی کرتا تھا اور تین درہم کا جرمانہ بھی اس پر لگاتا۔ اس فیصلے کے لیے ان کے پاس ایک قاضی ہوتا تھا۔

قوم لوط کی بستی چونکہ شام جانے والے قافلوں کے راستے پر واقع تھی وہ ان قافلوں پر رہزنی

کرتے تھے۔

۳۔ وَتَاۡتُوۡنَ فِیۡ نَادِیۡکُمُ الۡمُنۡکَرَ: وہ اس بدکاری کو پوشیدہ طور پر نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے لیے محفلیں جماتے تھے جیسا کہ آج کل پکچر گیلری، سینما اور میوزک ہال وغیرہ میں بجا لائی جاتی ہے اور فحاشی اور بے حیائی پر مشتمل بے تحاشا چینلز نے تو شرم و حیا کا مفہوم و مصداق بدل کر رکھ دیا ہے۔

۴۔ فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا ائۡتِنَا بِعَذَابِ اللّٰہِ: حضرت لوط علیہ السلام کی نصیحت کے جواب میں وہ کہتے ہیں: اگر آپؑ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں اور عذاب آنے کی جو آپ خبر دے رہے ہیں اس میں آپ سچے ہیں تو وہ عذاب لے آئیں۔

قَالَ رَبِّ انۡصُرۡنِیۡ عَلَی الۡقَوۡمِ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۳۰﴾ ع

۳۰۔ لوط نے کہا: پروردگارا! ان مفسدوں کے خلاف میری مدد فرما۔

تفسیر آیات

حضرت لوط علیہ السلام قوم کا یہ جواب سن کر اللہ سے اس مفسد قوم کے مقابلے کے لیے مدد مانگی۔ اس مدد کا تعلق اس قوم کی ہدایت اور راہ راست پر لانے سے تھا لیکن جب یہ قوم قابل ہدایت نہ رہی تو اس مدد کا تعلق اس قوم کی تباہی سے ہو گیا۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس عذاب کا ذکر آ رہا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ بِالۡبُشۡرٰی ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا مُہۡلِکُوۡۤا اَہۡلِ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ ۚ اِنَّ اَہۡلَہَا کَانُوۡا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور جب ہمارے فرستادہ (فرشتے) ابراہیم کے پاس بشارت لے کر پہنچے تو کہنے لگے: ہم اس بستی کے باسیوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، یہاں کے باشندے یقیناً بڑے ظالم ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ: حضرت ابراہیم کو حضرت اسحاق و یعقوب علیہما السلام کی بشارت دینے کے لیے یہ فرشتے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے جس کی تفصیل سورہ ہود آیت ۷۱ میں گزر گئی ہے۔ اس بشارت کے بعد بتایا ہمیں قوم لوط کی تباہی کے لیے بھیجا گیا ہے۔

۲۔ اَہۡلِ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ: اس بستی کے باشندوں کی ہلاکت کے لیے ہم آئے ہیں۔ چونکہ قوم لوط کی بستی شہر سدوم، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بستی ارض مقدس کے نزدیک تھی اس لیے ہٰذِہِ اشارہ قریب کا لفظ

استعمال ہوا۔

قَالَ اِنَّ فِیۡهَا لُوۡطًا ؕ قَالُوۡا نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِیۡهَا ٞ۫ لَنُنَجِّیَنَّهٗ وَ اَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ٭۫ کَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ ابراہیم نے کہا: اس بستی میں تو لوط بھی ہیں، وہ بولے ہم بہتر جانتے ہیں یہاں کون لوگ ہیں، ہم انہیں اور ان کے اہل کو ضرور بچائیں گے سوائے ان کی بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں ہو گی۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم ؑ قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے حق میں نہ تھے اور اِنَّ فِیۡهَا لُوۡطًا کہنے کا مطلب یہی ہے کہ جس قوم میں لوط موجود ہیں اس پر عذاب نازل نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ سورہ ھود میں فرمایا:

یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ؕ[1] وہ قوم لوط کے بارے میں ہم سے بحث کرنے لگے۔

قَالُوۡا نَحۡنُ اَعۡلَمُ: فرشتوں نے کہا: ہمیں زیادہ علم ہے کہ اس بستی میں کون کون بستا ہے۔ ہم لوط اور اس کے اہل بیت کو نجات دیں گے۔ سوائے اس کی زوجہ کے جو ہلاکت میں جانے والوں میں شریک ہو گی۔ چونکہ یہ عورت ایک رسول کی زوجہ ہونے کے باوجود قوم لوط کے ساتھ جرم میں شریک تھی۔

وَ لَمَّاۤ اَنۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَ ضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ وَ لَا تَحۡزَنۡ ٝ اِنَّا مُنَجُّوۡکَ وَ اَهۡلَکَ اِلَّا امۡرَاَتَکَ کَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس آئے تو لوط ان کی وجہ سے پریشان اور دل تنگ ہوئے تو فرشتوں نے کہا: خوف نہ کریں نہ ہی محزون ہوں، ہم آپ اور آپ کے گھر والوں کو بچانے والے ہیں سوائے آپ کی بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں ہو گی۔

تفسیر آیات

۱۔ فرشتوں کو خوبرو جوانوں کی شکل میں دیکھ کر حضرت لوط ؑ پریشان ہوئے کہ یہ بدکردار قوم ان

[1] ۱۱ ھود ۷۴

کی طرف بری نیت سے آئے گی اور وہ ان مہمانوں کو تحفظ بھی نہیں دے سکتے۔ اس پریشانی کو دیکھ کر فرشتوں نے کہا: لَا تَخَفۡ وَ لَا تَحۡزَنۡ کسی قسم کا خوف اور ملال نہ کریں ہم آپ کو ان کے شر سے بچائیں گے۔ تفصیل سورہ ہود آیت ۷۷ و حجر میں گزر چکی ہے۔

اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡیَةِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ بے شک ہم اس بستی میں رہنے والوں پر آسمان سے آفت نازل کرنے والے ہیں اس بدعملی کی وجہ سے جس کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے۔

وَ لَقَدۡ تَّرَکۡنَا مِنۡهَاۤ اٰیَةًۢ بَیِّنَةً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور بتحقیق ہم نے عقل سے کام لینے والوں کے لیے اس بستی میں ایک واضح نشانی چھوڑی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡیَةِ: یہ تصور مسلمہ شمار کیا جاتا ہے کہ ایک ہولناک زلزلے کے نتیجے میں شہر سدوم دھنس گیا اور اس جگہ بحیرہ مردار وجود میں آیا جسے بحر لوط بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ: رجز عذاب کے معنوں میں ہے۔ سورہ ہود میں بھی اس عذاب کا ذکر آیا کہ یہ عذاب زلزلہ کی شکل میں تھا یا آسمان سے پتھروں کی بارش کی شکل میں۔

ممکن ہے یہ عذاب آتش فشانی کے دھماکے کے ساتھ آیا ہو جس میں زلزلہ بھی ہوتا ہے اور زمین تہ و بالا ہو جاتی ہے اور آتش فشانی کی وجہ سے اوپر سے پتھروں کی بارش بھی ہو سکتی ہے۔

۳۔ وَ لَقَدۡ تَّرَکۡنَا مِنۡهَاۤ اٰیَةًۢ بَیِّنَةً: یہ نشانی آج بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ کہتے ہیں آج تک بحر لوط کے جنوبی اور مشرقی علاقوں میں اس دھماکے کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔

راقم کو سنہ ۲۰۰۱ء میں بحیرہ مردار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ موجودہ اردن اور فلسطین کے درمیان واقع اس علاقے پر آج بھی موت کے آثار چھائے ہوئے ہیں۔

چنانچہ صافات: ۱۳۷ میں فرمایا:

وَ اِنَّکُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَیۡهِمۡ مُّصۡبِحِیۡنَ ۙ

اور تم دن کو بھی ان (بستیوں) سے گزرتے رہتے ہو۔

اور سورہ حجر ۷۵۔ ۷۶ میں فرمایا:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ۝ وَ اِنَّهَا لَبِسَبِیۡلٍ مُّقِیۡمٍ ۝

اس واقعہ میں صاحبان فراست کے لیے نشانیاں ہیں اور یہ بستی زیر استعمال گزرگاہ میں (آج بھی) موجود ہے۔

وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ ارۡجُوا الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔اور (ہم نے) مدین کی طرف ان کی برادری کے شعیب (کو بھیجا) تو انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اور روز آخرت کی امید رکھو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا: حضرت شعیب علیہ السلام کو مدین والوں کی طرف مبعوث کیا: ان کی دعوت تین اہم ستونوں پر قائم تھی:

الف۔ اعۡبُدُوا اللّٰہَ: صرف اللہ کی عبادت اور ہر قسم کے شرک کی نفی۔

ب۔ وَ ارۡجُوا الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ: ان عبادتوں سے آخرت کی نجات کی امید رکھ۔ یعنی آخرت کا عقیدہ راسخ کرو۔

ج۔ وَ لَا تَعۡثَوۡا: زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ ان کے فساد کے دائرہ، ناپ تول یعنی تجارتی میدان میں خیانت اور بد دیانتی پر مشتمل تھا۔

فَکَذَّبُوۡہُ فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔پس انہوں نے شعیب کی تکذیب کی تو انہیں زلزلے نے گرفت میں لے لیا پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

تفسیر آیات

سورہ ھود میں فرمایا: اس قوم کو خوفناک آواز نے ہلاک کیا ہے۔ اس آیت میں فرمایا: زلزلے نے ہلاک کیا۔ ممکن ہے خوفناک دھماکے سے شدید زلزلے کے ساتھ خوفناک آواز بھی نکلی ہو۔

وَ عَادًا وَّ ثَمُوۡدَا۠ وَ قَدۡ تَّبَیَّنَ لَکُمۡ مِّنۡ مَّسٰکِنِہِمۡ ۟ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَصَدَّہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ وَ کَانُوۡا مُسۡتَبۡصِرِیۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور عاد و ثمود کو (بھی ہلاک کیا) اور تحقیق ان کے مکانوں سے تمہارے لیے یہ بات واضح ہو گئی اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو آراستہ کیا اور انہیں راہ (راست) سے روکے رکھا حالانکہ وہ ہوش مند تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَعَادًا وَّ ثَمُوۡدَا۠: اور ہم نے قوم عاد اور قوم ثمود کو بھی ہلاک کیا۔ جن مقامات کو آج احقاف، یمن اور حضر موت کہتے ہیں یہاں قوم عاد آباد تھی اور شمالی حجاز میں رابغ سے لے کر عقبہ تک اور خیبر سے لے کر تبوک تک کے تمام علاقوں میں قوم ثمود آباد تھی۔

۲۔ وَ قَدۡ تَّبَیَّنَ لَکُمۡ مِّنۡ مَّسٰکِنِہِمۡ: شام اور یمن کی طرف اپنے سفروں میں تم ان کی تباہی کا مشاہدہ کرتے ہو۔ نزول قرآن کے زمانے میں مکہ والے ان علاقوں سے گزرا کرتے اور اس قوم کے تباہ شدہ گھروں کا مشاہدہ کرتے تھے۔

۳۔ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ: ان کے اعمال زشت کو شیطان نے خوشنما بنا دیا۔ اس لیے وہ ان جرائم کو نیک عمل سمجھ کر بجا لاتے ہیں۔ وہ شرک کو بہترین شکل دے کر تم کو دھوکہ دیتا رہا۔

۴۔ وَ کَانُوۡا مُسۡتَبۡصِرِیۡنَ: یہ قوم اپنی جگہ ہوشمند لوگ تھے۔ اس جملے کی چند ایک تفسیریں ہیں: ایک یہ کہ یہ قوم راہ راست سے منحرف ہونے سے پہلے دین فطرت دین توحید پر تھی۔ دوسری تفسیر یہ ہے: ان لوگوں کے شیطان کے ہتھے چڑھنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ نادان تھے بلکہ یہ خاصے عقل و خرد کے مالک ہونے کے باوجود گمراہ ہو گئے۔ ایک تفسیر یہ بھی کی جاتی ہے کہ یہ لوگ ضلالت اختیار کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ سیاق آیت ان تفاسیر کے ساتھ متصادم نہیں ہے لیکن کسی ایک تفسیر کا اختیار کرنا مقام تأمل ہے۔

وَ قَارُوۡنَ وَ فِرۡعَوۡنَ وَ ہَامٰنَ ۟ وَ لَقَدۡ جَآءَہُمۡ مُّوۡسٰی بِالۡبَیِّنٰتِ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا کَانُوۡا سٰبِقِیۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اور قارون و فرعون اور ہامان کو (بھی ہم نے ہلاک کیا) اور بتحقیق موسیٰ واضح دلائل لے کر ان کے پاس آئے تھے پھر بھی انہوں نے زمین میں تکبر کیا لیکن وہ (ہماری گرفت سے) نکل نہ سکے۔

تفسیر آیات

۱۔ اور ہم نے قارون جیسے بڑے سرمایہ دار متکبر کو ہلاک کیا اور فرعون جیسے طاغوت اور جابر کو غرق آب کیا اور ہامان جیسے طاغوت کے ستون کو گرا دیا۔

۲۔ حالانکہ ان کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام واضح معجزات لے کر آئے تھے۔ ان پر حجت پوری کر چکے تھے اور حق واضح کرنے کے لازم تمام وسائل استعمال میں لائے تھے لیکن ان لوگوں نے تکبر کیا اور ان معجزات کو جادو کہہ کر حقارت سے ٹھکرا دیا۔

۳۔ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ: آخر میں وہ ہماری گرفت سے نہیں بچ سکے اور ہلاکت کی گہرائی میں گر گئے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ پس ان سب کو ان کے گناہ کی وجہ سے ہم نے گرفت میں لیا پھر ان میں سے کچھ پر تو ہم نے پتھر برسائے اور کچھ کو چنگھاڑ نے گرفت میں لیا اور کچھ کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کچھ کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا مگر یہ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ: ان سرکش اقوام میں سے ہر ایک کو اس کے جرم کے مطابق ہم نے گرفت میں لیا۔

۲۔ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا: ان میں سے قوم عاد کو شدید آندھی کے ذریعے تباہ کیا جو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن تک چلتی رہی۔

۳۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ: قوم ثمود کو چنگاڑ نے گرفت میں لیا۔

۴۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ: قارون کو زمین دھنسا دیا۔

۵۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا: فرعون کو سمندر میں غرق کر دیا۔

۶۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ: یہ سزائیں خود ان سرکش اقوام کے جرائم کے لازمی نتائج کے طور پر وقوع پذیر ہوئیں۔ ان سزاؤں کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے ان پر ظلم کیا ہے۔

یہاں اہل مکہ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم تاریخ کے اس مکافات عمل سے مستثنیٰ نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ

۴۱۔ جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بنایا ہے ان کی مثال اس مکڑی کی سی ہے جو

اِتَّخَذَتۡ بَیۡتًا ؕ وَ اِنَّ اَوۡہَنَ الۡبُیُوۡتِ لَبَیۡتُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۱﴾

اپنا گھر بناتی ہے اور گھروں میں سب سے کمزور یقیناً مکڑی کا گھر ہے اگر یہ لوگ جانتے ہوتے۔

تفسیر آیات

اس کائنات میں قوت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی طاقت موجود ہے تو اسی سرچشمے سے متصل اور اسی طاقت کے ذیل میں واقع ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی اس سلسلے میں باہر چلا جاتا ہے اور غیر اللہ سے لو لگاتا ہے تو اس غیر اللہ کی بے ثباتی اور ناتوانی مکڑی کے جالے کی طرح ہے جو معمولی چوٹ کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

لہٰذا جو لوگ غیر اللہ سے اپنی امیدیں وابستہ کرتے اور اس حیات کے لیے غیر اللہ سے سہارا لینا چاہتے ہیں وہ ایسے ہیں جیسے مکڑی کے جالے کو اپنے لیے سہارا سمجھیں۔ بھلا مکڑی کا جال انہیں کو کس مصیبت سے بچائے گا اور زندگی میں کس کام کے لیے ان کا سہارا بنے گا۔

اہم نکات

۱۔ جو غیر اللہ کو اپنا سہارا سمجھے وہ بے سہارا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ یہ لوگ اللہ کے علاوہ جس چیز کو پکارتے ہیں اللہ کو یقیناً اس کا علم ہے اور وہی بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

یہ مشرکین اللہ کو چھوڑ کر جن غیر اللہ کو پکارتے ہیں ان کے بارے میں اللہ کو علم ہے کہ وہ لا شیٔ کو پکارتے ہیں اور وہ ضرورت کے موقع پر مکڑی کے جالے کی طرح ان کے کسی کام نہ آئے گا۔ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ اگر کوئی بالادست طاقت کا مالک ہے تو اللہ کی ذات ہے۔ اگر کسی حقیقت سے منسلک رہنا ہے تو اللہ کی ذات ہی حقیقت ہے باقی لا شیٔ ہے۔

اہم نکات

۱۔ صرف اللہ کی ذات حقیقت اور واقع ہے۔

وَ تِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُہَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا یَعۡقِلُہَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں مگران کو علم رکھنے والے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

تفسیر آیات

عام سطحی ذہن ان مثالوں میں مشبہ بہ (جس کی تشبیہ دی گئی ہے) کی طرف جاتا ہے۔ وہ عظیم ہے تو تمثیل عظیم، وہ حقیر ہے تو تمثیل حقیر۔

جب کہ اہل علم کا ذہن وجہ شبہ کی طرف جاتا ہے۔ مکڑی کی مثال میں عامۃ الناس کا ذہن مکڑی کی طرف اور اہل علم کا ذہن ناپائیداری کی طرف جاتا ہے۔ جس سے اس مثال کی لطافت سمجھ میں آتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ صرف اہل علم عقل سے کام لیتے ہیں۔

خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۴﴾ ع ۱۶

۴۴۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے، اس میں ایمان والوں کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے۔

تفسیر آیات

اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے حق و حقیقت کی بنیاد پر بنایا۔ اس کی خلقت بے مقصد اور بے حکمت نہیں ہے۔ کائنات کی تخلیق میں مضمر حکمت سمجھنے کے لیے حقیقت بین قلب کی ضرورت ہے اور حقیقت بین قلب وہ ہوتا ہے جس میں ایمان ہے۔ ایمان کی شفافیت سے حقائق نظر آتے ہیں۔

الجزء ۲۱

اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ (اے نبی) آپ کی طرف کتاب کی جو وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں، یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے اور تم جو کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ: اس آیہ مبارکہ میں رسالتمآب ﷺ کے لیے دو حکم آئے ہیں۔ ایک تلاوت کتاب، دوسرا اقامہ نماز۔

تلاوت کتاب میں دعوت، تعلیم اور تربیت ہے۔ اسی لیے پہلے تلاوت کتاب کا حکم ہے کہ احکام کی ذمے داری ڈالنے سے پہلے لوگوں کو اس ذمے داری کو اٹھانے کے لیے ضروری تعلیم و تربیت دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے احکام کے نفاذ سے پہلے ایک مدت تک آیات قرآنی کی تبلیغ و ارشاد فرماتے رہے۔

۲۔ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ: **الف۔** دن میں پانچ مرتبہ اللہ کی بارگاہ میں جانے والا شخص اپنے آپ کو ہمیشہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر پاتا ہے اور اللہ کی بارگاہ میں بیٹھ کر بے حیائی اور برائی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ البتہ گناہ کا ارتکاب ممکن رہ جاتا ہے مگر جس کے دل میں شعور بیدار ہو کہ وہ اللہ کے حضور میں ہے وہ جرم کے ارتکاب سے شرماتا اور ڈرتا ہے۔

نماز، نمازی کا ضمیر بیدار رکھتی ہے جس سے گناہ کا احساس زندہ رہتا ہے۔ نماز اور عبادت سے انسان کا نفس پاکیزہ اور شفاف ہو جاتا ہے اور دل میں روشنی آ جاتی ہے جس سے برائی نمازی کے سامنے برائی کی شکل میں اور بے حیائی بے حیائی کی شکل میں آ جاتی ہے ورنہ شیطان بے حیائی کو خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے۔

وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَصَدَّہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ ۔۔۔[۱]	اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو آراستہ کیا اور انہیں راہ (راست) سے روکے رکھا۔

حدیث میں آیا ہے:

الصَّلَاۃُ قُرْبَانُ کُلِّ تَقِیٍّ ۔۔۔۔[۲]	نماز ہر متقی کے لیے ذریعہ قربت ہے۔

قرب الٰہی کے حصول سے ان چیزوں سے پرہیز کرنے کا شعور زیادہ ہو جاتا ہے جو اللہ سے دور کر دیتی ہیں۔

۳۔ تَنۡہٰی: میں النھی روکنے کے معنوں میں ہے۔ روکنے کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ نماز، نمازی کو برائی سے روکتی ہے۔ اس صورت کا ذکر ہو گیا ہے۔ دوسری صورت خود نماز برائی کو روکتی ہے، برائی کو دور کر دیتی ہے۔ یعنی نماز، نمازی کے ذمے برائی رہنے نہیں دیتی بلکہ دور کر دیتی ہے۔ اس پر سورۃ ھود کی آیت ۱۱۴ شاہد ہے کہ اقامۂ نماز کے حکم کے بعد فرمایا: نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ۔[۳]	اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں اور رات کے کچھ حصوں میں، نیکیاں بیشک برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

---

[۱] ۲۹ عنکبوت: ۳۸ [۲] الکافی ۳: ۲۶۵ [۳] ۱۱ ھود: ۱۱۴

حدیث رسول ﷺ سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے:

الصَّلَاۃُ اِلَی الصَّلَاۃِ کَفَّارَۃٌ لِمَا بَیْنَہُمَا۔[1] نماز، ایک سے دوسری نماز کے درمیان واقع ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

صلوۃ اللیل کفارۃ لما اجترح بالنہار۔[2] رات کی نماز دن کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

اس طرح نماز بہترین نیکی اور بہترین کفارہ ہے جس سے گناہ دور ہو جاتے یا ڈھل جاتے ہیں۔

جو نماز بارگاہ الٰہی میں قبول ہوتی ہے اس نماز کے یہ نتائج ہوں گے: یہ بے حیائی اور برائی کو دور کر دیتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:

من احب ان یعلم اُ قبلت صلوتہ ام لم تقبل فلینظر ھل منعتہ صلاتہ عن الفحشآء والمنکر فبقدر ما منعتہ قبلت منہ۔[3] جو یہ جاننا چاہے کہ اس کی نما قبول ہوئی ہے یا نہیں تو وہ یہ دیکھے کہ کیا اس کی نماز نے بے حیائی اور برائی کو دور کیا ہے۔ جس قدر دور کیا ہے اسی مقدار میں قبول ہوئی ہے۔

نماز بے حیائی اور برائی کا قدرتی علاج نہیں ہے۔ نماز دوائی نہیں ہے کہ جس سے بے حیائی اور برائی کا درد ختم ہو جائے اور یہ سوال پیدا کیا جائے کہ اس کا فوری اثر نہ ہوا اور نماز کے باوجود بے حیائی اور برائی کا درد ختم نہیں ہو رہا بلکہ نماز کے اپنے اثرات ہیں جو کسی وقت بھی نمودار ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ روایت ہے:

> انصار کا ایک جواں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتا تھا لیکن وہ بے حیائی اور برائی کے ارتکاب سے باز نہیں آتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا:
>
> ان صلوتہ ستنھاہ اس کی نماز عنقریب اسے روک دے گی۔
>
> چنانچہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس نے توبہ کر لی۔[4]

المیزان میں اس جگہ لکھا ہے:

> یہاں نمازی اور بے نمازی میں موازنہ ہونا چاہیے۔ بے نمازی کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نماز ترک کرنے کے ساتھ روزہ، حج، زکوۃ، خمس اور دیگر دینی واجبات ترک کرتا ہے۔ پاک و نجس اور حلال و حرام میں فرق نہیں کرتا اور نہایت لاپرواہ ہے۔ پھر اگر آپ

---

[1] مستدرک الوسائل ۳: ۹۰ [2] بحار الانوار ۸۴: ۱۳۶ [3] بحار الانوار ۱۶: ۲۰۵ [4] روح المعانی ۱۰: ۳۶۸ ذیل آیہ

موازنہ کریں اس تارک الصلوۃ اور معمولی درجہ کے نمازی میں تو تارک الصلوۃ کی بہ نسبت اس نمازی کو بہت سی برائیوں سے پاک پائیں گے پھر جو زیادہ نماز کا پابند ہے اسے زیادہ پاکیزہ پائیں گے۔

۳۔ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ: ذکر خدا تو بہت بڑا ہے۔ ذکر خدا، خدا کے علاوہ تمام چیزوں سے بڑا ہے۔ نماز ذکر خدا ہے لہٰذا نماز سب سے بڑی ہے۔ ذکر خدا اللہ کی بندگی ہے۔ اللہ کی بندگی غرض تخلیق ہے۔ اس سے بڑی کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ نماز اور ذکر خدا میں اللہ کی خوشنودی ہے۔

وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۷۲﴾[91]	اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے، یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

۴۔ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ: اللہ کو خوب علم ہے ہماری حرکتوں، اعمال، ان اعمال کے اصل محرک، ان کی نوعیت، ان کے وزن، ان میں موجود خلوص اور دیگر تمام خصوصیات کا۔

اہم نکات

۱۔ نماز پاکیزگی کا بہترین ذریعہ ہے۔

۲۔ ذکر خدا سے بڑی چیز کوئی نہیں۔

وَ لَا تُجَادِلُوۡۤا اَہۡلَ الۡکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ٭ۖ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡہُمۡ وَ قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَ اِلٰـہُنَا وَ اِلٰـہُکُمۡ وَاحِدٌ وَّ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۴۶﴾	۴۶۔ اور تم اہل کتاب سے مناظرہ نہ کرو مگر بہتر طریقے سے سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں اور کہدو کہ ہم اس (کتاب) پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے اور اس (کتاب) پر بھی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَا تُجَادِلُوۡۤا اَہۡلَ الۡکِتٰبِ: اس آیت کے شان نزول کے بارے میں کوئی روایت نہیں ہے چونکہ یہ آیت مکی ہے۔ مکہ میں اہل کتاب کے ساتھ بحث و مناظرہ کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ممکن ہے گزشتہ آیات میں گزشتہ اقوام کے حالات بیان ہوئے تو اہل کتاب اور مومنین میں قرآن کے وحی ہونے کے موضوع

---

[91] توبہ: ۷۲

پر بحث چھڑ گئی ہو اور اہل کتاب یہ الزام عائد کر رہے ہوں کہ یہ قرآن ہماری کتابوں سے اقتباس ہے۔ اس احتمال پر آیت ۴۸ قرینہ ہے جس میں فرمایا: آپ لکھتے پڑھتے نہیں تھے کہ توریت و انجیل سے اقتباس ہو سکے۔

اس آیت میں یہ حکم آیا کہ اہل کتاب سے بحث و مناظرہ کریں تو احسن طریقے سے کریں۔ احسن اخلاق اور احترام و آداب کے دائرے میں رہ کر کریں۔ حسن گفتار سے دوسرے فریق کا دل آپ کے نزدیک ہو جاتا ہے۔ آپ کی بات سمجھنے کے لیے دل کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ آپ کے حسن گفتار سے وہ آپ کی بات سننے اور سمجھنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ جب کہ بدکلامی سے دل میں نفرت آ جاتی ہے۔ نفرت سے دل کے دریچے بند ہو جاتے ہیں جس سے آپ کی منطق، دلیل اور برہان کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں ملتی۔

اسلام انسانی دعوت کا حامل ہے۔ اس دعوت میں انسان دوستی، دوسروں سے ہمدردی مضمر ہے۔ آپ دوسروں کو حق کی طرف بلا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو ان سے ہمدردی ہے۔ ان سب باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے بحث کریں تو پیار و محبت کے ساتھ کریں۔

۲۔ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ: جو آپ کے ساتھ گفتگو اور بحث میں اعتدال سے کام نہیں لیتے، اخلاق و آداب کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں، ان کے ساتھ حسن گفتار مؤثر نہیں ہے۔ نرمی کو وہ کمزوری سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے حسن گفتار کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے لیے علاج بالمثل ہونا چاہیے۔

۳۔ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا: اس جملے میں اصول مناظرہ کا ایک بنیادی اصل بیان ہوا ہے کہ کسی سے اگر مناظرہ کرنا ہو تو اختلافی مسائل پیش کرنے کی بجائے فریقین میں مشترکات کو زیر بحث لایا جائے، پھر بحث اس بات پر ہو کہ اس قدر مشترکات پر کون سا فریق قائم ہے۔ چنانچہ توریت و انجیل کو ہم سب مانتے ہیں۔

۴۔ وَ اِلٰـهُنَا وَ اِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ: یہاں قدر مشترک یہ ہے کہ مسلمان اور اہل کتاب دونوں کا معبود ایک ہے۔ دونوں ایک ہی معبود کی عبادت کرتے ہیں۔ اب بحث اس بات پر ہونی چاہیے کہ دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق اس کی عبادت کرتا ہے اور کون سا فریق ہے جو ایک ہی معبود کی عبادت سے انحراف کا شکار ہو گیا ہے۔

۵۔ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ: ہم دونوں اس ایک معبود کو تسلیم کرتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اس ایک معبود کو تسلیم کر کے اس کے احکام اپنانے اور اسے اپنی حیات کا حصہ بنانے میں کون سا فریق کامیاب ہے۔

اہم نکات

۱۔ مناظرہ میں مدمقابل کو قریب کرنے کا طریقہ قدر مشترک کو موضوع بحث بنانا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی ہے، پس جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان لوگوں میں سے بھی بعض اس پر ایمان لے آئے ہیں اور صرف کفار ہی ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ: جس طرح دیگر انبیاء علیہم السلام پر ہم نے کتاب نازل کی ہے۔ اے رسولؐ آپ پر بھی کتاب نازل کی ہے۔ یہ سلسلہ انبیاء علیہم السلام کی تسلیم شدہ روایت ہے۔ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔

۲۔ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ: اس بنیاد پر کہ یہ سلسلہ انبیا علیہم السلام کی ایک کڑی ہے اہل کتاب میں سے کچھ لوگ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن وہی کتاب ہے جس کی پیشگوئی ہماری کتابوں میں موجود ہے۔

۳۔ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ: ان لوگوں میں سے کچھ ایمان لاتے ہیں۔ اشارہ مشرکین کی طرف ہے کہ مشرکین میں سے کچھ ایسے ہیں جو اسے اللہ کی کتاب سمجھ کر اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

۴۔ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ: اس قرآن کی آیات کا انکار وہ لوگ کرتے ہیں جو حق چھپاتے اور باطل کا پرچار کرتے ہیں خواہ وہ مشرک ہوں یا اہل کتاب۔

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور (اے نبی) آپ اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ ہی اسے اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل شبہ کر سکتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اگر مشرکین نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو پڑھتے اور لکھتے دیکھ لیا ہوتا تو انہیں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا بہانہ مل جاتا کہ یہ قرآن وحی نہیں ہے بلکہ دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے۔

مشرکین مکہ نے رسول اللہؐ کے خلاف ہر الزام عائد کیا آپ کو سحر زدہ کہا گیا:

اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا — یہ ظالم کہتے ہیں: تم (لوگ) تو ایک سحر زدہ آدمی کی

مَّسۡحُوۡرًا ۝ ۱ پیروی کرتے ہو۔

اور آپ ﷺ کو جادوگر اور کذاب (بڑا جھوٹا) کہتے:

وَقَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ۝ ۲ اور کفار کہتے ہیں: یہ جھوٹا جادوگر ہے۔

آپ ﷺ کو مجنون اور کاہن کہتے:

فَذَکِّرۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَتِ رَبِّکَ بِکَاہِنٍ وَّلَا مَجۡنُوۡنٍ ۝ ۳ لہٰذا آپ نصیحت کرتے جائیں کہ آپ اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون۔

آپ ﷺ کو شاعر کہتے:

وَیَقُوۡلُوۡنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوۡۤا اٰلِہَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجۡنُوۡنٍ ۝ ۴ اور کہتے تھے: کیا ہم ایک دیوانے شاعر کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

یہ الزام بھی عائد کیا کہ آپ کو کوئی عجمی تعلیم دیتا ہے:

وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّہُمۡ یَقُوۡلُوۡنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُہٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیۡ یُلۡحِدُوۡنَ اِلَیۡہِ اَعۡجَمِیٌّ وَّ ہٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیۡنٌ ۝ ۵ اور بتحقیق ہمیں علم ہے کہ یہ لوگ (آپ کے بارے میں) کہتے ہیں: اس شخص کو ایک انسان سکھاتا ہے، حالانکہ جس شخص کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ (قرآن) تو واضح عربی زبان ہے۔

اس طرح ہر الزام عائد کیا لیکن ان الزامات میں یہ الزام شامل نہیں ہے کہ آپؐ کو لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ اس قرآن کو دوسری کتابیں پڑھ کر بنایا ہے بلکہ ایک جگہ تو مشرکین نے اپنے الزام میں کہا ہے: یہ اگلوں کی داستانوں کو لکھواتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ لکھتا ہے:

وَقَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ اکۡتَتَبَہَا فَہِیَ تُمۡلٰی عَلَیۡہِ بُکۡرَۃً وَّاَصِیۡلًا ۝ ۶ اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھوا رکھی ہیں اور جو صبح و شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

اگر رسول کریم ﷺ لکھتے اور پڑھتے تو مکے کے ناخواندہ معاشرے میں جہاں پوری آبادی میں صرف سترہ افراد کو لکھنا آتا تھا، یہ بات نمایاں طور پر معلوم ہوتی اور آج کل کے معاندین کی بہ نسبت مکہ کے معاندین کو اس الزام کی زیادہ ضرورت تھی۔

واضح رہے کہ رسول کریم ﷺ ان سیاہی کی لکیروں کو نہیں پڑھتے تھے جو انسانوں کی کھینچی ہوئی ہیں کیونکہ آپؐ کا علم ان سے ماوراء تھا۔ آپؐ لوح محفوظ کی تحریریں پڑھ کر آئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ

---

۱ ۱۷ بنی اسرائیل: ۴۷ ۲ ۳۸ ص: ۴ ۳ ۵۲ طور: ۲۹

۴ ۳۷ صافات: ۳۶ ۵ ۱۶ نحل: ۱۰۳ ۶ ۲۵ فرقان: ۵

آپؐ ان تحریروں کو بھی پڑھ اور لکھ سکتے تھے۔ قرآن میں امکان اور صلاحیت کی نفی نہیں ہے بلکہ وقوع کی نفی ہے کہ آپؐ ان کتابوں کے محتاج نہ تھے لہٰذا انہیں پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔ نہ یہ کہ پڑھنے سے معذور تھے۔

بَلۡ ہُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیۡ صُدُوۡرِ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ ؕ وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ بلکہ یہ روشن نشانیاں ان کے سینوں میں ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے اور ہماری آیات کا انکار وہی کرتے ہیں جو ظالم ہیں۔

تفسیر آیات

یہ قرآن کسی بشر کا ساختہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک واضح اور کھلا معجزہ ہے۔ اس معجزے کی جائے نزول و ظہور ان ہستیوں کا سینہ ہے جنہیں علم دیا گیا ہے۔ یہ معجزہ ان لوگوں سے مربوط نہیں ہے جنہوں نے کسی انسانی مکتب میں بشری علم حاصل کیا ہے۔ علم حاصل کرنا اور ہے اور علم دیا جانا اور ہے۔ جو لوگ بشری مکتب میں علم حاصل کرتے ہیں وہ نہایت محدود ہوتا ہے چونکہ ایسے لوگوں کا معلم ایک محدود انسان ہوتا ہے لیکن جنہیں علم دیا گیا ہے ان کا معلم اللہ تعالیٰ ہے جس کا علم غیر محدود ہے۔

وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوۡنَ: وہ لوگ کس قدر اپنے آپ سے ناانصافی کر رہے ہیں جو ایسے واضح معجزات کا انکار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا کر رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قرآن ایک ایسا روشن معجزہ ہے جو سینہ رسول ﷺ سے ظاہر ہوتا ہے۔

وَ قَالُوۡا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ اٰیٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰیٰتُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اور لوگ کہتے ہیں: اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں؟ کہد یجیے: نشانیاں تو بس اللہ کے پاس ہیں اور میں تو صرف واضح طور پر تنبیہ کرنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالُوۡا: مشرکین کہتے ہیں کہ آپؐ عصائے موسیٰ، دم مسیح کی طرح کوئی معجزہ پیش کیوں نہیں کرتے۔ وہ تمسخر کے طور پر کہتے تھے: یہ کیسا رسول ہے جس کے پاس کوئی معجزہ نہیں ہے۔ وہ قرآن کو اعتناء میں نہ لاتے اور اسے معجزہ قبول نہیں کرتے تھے۔

۲۔ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰیٰتُ عِنۡدَاللّٰہِ: کہد یجیے معجزہ دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ہر زمانے کے عصری تقاضوں کے مطابق معجزہ از خود دیتا ہے۔ تمہارے روز کے اور ہر شخص کے مطالبے پر نہیں دیتا کیونکہ جو لوگ معجزہ برائے اثبات حجت چاہتے ہیں ان کے لیے وہ معجزہ کافی ہے جو اللہ نے از خود اپنے رسولؐ کے ہاتھ ظاہر فرمایا۔ عصائے موسیٰ ان لوگوں کے لیے کافی معجزہ تھا لیکن لوگوں نے اسے جادو کہہ کر ٹھکرا دیا۔

۳۔ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ: واضح طور پر تنبیہ کرنے کے لیے جو معجزہ درکار تھا وہ اللہ تعالیٰ نے از خود پیش فرمایا، وہ قرآن ہے لیکن اسے تم نے ٹھکرا دیا، جادو، خود ساختہ داستان کہہ کر وغیرہ۔

اہم نکات

۱۔ کس زمانے کے لیے کس قسم کا معجزہ دینا ہے اس فیصلہ کا حق اللہ کے پاس ہے: اِنَّمَا الۡاٰیٰتُ عِنۡدَاللّٰہِ ....

اَوَ لَمۡ یَکۡفِہِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَرَحۡمَۃً وَّ ذِکۡرٰی لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۱﴾ ع

۵۱۔ کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جو انہیں سنائی جاتی ہے؟ ایمان لانے والوں کے لیے یقیناً اس (کتاب) میں رحمت اور نصیحت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَ لَمۡ یَکۡفِہِمۡ: کیا معجزہ کے لیے یہ قرآن کافی نہیں ہے جو ایک جامع نظام حیات ہے جس کا ملکوتی انداز کلام معجزہ ہے۔ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ عقل و فکر کی دعوت پر مشتمل تعلیمات، روحانی اور مادی تقاضوں کا حامل معجزہ ہے۔ اس معجزے کو دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات پر درج ذیل امتیازات حاصل ہیں:

i۔ یہ معجزہ یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ ہر وقت، ہر عصر کے لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ دیگر معجزات کی طرح ایک وقت، ایک قوم، ایک واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ایک دائمی اور مستمر اور جاری معجزہ ہے۔

ii۔ یہ ایک عقلی اور فکری معجزہ ہے۔ دیگر معجزات کا تعلق حسی اور محسوساتی ہونے کے اعتبار سے صرف حس و مشاہدہ سے ہے۔ صرف حس کبھی اشتباہ کا شکار ہو سکتی ہے اور جادو کا احتمال آتا ہے لیکن قرآن کا تعلق حس سماعت سے بھی ہے اور عقل و خرد سے بھی ہے۔ عقلی امور میں جادو نہیں ہوتا اور ساتھ قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ مصر و بابل کی طرح حجاز میں جادو کا کوئی رواج نہ تھا۔

iii۔ یہ معجزہ ہونے کے ساتھ رحمت بھی ہے: اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَرَحۡمَۃً ۔ اس قرآن میں رحمت ہے۔ اس قرآن کی ہر آیت، ہر قانون، ہر حکم اس پر عمل کرنے والوں کے لیے رحمت ہے:

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا ہُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ وَ لَا یَزِیۡدُ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا خَسَارًا ۝ [1]

اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے تو شفا اور رحمت ہے لیکن ظالموں کے لیے تو صرف خسارے میں اضافہ کرتی ہے۔

۲۔ وَّ ذِکۡرٰی: یہ قرآن دیگر معجزات کی طرح خاموش اور صامت معجزہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ناطق معجزہ ہے جو انسانوں کے لیے دنیا و آخرت کی سعادت کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور ہر اس چیز سے بچنے کی نصیحت کرتا ہے جو دونوں جہاں کی زندگی کے لیے مضر ہے۔

کیا ان منکرین کے لیے ان امتیازات کا حامل معجزہ (قرآن) کافی نہیں ہے۔ قوموں کی تاریخ گواہ ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ابتدائی معجزے پر ایمان نہیں لاتے وہ تجویز شدہ معجزوں سے متاثر نہیں ہوتے۔

جن لوگوں نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے ابتدائی معجزات کو تسلیم نہیں کیا ان لوگوں نے دیگر معجزوں کو بھی تسلیم نہیں کیا۔

اہم نکات

۱۔ جو لوگ اللہ کے پیش کردہ معجزات کو نہیں مانتے، وہ تجویز شدہ معجزات کو بھی نہیں مانتے۔

قُلۡ کَفٰی بِاللّٰہِ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ شَہِیۡدًا ۚ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡبَاطِلِ وَ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ کہد یجیے: میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ کافی ہے، وہ ان سب چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ کے منکر ہوئے وہی خسارے میں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت پر اللہ کی گواہی کی مختلف صورتیں ہیں:

الف: اللہ نے قرآن جیسا معجزانہ کلام نازل کر کے اس رسالت کی حقانیت کی گواہی دی ہے وہ یہ

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۲

نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کلام اللہ نہیں ہے چونکہ قرآن نے بار بار چیلنج کیا ہے کہ اگر کلام اللہ نہیں ہے تو اس جیسا کلام پیش کرو۔

ب: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے جو وعدے کیے تھے، اسلام کی فتح و نصرت اور مشرکین کی نابودی کے وہ سب وعدے پورے ہوئے۔

ج: رسول ﷺ کی زبان سے قرآن و سنت کے ذریعے جو پیشگوئیاں ہوئیں وہ سب وقوع پذیر ہوئیں۔

د: اس رسولؐ نے ایک جامع نظام حیات پیش کیا جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ وقت بتائے گا کہ وہ واحد نظام حیات ہے جو انسان کے لیے عدل و انصاف اور آسائش دے سکتا ہے۔

۲۔ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: گواہی کے لیے وہی ذات کافی ہے۔ سارا جہاں اس کے احاطہ علمی میں ہے۔ ہر جنبش اس کی نظر میں ہے۔ وہی گواہی دے سکتی ہے۔

۳۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡبَاطِلِ وَ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ: وہ لوگ خسارے میں ہیں جو ایمان کی جگہ کفر رکھتے ہیں۔ اللہ کے سامنے کفر کے ساتھ پیش آتے ہیں اور باطل پر ایمان لاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی گواہی ناقابل تردید ہوتی ہے۔

وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ ؕ وَ لَوۡ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّی لَّجَآءَہُمُ الۡعَذَابُ ؕ وَ لَیَاۡتِیَنَّہُمۡ بَغۡتَۃً وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ اور یہ لوگ آپ سے عذاب میں عجلت چاہتے ہیں اور اگر ایک وقت مقرر نہ ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا اور وہ (عذاب) ان پر اچانک ایسے حال میں آ کر رہے گا کہ انہیں خبر تک نہ ہو گی۔

یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَہَنَّمَ لَمُحِیۡطَۃٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ یہ لوگ آپ سے عذاب میں عجلت چاہتے ہیں حالانکہ دوزخ کفار کو گھیرے میں لے چکی ہے۔

یَوۡمَ یَغۡشٰہُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ فَوۡقِہِمۡ وَ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِہِمۡ وَ یَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اس دن عذاب انہیں ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے گھیر لے گا اور (اللہ) کہے گا: اب ذائقہ چکھو ان کاموں کا جو تم کیا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَیَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ: لوگ بار بار آپ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو وہ عذاب لے آئیں جس کی ہمیں دھمکی دی جا رہی ہے۔

جواب میں فرمایا: اگر حکمت الٰہی کے تحت اس عذاب کا وقت مقرر نہ ہوتا اور عدل الٰہی کے تحت مہلت دینا ضروری نہ ہوتا تو اس عذاب کے آنے میں دیر نہ لگتی۔ مہلت دینے میں بہت سی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ بطور مثال چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

الف: یہ مہلت ظالموں کے لیے سزا ہے کہ ان کے جرم میں اضافہ ہوتا ہے۔

ب: یہ مہلت مؤمنین کے لیے رحمت ہے۔ ان کا امتحان سنگین اور ان کے اجر میں اضافہ ہوتا ہے۔

ج: کافروں کی صفوں میں چند ایک قابل ہدایت لوگ ہوتے ہیں۔ آیندہ وہ اہل ایمان کی صفوں میں اس مہلت کی وجہ سے شامل ہو سکیں گے۔

د: کافروں کی نسلوں میں اہل ایمان آنے والے ہیں۔ مہلت سے ان کو وجود میں آنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

۲۔ وَلَیَاۡتِیَنَّہُمۡ بَغۡتَۃً: جب مقررہ مہلت ختم ہو جائے گی تو وہ عذاب دفعتاً آ جائے گا:

لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ فَلَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۱﴾	ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب ان کا مقررہ وقت آئے گا تو وہ گھڑی بھر کے لیے نہ تاخیر کر سکیں گے اور نہ تقدیم۔

۳۔ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ: ان نادانوں کو عذاب میں جلدی ہے حالانکہ وہ عذاب میں گھرے ہوئے ہیں۔ گویا ان لوگوں نے کفر اختیار کر کے عذاب اپنے اوپر مسلط کر رکھا ہے جس کا عملی مظاہرہ قیامت کے دن ہو گا۔

۴۔ یَوۡمَ یَغۡشٰہُمُ الۡعَذَابُ: قیامت کے دن انہیں ہر طرف سے عذاب گھیر لے گا۔ ہر طرف کے لیے اوپر اور نیچے کے ذکر پر اکتفا کیا ہے چونکہ ان دو جہتوں سے جب عذاب آئے گا تو دائیں بائیں اوپر سے آنے والا عذاب گھیر لیتا ہے۔

۵۔ ذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ: دنیا میں جو تمہارا کردار بد رہا ہے اس کا مزہ چکھو۔ خود ان کا کردار ان کو عذاب دے گا۔

اہم نکات

۱۔ مہلت مومن کے لیے رحمت اور کافر کے لیے عذاب ہے۔

۱؎ ۱۰ یونس: ۴۹

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۝

۵۶۔ اے میرے مومن بندو! میری زمین یقیناً وسیع ہے پس صرف میری عبادت کیا کرو۔

تفسیر آیات

اگر وطن اللہ کی بندگی میں آڑے آئے اور کسی وطن میں اللہ کی بندگی ممکن نہ ہو تو اللہ کی بندگی کے مقابلے میں وطن کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ خدا کی بندگی ہمیشہ وطنیت اور قومیت پر مقدم ہے۔ اگر وطن میں مؤمن اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل نہیں کر سکتا یا گناہ سے اجتناب کرنا ممکن نہیں ہے تو ایسے وطن کو ترک کر کے، ہجرت کر کے ایسی جگہ جانا چاہیے جہاں مذہبی آزادی ہو۔

حدیث میں آیا ہے:

من فر بدينه من ارض الى ارض و ان كان شبراً من الارض استوجب الجنة و كان رفيق ابراهيم و محمد صلى الله عليهما...[1]

جو شخص اپنے دین کی خاطر ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف بھاگ جاتا ہے۔ خواہ وہ ایک ہاتھ برابر ہی کیوں نہ ہو تو وہ جنت کا سزاوار ہو گا اور ابراہیم و محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہو گا۔

اس سے ان لوگوں کا انجام معلوم ہوتا ہے جو دنیا کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلے جاتے ہیں جہاں وہ اپنے دین پر عمل نہیں کر سکتے اور اولاد تو نہ ان کی دنیا کی رہتی ہے نہ دین کی۔

اہم نکات

۱۔ دین کی خاطر وطن چھوڑنا واجب ہے دنیا کی خاطر دین چھوڑنا گمراہی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۣ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝

۵۷۔ ہر نفس کو موت (کا ذائقہ) چکھنا ہے پھر تم ہماری طرف پلٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

اگر ترک وطن میں احباب، رشتہ داروں، املاک اور گھر سے جدائی کا خوف ہے تو انہیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ایک دن ان سب سے موت کے ذریعے جدائی آنے ہی والی ہے۔

۱۔ اس زندگی نے ہر صورت میں ختم ہونا ہے۔ اس ناپیدار زندگی کی خاطر اپنی ابدی زندگی کو تباہ نہ کرو۔ ہر عاقل بہتر مستقبل کے لیے وقتی اذیت اور مستقبل کی شیرینی کے لیے بہت سی تلخیاں برداشت کرتا ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۱۹: ۳۱

۲۔ ثُمَّ اِلَیۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ: لٰہذا دیکھنا یہ چاہیے کہ موت کے بعد نجات کس بات میں ہے اور اس زندگی کے بارے میں سوچو جو ابدی ہے۔ جہاں موت نہیں آئے گی: لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡہَا الۡمَوۡتَ...۔[1] جنت میں موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔

اہم نکات

۱۔ مستقبل کی فکر کرنا عقل مندوں کا کام ہے: ثُمَّ اِلَیۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ۔

۲۔ جس زندگی میں موت نہیں ہے اس کے لیے سوچنا چاہیے۔

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّہُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ غُرَفًا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ہم انہیں جنت کے بلند و بالا محلات میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، عمل کرنے والوں کے لیے کیا ہی اچھا اجر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ایمان و عمل صالح کی صورت میں ملنے والے ثواب اور نعمتوں اور کفر اختیار کرنے والوں کا احاطہ کرنے والے عذاب کے درمیان موازنہ ہو رہا ہے کہ جہاں کافروں کو عذاب نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہو گا وہاں مؤمنین جنت کی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے۔

۲۔ لَنُبَوِّئَنَّہُمۡ: ان کو اقامت گاہ فراہم کریں گے۔ یہ اقامت گاہیں بالا خانے ہوں گے جن کے زیریں علاقے نہروں پر مشتمل ہوں گے۔

۳۔ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا: سب سے بڑی نعمت ان نعمتوں کا دائمی ہونا ہو گا: نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ۔ عمل کرنے والوں کا اجر کس قدر اچھا ہے اس کا اندازہ دنیا میں انسان نہیں لگا سکتا۔

اہم نکات

۱۔ ایمان اور عمل صالح کا ثواب دائمی اور وصف و بیان سے بالاتر ہو گا۔

اَلَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ

۵۹۔ جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر بھروسا

[1] ۴۴ الدخان: ۵۶

يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۵۹ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

اوپر جس ثواب اور ابدی نعمتوں کا ذکر ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جن میں ایمان وعمل صالح کے ساتھ صبر وتوکل کی خصوصیت بھی موجود ہیں۔

ایمان اور نیک اعمال دوستونوں پر قائم ہو سکتے ہیں: وہ دوستون صبر واستقامت اور اللہ پر بھروسہ ہیں۔ صبر انسان کو مشکلات کے مقابلے میں چٹان کی طرح مضبوط بناتا ہے اور توکل اطمینان دلاتا ہے۔ صبر دشمن کی سازشوں کو حقیر دکھاتا ہے۔ توکل انجام بخیر ہونے کی امید دلاتا ہے۔ صبر دشمن کی حشمت کو نظر انداز کرتا ہے۔ توکل سے اللہ تعالیٰ کی حشمت نظر آتی ہے۔ صبر ایک عظیم طاقت ہے۔ توکل اس طاقت کا سرچشمہ ہے۔ صابر، مصیبت پر صبر کر کے اللہ کے فیصلے پر راضی ہوتا ہے۔ معصیت پر صبر کر کے اللہ کو ناراض نہیں کرتا۔ اطاعت پر صبر کر کے اللہ کو راضی کرتا ہے۔ اس طرح صابر اعمال صالحہ آسانی سے بجا لاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی بندگی کا راز صبر وتوکل میں مضمر ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶۰

۶۰۔ اور بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ہی انہیں رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی اور وہ بڑا سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

ہجرت کی صورت میں یہ نہ سوچو، کاروبار اور گھر چھوڑنے کے بعد پردیس میں کہاں سے کھائیں گے؟ اس سلسلے میں ان حیوانات سے سبق سیکھو جو اپنا رزق ذخیرہ نہیں کرتے۔ اللہ ہر روز کی روزی ان کو عنایت فرماتا ہے۔

بعض حیوانات انسان کی طرح روزی ذخیرہ کرتے ہیں۔ جیسے چوہا، چیونٹی وغیرہ مگر بہت سے حیوانات وحشرات ایسے ہیں جو ایک دن کی روزی بھی ذخیرہ نہیں کرتے۔ وہ اپنے بل یا گھونسلے سے بھوکے نکل جاتے ہیں اور شکم سیر واپس آتے ہیں۔

ہمارے معاصر تارکین وطن سے تو اس طرح خطاب ہے: اپنے وطن میں رہ کر یہ نہ سوچو ہم کہاں

سے کھائیں گے۔ تمہیں دین کے ساتھ وطن میں بھی روزی میسر آئے گی۔

اہم نکات

۱۔ روزی اللہ کے ذمے ہے۔ اس کی فکر مت کرو۔ جو کام تمہارے ذمے ہے اس کی فکر کرو۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ۚ فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا تو ضرور کہیں گے: اللہ نے، تو پھر یہ کہاں الٹے جا رہے ہیں؟

تفسیر آیات

۱۔ وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ: سوال مشرکین سے ہے جو اپنے بتوں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی دنیا سدھر جائے۔ ان کے عقیدے کے مطابق اس کائنات کا خالق اگرچہ اللہ ہے مگر تدبیر ان کے معبودوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان سے سوال ہے کہ کائنات کا خلق اور شمس و قمر کو مسخر کرنے والا کون ہے؟ مشرکین کا جواب یہ ہو گا کہ خالق اللہ ہے اور مسخر کرنے والا بھی اللہ ہے۔ اس جواب میں اس بات کا اعتراف ہے کہ تدبیر کائنات کے لیے جس تخلیق و تسخیر کی ضرورت ہے وہ اللہ کے پاس ہے تو ان کے معبود کس ذریعے سے تدبیر کر رہے ہیں۔

یہ بات قرآنی تصریحات کی روشنی میں نہایت واضح ہے کہ خلق و تدبیر ناقابل تفریق ہیں۔ اللہ کی تخلیق کی کیفیت میں تدبیر مضمر ہے۔ شمس و قمر کو جس نہج پر خلق فرمایا ہے اسی میں تدبیر مضمر ہے۔

اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ وَیَقۡدِرُ لَہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ اور تنگ کر دیتا ہے، اللہ یقیناً ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت کے مضمون کا نتیجہ ہے کہ جب تخلیق و تسخیر اللہ کے ہاتھ میں تو اس تخلیق و تسخیر کے نتیجے میں پیدا ہونے والا رزق اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس طرح اور جسے چاہتا ہے خلق کرتا ہے۔ اسی طرح جسے چاہتا ہے روزی دیتا ہے۔

اللہ اپنی مشیت کے مطابق کسی بندے کے لیے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور کسی کے لیے تنگ کرتا ہے۔ اللہ کی مشیت اندھی بانٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی علم و قدرت اور حکمت و مصلحت کے مطابق ارزاق تقسیم فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حصول رزق کے تمام وسائل جو انسان بروئے کار لاتا ہے وہ سب اللہ کے تخلیق کردہ ہیں۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِہَا لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ع

۶۳۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے پانی کس نے نازل کیا اور اس کے ذریعے زمین کو مردہ ہونے کے بعد کس نے زندہ کر دیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے، کہدیجیے: الحمد للہ، البتہ اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ: اسی طرح اگر اللہ بارش برساتا اور زمین کو آباد کرتا ہے تو تمہارے معبود کس پانی اور کس زمین سے تمہیں روزی فراہم کرتے ہیں؟

اللہ اپنی تخلیقی عمل کے ذریعے روزی فراہم کرتا ہے۔ سورج کی تپش، پانی کی طراوت اور رطوبت بارش کا سبب ہے اور رزق دینا تخلیق مسلسل سے عبارت ہے۔ جو ذات پانی کے ذریعے زمین میں دانے کا سینہ چاک کرتی ہے وہی خالق ہی رازق ہے۔

۲۔ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ: آپ اس بات پر اللہ کی حمد بجا لائیں کہ ان مشرکین پر حجت پوری ہو گئی اور آپ کے موقف کے مطابق ان کا اعتراف بھی ہو گا کہ اس کائنات کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا صرف وہی معبود ہے۔

۳۔ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ: وہ اس حد تک اپنی عقل سے کام نہیں لیتے کہ ان کے اپنے عقیدے سے متصادم عقیدہ رکھتے ہیں۔ رزق کے تمام وسائل اللہ نے پیدا کیے ہیں تو تمہارے معبود کن وسائل سے روزی دیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کی تدبیر اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ؀۶۴	۶۴۔ اور دنیاوی زندگی تو جی بہلانے اور کھیل کے سوا کچھ نہیں اور آخرت کا گھر ہی زندگی ہے، اگر انہیں کچھ علم ہوتا۔

تشریح کلمات

لَهْوٌ: (ل ہ و) اللھو ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے ہٹائے اور باز رکھے۔

لَعِبٌ: (ل ع ب) بغیر صحیح مقصد کے کوئی کام کرنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ: دنیا کی وہ زندگی جو مرضی رب کے خلاف اختیار کی جاتی ہے، بے مقصد زندگی ہے اور خود انسان بھی اس صورت میں نیچر (Nature) کے ہاتھوں ایک کھلونا بن جاتا ہے۔ اس زندگی میں اس کا مشقت اٹھانا، بیمار ہونا، زندگی میں ناکامیوں کا سامنا کرنا اور ہر روز پیش آنے والے نشیب و فراز کا مقابلہ کرنا سب بے مقصد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس زندگی کے تمام گوشے ایک کھیل سے زیادہ نہیں ہوتے۔ پس اس صورت میں دنیا ایک لھو ہے جو آپ کو اپنے مقصد سے دور رکھتی ہے۔ ایک کھیل ہے جو ایک خیالی مقصد کی طرف لے جاتا ہے۔

۲۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ: آخرت کی زندگی ہی زندگی اور حقیقی و دائمی زندگی ہے جس کے لیے کوئی زوال نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن نے سب سے زیادہ اس زندگی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے تاکید کی ہے۔

بعض اہل تحقیق کے مطابق قرآن میں ایک ہزار سات سو آیات آخرت کی زندگی کے بارے میں ہیں۔ قرآن کا ایک تہائی حصہ اس زندگی کو باور کرانے کے لیے ہے۔

البتہ دنیا کی زندگی آخرت کے لیے مرضی رب کے مطابق گزاری جائے تو اس دنیا کی زندگی کا ہر لحہ نہایت قیمتی بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس زندگی کا ایک ایک لحہ آخرت کی زندگی کے کھربوں سالوں کے لیے تقدیر ساز ثابت ہو سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دنیا برائے دنیا کی زندگی آپ کو مقصد سے دور ایک خیالی منزل کی طرف لے جاتی ہے۔

۲۔ دنیا برائے آخرت آپ کا ایک ایک لحہ قیمتی بنا دیتی ہے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ وہ جب کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں پھر جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین کے مذہب کے بطلان پر سابقہ آیات میں خود ان کے عقائد و نظریات سے استدلال کیا گیا۔ اس آیت میں ان کے ایک عمل سے ان کے مذہب کے بطلان پر استدلال کیا گیا ہے۔ وہ عمل ایسا ہے جو ان سے بے ساختہ صادر ہوتا ہے۔ اس عمل کے پیچھے اصل محرک وہ فطرت ہے جو ہر انسان میں موجود ہوتی ہے لیکن بیرونی محرکات کی وجہ سے یہ فطرت انسان کی جبلت کی گہرائیوں میں دبی رہتی ہے۔ جب وہ محرکات وعوامل ہٹ جاتے ہیں تو فطرت فعال ہو جاتی ہے۔ جس رب سے وہ مانوس ہے اسے پکارتی ہے۔

چنانچہ کشتی پر سوار مشرک جب طوفان کے خطرے میں گھیر جاتا ہے اور بچنے کے تمام وسائل سے وہ مایوس ہوتا ہے اس وقت فطرت کے منافی تمام عوامل ماند پڑ جاتے ہیں اور اس کی فطرت آزاد ہو جاتی ہے۔ فوراً وہ اپنے اس رب کو پکارتی ہے جو اس کی خلقت میں رچا بسا ہے۔

۲۔ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ: جب وہ نجات حاصل کر کے دوبارہ شرک کے ماحول میں آتے ہیں تو فطرت کے منافی عوامل دوبارہ فعال ہو جاتے ہیں اور پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ۚ وَ لِیَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ تاکہ ہم نے جو انہیں (نجات) بخشی ہے اس کی ناشکری کریں اور مزے لوٹیں لہٰذا عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

تفسیر آیات

وہ دوبارہ شرک کے مرتکب ہوتے ہیں تا کہ مشرکانہ عقائد کے تحت جو کچھ ہم نے انہیں نعمتیں فراہم کیں ہیں انہیں اپنے معبودوں کی طرف نسبت دے کر اللہ کی نافرمانی کریں اور پھر توحید کی قید و بند سے آزاد ہو کر کافرانہ مزے لوٹیں۔

اگر لِیَكْفُرُوْا اور لِیَتَمَتَّعُوْا میں لام کو لام امر قرار دیتے ہیں تو آیت کی یہ تفسیر ہو گی: جو نعمتیں ہم نے عنایت کی ہیں ان کی ناشکری کرو اور مزے لوٹو۔ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ عنقریب اس کے انجام کا تمہیں علم

ہو جائے گا۔ اس صورت میں یہ ایک تہدیدی جملہ ہو گا جیسے اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ...[۱] ہے۔

اہم نکات

۱۔ اگر فطرت سے متصادم عوامل نہ ہوں تو فطرت ہمیشہ صرف اللہ کو پکارتی ہے۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِہِمۡ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ وَ بِنِعۡمَۃِ اللّٰہِ یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنا دیا ہے جب کہ لوگ ان کے گرد ونواح سے اچک لیے جاتے تھے؟ کیا یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

جن نعمتوں کی یہ مشرکین ناشکری کرتے ہیں ان میں سے ایک امن کی نعمت ہے کہ ہم نے ان کے لیے مکہ کو حرم امن قرار دیا جب کہ ان درندہ صفت مشرکین کو حرم سے بیرون امن و سکون نصیب نہیں ہے کیونکہ جاہلیت عرب ہمیشہ جنگ و قتال لوٹ مار میں مشغول ہوتی تھی۔ صرف حرم مکہ کے رہنے والے امن و سکون کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ اَفَبِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ کیا یہ مشرکین باطل معبودوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی طرف سے عنایت شدہ امن و سکون جیسی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں کہ اس نعمت کو اللہ کی نعمت قرار نہیں دیتے۔

وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوۡ کَذَّبَ بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَہٗ ؕ اَلَیۡسَ فِیۡ جَہَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے اور جب حق اس کے سامنے آ چکا ہو تو اس کی تکذیب کرے؟ کیا جہنم میں کفار کے لیے ٹھکانا نہیں ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے پر تو مشرکین کا مذہب قائم ہے۔ ظلم، حدود سے تجاوز کرنے کے معنوں

---

[۱] ۴۱ فصلت: ۴۰

میں ہے اور یہ تجاوز اگر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں ہو تو یہ ظلم سب سے زیادہ قبیح ظلم ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے مقام ربوبیت میں کسی مخلوق یا موہوم چیز کو شریک کرنا بہت بڑا ظلم ہے جب کہ یہ نظریہ کسی منطق اور دلیل پر قائم نہیں ہے۔ یہ صرف بہتان ہے۔

۲۔ اَوۡ کَذَّبَ بِالۡحَقِّ: ان کے ظلم اور تجاوز کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس حق کے پیغام کو جھٹلایا جو ان کی نجات اور ان کے لیے دارین کی بھلائی لے کر آیا تھا۔

۳۔ اَلَیۡسَ فِیۡ جَہَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡکٰفِرِیۡنَ: کیا جہنم کافروں کا ٹھکانا مَثۡوًی نہیں ہے؟ اس تعبیر میں یہ بات مضمر ہے کہ جہنم کے علاوہ ان کا کیا ٹھکانا ہو سکتا ہے۔ پس انہیں یقیناً جہنم جانا ہے۔ مَثۡوًی اس جائے استقرار کو کہتے ہیں جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۶۹﴾ ع ۷

۶۹۔ اور جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنے راستے کی ہدایت کریں گے اور بتحقیق اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا: مشرکین کے کفر و افترا کے مقابلے میں جو لوگ جہاد کرتے ہیں ہم خود ان کے لیے اپنے راستوں کی راہنمائی کریں گے۔ انہیں اس جہاد میں کامیابی مل جائے گی بشرطیکہ وہ جہاد، فِیۡنَا راہ خدا ہی میں ہوں تو اس کو سُبُلَنَا کی راہنمائی ملے گی۔

پہلے ہم راہ خدا میں جدوجہد کریں پھر اللہ سے مشکل کشائی کی امید رکھیں۔ لہٰذا ہمیں پہل کرنا ہو گی پھر ہم اللہ کی ہدایت کے اہل ہوں گے۔ یہ درست نہیں ہے کہ اللہ سے توقع وابستہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جائیں تاکہ وہ ہمیں مفت میں اپنے راستوں کی ہدایت دے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے کہ اللہ پہل نہیں کرتا کیونکہ اگر اللہ پہل کرے تو بلا استحقاق سب کو دے یا بعض کو بلاوجہ دے اور بعض کو بلا وجہ نہ دے۔ یہ سب اللہ کی حکمت اور عدالت کے منافی ہے۔

۲۔ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ: اس جملے میں یہی نکتہ پنہاں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل کرنے کے لیے نیکی کرنے والوں کی سیرت اپنانا ضروری ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ پر توکل کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو اللہ توفیق دیتا ہے۔

۲۔ پہلے بندے کو پہل کر کے اپنے آپ کو رحمت خدا کا اہل بنانا ہو گا۔

سُوْرَةُ الرُّوْمِ

خالی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اس سورۃ المبارکہ کا نام سورۃ الروم اس لیے ہے کہ اس میں سلطنت روم کے ایرانیوں سے شکست کھانے کی خبر دی گئی ہے اور غُلِبَتِ الرُّوْمُ سے ماخوذ ہے۔

رومیوں پر ایران کی فتح تقریباً ٦١٥ عیسوی میں ہوئی ہے اور یہی اس سورۃ المبارکۃ کا سال نزول ہے۔ اسی سال حبشہ کی طرف ہجرت واقع ہوئی ہے۔

یہ سورۃ المبارکۃ بعض کے نزدیک ۵۹ آیات پر مشتمل ہے لیکن قرائت کوفی جو فی الواقع معلم قرآن حضرت علی علیہ السلام کی قرائت ہے، کے مطابق آیات کی تعداد ساٹھ ہے۔

یہ سورۃ مکی ہے۔ بعض کے نزدیک آیت ١٧ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ .... مدنی ہے۔

مضامین: یہ سورۃ المبارکۃ متعدد مضامین پر مشتمل ہے:

١۔ آنے والے تین سے نو سال کے دوران ایرانیوں پر رومیوں کے غالب آنے کی پیشگوئی۔

٢۔ تدبیر جہاں اور ربوبیت کے بارے میں چند ایک محسوس دلائل۔

٣۔ مشرکین کی رسوائی کے بارے میں چند ایک حقائق کی نشاندہی۔

٤۔ مؤمنین کے لیے فتح و نصرت کی نوید اور ضمانت۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — بنام خدائے رحمٰن رحیم

الٓمّٓ ① — ١۔ الف، لام، میم۔

حروف مقطعات کی تشریح اس سے پہلے ہو گئی ہے۔

غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ﴿۲﴾	۲۔ رومی مغلوب ہو گئے،
فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ۙ﴿۳﴾	۳۔ قریبی ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے،
فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَ یَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۴﴾	۴۔ چند سالوں میں، پہلے بھی اور بعد میں بھی اختیار کل اللہ کو حاصل ہے، اہل ایمان اس روز خوشیاں منائیں گے،
بِنَصۡرِ اللّٰہِ ؕ یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۙ﴿۵﴾	۵۔ اللہ کی مدد پر، اللہ جسے چاہتا ہے نصرت عطا فرماتا ہے اور وہ غالب آنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ: روم سے مراد قدیم ''رومن ایمپائرز'' کا وہ مشرقی حصہ ہے جو سنہ ۳۹۵ء میں اس سے کٹ کر خود ایک الگ سلطنت بن گیا۔ مسیحیوں کے قبضے میں یہ سلطنت سنہ ۱۴۵۴ء تک رہی۔ اس کے بعد ترکوں کے قبضے میں آ گئی۔ اس کا دار الحکومت استنبول یا قسطنطنیہ تھا۔ اسی کا قدیم نام جدید روم بھی ہے۔ شام فلسطین اور ایشائے کوچک کے علاقے سب اسی میں شامل تھے۔ (دریابادی)۔

سنہ ۶۱۵ عیسوی میں ایرانی بادشاہ خسرو نے سلطنت روم کے شام اور فلسطین کے علاقوں پر حملہ کیا جو اس زمانے میں روم کی سلطنت کا حصہ تھے۔ اس حملے میں ایرانیوں کو فتح مل گئی۔

۲۔ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ: قریبی سرزمین سے مراد بلاد شام ہیں جو عرب علاقوں سے متصل تھے۔ واضح رہے اس زمانے میں بلاد شام عرب علاقے شمار نہیں ہوتے تھے۔

رومیوں پر ایرانیوں کا غلبہ ۶۱۵ عیسوی میں پورا ہوا جو تقریباً ۶ سال قبل از ہجرت ہے۔ یہی اس آیت کے نزول کا زمانہ ہے۔ مشرکین مکہ ایرانی مجوسیوں کے غلبے پر خوش تھے۔ کیونکہ مجوسی بھی توحید، وحی اور نبوت کے قائل نہ تھے۔ اس وجہ سے وہ مشرکین کے قریب المذہب تھے۔ جب کہ رومی عیسائی مذہب کے تھے اور وحی و رسالت کے ماننے والے اور مسلمانوں کے قریب المذہب تھے۔

۳۔ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ: قرآن کا عظیم زندہ معجزہ ہے کہ رومیوں کی شکست کی خبر کے ساتھ چند سالوں میں ایرانیوں پر رومیوں کے غالب آنے کی پیشگوئی فرمائی۔ چنانچہ اس غیبی خبر کے مطابق چند سالوں میں رومی ایرانیوں پر غالب آ گئے۔

۴۔ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ: اس پیشگوئی میں مدت کا تعین لفظ بِضۡعِ کے ساتھ فرمایا کیونکہ بِضۡعِ کا اطلاق تین سے نو تک کی تعداد پر ہوتا ہے جو کہ ۶۲۴ء میں پوری ہوگئی اور رومیوں کو ایرانیوں پر فتح مل گئی۔ اسی سال جنگ بدر میں مسلمانوں کو عظیم فتح حاصل ہوگئی۔

۵۔ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ: حقیقت میں رومیوں کی فتح سے پہلے اور بعد اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر چاہے تو ایک فریق کو فتح دے دوسرے کو شکست دے۔ یہ فتح و شکست اللہ کی مشیت کے تابع ہے اور ان پوشیدہ رازوں کے تحت ہے جو ظاہر بینوں کی نظروں سے غائب ہیں۔

۶۔ وَ یَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ: جس دن رومیوں کو فتح ملے گی۔ اہل ایمان کو اللہ کی اس نصرت پر خوشی ہوگی اور مشرکین اس دن مایوس ہوں گے چونکہ وہ پہلے ایرانیوں کی فتح کو اپنی حقانیت کی دلیل سمجھتے تھے۔

وَعۡدَ اللّٰہِ ؕ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶﴾

۶۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

الف: اگر کسی عذر اور مجبوری کی وجہ سے وعدہ خلافی جائز ہوتی ہے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے بارے میں ممکن نہیں ہے۔ اللہ کو کوئی مجبوری پیش نہیں آتی۔

ب: نہ وعدہ خلافی میں اللہ کا کوئی مفاد ہوتا ہے۔ وہ ہر مفاد سے بے نیاز ہے۔

ج: نیز اللہ نے وعدہ خلافی نہ کرنے کی خبر دی ہے۔ وہ اپنے اس قول میں صادق ہے۔

لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ: اکثر لوگ وعدہ الٰہی کو عام وعدوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ درج بالا نکات کو نہیں سمجھتے۔

یَعۡلَمُوۡنَ ظَاہِرًا مِّنَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚۖ وَ ہُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۷﴾

۷۔ لوگ تو دنیا کی ظاہری زندگی کے بارے میں جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔

تفسیر آیات

یہ لوگ وعدہ الٰہی کے حتمی الوقوع ہونے کو نہیں جانتے۔ یہ لوگ عرفانی باتوں سے دور ہیں۔ وہ صرف اسی دنیا کی زندگی کی سطحی باتوں کو سمجھ سکتے ہیں جو ظاہری حواس اور نظر آنے والی زیب و زینت سے

مربوط ہے۔ اس سے آگے وہ اس راز زندگی کو نہیں سمجھتے جو اس دنیاوی زندگی کو آخرت کی زندگی سے مربوط بنا دیتا ہے۔ اس دنیا کی وقتی زندگی سے ابدی زندگی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ فتح و شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ وعدہ الٰہی پر یقین رکھنا ہی ایمان ہے۔

۳۔ دنیاوی زندگی کا راز آخرت کی زندگی کو آباد کرنے میں مضمر ہے۔

اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ۟ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمۡ لَکٰفِرُوۡنَ ﴿۸﴾

۸۔ کیا انہوں نے اپنے (دل کے) اندر یہ غور و فکر نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کو برحق اور معینہ مدت کے لیے خلق کیا ہے؟ اور لوگوں میں یقیناً بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ: کیا وہ اپنے اندر یعنی اپنے دل میں یہ نہیں سوچتے کہ اس کائنات کو عبث اور لغو نہیں، ایک مقصد و حکمت کے تحت بنایا ہے۔

۲۔ بِالۡحَقِّ: اس کائنات کی تخلیق مبنی برحق ہے اور حقیقت اور امر واقع پر مبنی ہے۔ کیا لوگ اس میں غور نہیں کرتے کہ وہ امر واقع کیا ہو سکتا ہے؟ وہ حق کیا ہو سکتا ہے جو اس کائنات کی تخلیق کا باعث بنا۔

اس کائنات کی تخلیق اور اس نظام کی تدبیر میں غور و فکر کرنے والوں پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تخلیق و تدبیر کے پیچھے ایک مدبر اور حکیم کا قصد و ارادہ کارفرما ہے۔ اس مدبر و حکیم نے اس بڑی کائنات کو کیوں خلق کیا ہو گا؟ اگر اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے تو یہ دنیا ایک کھلونے سے زیادہ کی معقولیت پر مبنی نہ ہو گی کہ اس دنیا میں انسانیت کی سب سے بڑی خدمت کرنے والا اور اس انسانیت پر سب سے زیادہ ظلم کرنے والا دونوں برابر ہوں۔ نتیجہ دونوں کا ایک، انجام کار دونوں کا ایک جیسا ہو۔

۳۔ بعض نے فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ کے معنی یہ کیے ہیں: کیا انہوں نے اپنے وجود کے بارے میں فکر نہیں کیا؟ لیکن یہ معنی سیاق آیت کے خلاف ہے، اگرچہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اگر انسان خود اپنے بارے میں فکر کرے تو سمجھ جاتا ہے کہ انسان کو اللہ نے اس دنیاوی زندگی کے لیے نہیں بنایا۔ اگر ایسا ہوتا تو جس قدر

اس زندگی کی آسائشیں اسے مل جاتیں اسی قدر اسے زیادہ سکون مل جاتا۔ جب کہ ایسا نہیں ہے بلکہ جس قدر کسی کے پاس یہ دنیا زیادہ آتی ہے وہ زیادہ بے سکون ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی اصل منزل دنیوی زندگی نہیں ہے۔

۴۔ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى دوسری بات یہ ہے کہ یہ کائنات ایک معین مدت تک کے لیے ہے۔ اس کائنات نے ہمیشہ قائم نہیں رہنا ہے۔ آج تو سب کے لیے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس کائنات کی بھی ایک عمر ہے تو کیا اس حکیم و مدبر نے اس کائنات کو بے مقصد بنایا اور بے مقصد اس کا خاتمہ کر دے گا۔

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ۝ [1] کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تمہیں عبث خلق کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے نہیں جاؤ گے؟

۵۔ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ: ان دلائل کے باوجود لوگوں میں ایک کثیر جماعت قیامت کی قائل نہیں ہے۔ یہاں کثیر کا لفظ استعمال فرمایا، اکثر نہیں فرمایا۔ چونکہ تمام ادیان سماوی آخرت کے قائل ہیں، اس لیے اکثر قائل ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کی تخلیق کے راز میں فکر کرنے والے کو آخرت کا وجود ضروری معلوم ہو گا۔

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّ اَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَ عَمَرُوۡہَاۤ اَکۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡہَا وَ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ؕ فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظۡلِمَہُمۡ وَ لٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ؕ﴿۹﴾

۹۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان سے پہلوں کا کیا انجام ہوا؟ جب کہ وہ قوت میں ان سے زیادہ تھے انہوں نے زمین کو تہ و بالا کیا (بویا جوتا) اور انہوں نے زمین کو ان سے کہیں زیادہ آباد کر رکھا تھا جتنا انہوں نے زمین کو آباد کر رکھا ہے اور ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے، پس اللہ تو ان پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ: مشرکین کے لیے ایک خبردار اور تباہی کی ایک خبر ہے جس میں

[1] ۲۳ مومنون: ۱۱۵

دعوت فکر بھی ہے کہ اگر تم زمین میں چل پھر کر اقوام گذشتہ کے انجام کا مطالعہ کرو تو تمہیں خود اپنی تباہی نمایاں طور پر نظر آئے گی۔

۲۔ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً: جن قوموں کی تباہی کا منظر تمہارے سامنے آئے گا وہ قوم تم سے زیادہ طاقتور تھی۔ ان کی طاقت کے آثار تمہیں نمایاں طور پر نظر آئیں گے۔ مشرکین مکہ کے پاس تو ان اقوام کی بہ نسبت کوئی طاقت موجود نہیں ہے۔

۳۔ وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ: اَثَارُوا کے معنی تہ و بالا کرنے کے ہیں جو آبادکاری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ زمین کو تہ و بالا کرنے میں زراعت بھی شامل ہے نیز کان کنی اور نہریں بنانا بھی اس میں شامل ہے۔

۴۔ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا: ان تباہ اقوام نے زمین کو مکہ والوں سے زیادہ آباد کیا تھا۔ ان کی یہ آبادکاری ان کے کام نہ آئی، وہ تباہ ہوگئیں۔ ان اقوام کے مقابلے میں مکہ والوں کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۵۔ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: ان اقوام کی طرف ان کے رسول واضح دلیل لے کر آئے تو ان لوگوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی۔ اس تکذیب کے نتیجے کے یہ خود ذمے دار ہیں۔ اللہ لوگوں کو ان رسولوں کے ذریعے ہدایت دینا چاہتا تھا، ظلم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے فرزند سے فرمایا:

اَیْ بُنَیَّ اِنِّی وَ اِنْ لَمْ اَكُنْ عُمِّرْتُ عُمُرَ مَنْ كَانَ قَبْلِی فَقَدْ نَظَرْتُ فِی اَعْمَالِهِمْ وَ فَكَّرْتُ فِی اَخْبَارِهِمْ وَ سِرْتُ فِی آثَارِهِمْ حَتّٰی عُدْتُ كَاَحَدِهِمْ بَلْ كَاَنِّی بِمَا انْتَهٰی اِلَیَّ مِنْ اُمُورِهِمْ قَدْ عُمِّرْتُ مَعَ اَوَّلِهِمْ اِلٰی آخِرِهِمْ....[1]

اے فرزند! اگرچہ میں نے اتنی عمر نہیں پائی جتنی اگلے لوگوں کی ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی میں نے ان کی کارگزاریوں کو دیکھا۔ ان کے حالات و واقعات میں غور کیا اور ان کے چھوڑے ہوئے نشانات میں سیر و سیاحت کی یہاں تک کہ گویا میں بھی انہی میں کا ایک ہو چکا ہوں بلکہ ان سب کے حالات و معلومات جو مجھ تک پہنچ گئے ہیں ان کی وجہ سے ایسا ہے کہ گویا میں نے ان کے اول سے لے کر آخر تک کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔

اہم نکات

۱۔ تاریخی تحولات ناقابل تغیر قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

[1] نہج البلاغۃ خط: ۳۱

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٠﴾ ع

۱۰۔ پھر جنہوں نے برا کیا ان کا انجام بھی برا ہوا کیونکہ انہوں نے اللہ کی نشانیوں کی تکذیب کی تھی اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

تفسیر آیات

ا۔ السُّوْٓاٰى: اسوأ کی تانیث کا صیغہ ہے۔ جیسے احسن کی تانیث الحسنی ہے۔ جیسے لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى[1] میں ہے۔

جس طرح نیکی کرنے والوں کی جزا نیکی ہی ہوتی ہے اسی طرح برائی کرنے والوں کی سزا بری ہو گی۔ جس طرح سورہ یونس کی آیت میں الحسنیٰ سے مراد ثواب و جزا لی جاتی ہے اور عاقبت بھی مراد لی جا سکتی ہے۔ اس طرح یہاں بھی السُّوْٓاٰى سے مراد سزا بھی لی جاتی ہے اور عاقبت بھی۔

۲۔ اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: ان کے برے انجام سے دوچار ہونے کی وجہ ان کی طرف سے آیات الٰہی کی تکذیب اور آیات الٰہی کا تمسخر اڑانا ہے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿١١﴾

۱۱۔ اللہ خلقت کی ابتدا فرماتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ فرماتا ہے پھر تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

اللہ کے لیے جب خلقت کی ابتدا مشکل نہیں ہے تو اس کا عادہ کیسے مشکل ہو گا۔ اعادہ تو ابتدا سے زیادہ آسان ہے۔ سورہائے یونس: ۴۔۳۴، النمل: ح، عنکبوت: ۱۹ میں مزید تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿١٢﴾

۱۲۔ اور جس روز قیامت برپا ہو گی مجرمین ناامید ہوں گے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿١٣﴾

۱۳۔ اور ان کے بنائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ان کا سفارشی نہ ہو گا اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۲٦

تفسیر آیات

۱۔ جب قیامت برپا ہو گی، پردے ہٹ چکے ہوں گے، حقائق سامنے آ چکے ہوں گے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ ہمارے لیے یہاں کوئی سہارا نہیں ہے۔ نجات کی کوئی امید نہیں ہے۔

۲۔ رہے وہ شریک جن کی یہ لوگ دنیا میں پرستش کرتے رہے ہیں، وہ بھی ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔

۳۔ وَ کَانُوۡا بِشُرَکَآئِہِمۡ کٰفِرِیۡنَ: حقائق فاش ہونے پر یہ بات بھی منکشف ہو جائے گی کہ ان بتوں کی پرستش کرنا واہمہ پرستی تھی اس لیے ان شریکوں سے کسی مدد کی امید کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ سرے سے ان کے منکر ہو جائیں گے کہ یہ ہمارے معبود نہیں ہیں۔

وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ یَوۡمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوۡنَ ﴿۱۴﴾	۱۴۔ اور جس دن قیامت برپا ہو گی اس دن لوگ گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔
فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَہُمۡ فِیۡ رَوۡضَۃٍ یُّحۡبَرُوۡنَ ﴿۱۵﴾	۱۵۔ پھر جنہوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال انجام دیے وہ جنت میں خوشحال ہوں گے۔
وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآیِٔ الۡاٰخِرَۃِ فَاُولٰٓئِکَ فِی الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۱۶﴾	۱۶۔ اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری نشانیوں اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی وہ عذاب میں پیش کیے جائیں گے۔

تشریح کلمات

رَوۡضَۃٍ: (ر و ض) الروض اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو اور سرسبز بھی ہو۔

یُّحۡبَرُوۡنَ: (ح ب ر) یحبرون کے معنی ہیں کہ وہ جنت میں اس قدر خوش ہوں گے وہاں کی نعمتوں کی تر و تازگی کا اثر ان کے چہروں پر ظاہر ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ: جب قیامت برپا ہو گی تو اللہ تعالیٰ کے عادلانہ فیصلے کے مطابق لوگوں کی ان کے اعمال و کردار اور ایمان و کفر کی بنیاد پر تقسیم بندی ہو گی۔

اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ○ ۱؎	کیا ہم ایمان لانے اور اعمال صالح بجا لانے والوں کو زمین میں فساد پھیلانے والوں کی طرح قرار دیں یا اہل تقویٰ کو بدکاروں کی طرح قرار دیں؟

۲۔ اس عادلانہ تقسیم کے مطابق ایمان و عمل صالح والے باغات میں خوشحال و شاداں ہوں گے اور کفر اختیار کرنے والے عذاب میں حاضر کیے جائیں گے۔ مُحۡضَرُوۡنَ اور یُحۡبَرُوۡنَ کی تعبیر ہی میں وہ اشارہ موجود ہے کہ ایمان اور کفر والوں کا انجام کس قدر مختلف ہے کہ ایمان والے خوشحال و شاداں ہوں گے جب کہ کفر اختیار کرنے والوں کو عذاب کے لیے جبراً پیش کیا جائے گا۔

فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ﴿۱۷﴾	۱۷۔ پس اللہ کی ذات پاک و منزہ ہے جب تم شام کرتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو۔
وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیۡنَ تُظۡہِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾	۱۸۔ ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے آسمانوں اور زمین میں تیسرے پہر کو اور جب تم ظہر کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ: یہ تنزیہی کلمہ ہے اس بات سے جو مشرکین اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ اللہ مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پاک و منزہ ہے اس عجز و ناتوانی سے جس کی نسبت مشرکین دیتے ہیں۔ لفظ سبحان قرآن میں ہمیشہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اور اہل لغت نے بھی تصریح کی ہے۔ العین میں آیا ہے:

سبحان اللّٰہ تنزیہ للّٰہ عن کل ما لا ینبغی ان یوصف بہ۔	سبحان اللّٰہ کا مطلب اللہ کو پاک و منزہ قرار دینا ہے ہر اس بات سے جس سے اللہ کا متصف ہونا درست نہیں ہے۔

۳۴۷

جیسے

سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ○ ۲؎	وہ پاک اور بالاتر ہے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔

جب تسبیح کا حکم دینا مقصود ہو تو فرماتا ہے:

وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ ○ ۳؎	جب آپ اٹھیں تو اپنے رب کی ثنا کے ساتھ تسبیح کریں۔

۱؎ ۳۸ ص: ۲۸ ۲؎ ۳۹ زمر: ۶۷ ۳؎ ۵۲ طور: ۴۸

۲۔ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ: یہ جملہ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ کے ساتھ مربوط ہے۔ یعنی پھر تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ اللہ دائماً پاک و منزہ ہے۔ تم جب شام و سحر دوپہر اور ظہر کے اوقات میں داخل ہوتے ہو۔ ان اوقات میں زمانے کی تقسیم بندی ہوتی ہے یا اجزاء زمانہ بتانا ہو تو ان اوقات کو اجزاء کے طور پر بیان کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہمیشہ اور دوام بتانا ہے کہ اللہ ہر وقت اور زمانے میں ہمیشہ پاک و منزہ ہے۔ اکثر مفسرین یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ اس آیت میں نماز کے اوقات کی طرف اشارہ ہے اور سبحان سے مراد سبحوا ہے۔ یعنی ان اوقات میں تسبیح پڑھا کرو، نماز پڑھو۔ جب کہ سبحان، سبحو اللّٰہ کے معنی میں نہیں آیا کرتا۔ اس کی کوئی مثال نہیں ہے اور آیت میں چار اوقات کا ذکر ہے، نماز کے اوقات پانچ ہیں۔ لہٰذا ان اوقات سے مراد نماز کے اوقات نہیں ہیں بلکہ مطلق تسبیح کا حکم ہے۔ نماز بھی تسبیح ہے جو اس میں شامل ہے۔

۳۔ وَلَہُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: اللہ تمہاری حمد و تسبیح کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ کی تسبیح تو ساری کائنات میں ہو رہی ہے۔ تُصۡبِحُوۡنَ اور تُظۡہِرُوۡنَ کے درمیان یہ جملہ معترضہ ہے۔

یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ یُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ وَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ وَ کَذٰلِکَ تُخۡرَجُوۡنَ ﴿۱۹﴾ ع

۱۹۔ اور وہ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

زندگی مردہ مادے کی گود میں پلتی ہے اور بہت سے مردہ مواد ایسے ہیں جو زندہ نامی اجسام کی پیداوار ہیں۔

اگرچہ زندگی کا مصدر زندگی ہی ہوتی ہے تاہم اس زندگی کو اللہ تعالیٰ مردہ مادے کو گود میں پالتا ہے۔ اسی سے فرمایا:

وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ۚ[1] — اور بتحقیق ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے بنایا۔

زمین میں یہ مناظر ہمیشہ ہماری نظروں میں ہوتے ہیں۔ بہار کی زندگی کو خزاں کی موت فنا کر دیتی ہے۔ ہری بھرا کھیت یکایک خاک میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر اس خاک سے حیات نو بڑی تیزی کے ساتھ سر اُٹھاتی ہے۔

---

[1] ۲۳ مومنون: ۱۲

وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ: تم بھی جب خاک کے ذروں میں تبدیل ہو جاؤ گے، ان ذرات کو جمع کر کے دوبارہ اٹھانا اسی طرح ہو گا جس کا مظاہرہ تم روز دیکھتے ہو۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝۲۰

۲۰۔ اور یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے بنایا پھر تم انسان ہو کر (زمین میں) پھیل رہے ہو۔

تفسیر آیات

بے جان عناصر ارضی سے ایک عقل و شعور کا مالک پیدا کرنا کیا اللہ کی قدرت کاملہ کی دلیل نہیں ہے کہ وہ انسانوں کے مرنے کے بعد بھی ایسا کر سکتا ہے۔

اس آیت کے مخاطب مشرکین ہیں۔ وہ اللہ کے خالق ہونے کے قائل تھے۔ وہ حیات بعد از موت کے قائل نہ تھے۔ اس آیت میں فرمایا کہ اللہ کی قدرت کاملہ پر دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ مردہ خاک سے انسان کو پیدا کر سکتا ہے۔ اسی انسان کے خاک ہونے کے بعد اسے دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱

۲۱۔ اور یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے ازواج پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے مابین محبت اور مہربانی پیدا کی، غور و فکر کرنے والوں کے لیے یقیناً ان میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ: اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے دلائل میں سے ایک دلیل کا بیان ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور مدبریت کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے:

۲۔ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ: اللہ نے خود تمہاری نوع یعنی خود انسان سے تمہارے لیے ازواج بنائے۔ انسان اپنے ہم نوع انسان سے مانوس ہوتا ہے۔

۳۔ لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا: تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اگر زوجہ نوع انسان سے نہ ہوتی تو وہ

سکون حاصل نہ ہوتا جو انسان اور اپنی ہم نوع ہونے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ آیت کے اس جملے سے واضح ہوا کہ مرد زوجہ کے بغیر بے سکون ہے، ناقص ہے اور ایک مضطرب الحال مخلوق کامل نہیں ہوتی۔

۳۔ وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّ رَحۡمَۃً: اللہ نے زوج و زوجہ کے درمیان محبت اور مہربانی پیدا کی۔ مجمع البیان میں آیا ہے۔ مودۃ کے معنی محبت اور رحمۃ کے معنی مہربانی و شفقت ہے۔

محبت کی وجہ سے یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے کشش رکھتے اور قریب آ جاتے ہیں اور رحمۃ کی وجہ سے ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ چونکہ شفقت و مہربانی کی نوبت ضرورت اور احتیاج کی صورت میں پیش آتی ہے لہٰذا زوجین میں سے ہر ایک کو دوسرے کے لیے مہربان بنا دیا۔

۴۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ: صاحبان فکر کے لیے اس نظام زوجیت میں اللہ کی ربوبیت پر دلائل موجود ہیں۔

اول تو مرد و زن کی تخلیق میں توازن روز اول سے لے کر آج تک برقرار ہے۔ نہ عورتوں کے لیے مردوں کی قلت ہے، نہ مردوں کے لیے عورتوں کی قلت ہے۔ ثانیاً اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش ودیعت فرمائی کہ ایک دوسرے سے سکون مل جائے۔ سوم یہ کہ ان دونوں میں حاکم اور محکوم کا نہیں، محبت و شفقت کا رابطہ قائم کیا۔ دونوں احترام آدمیت میں مساوی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ زوجین کو جن خصلتوں کے ساتھ خلق فرمایا ان میں بقائے نوع انسانی کی ضمانت ہے۔ اس لیے خلق، تدبیر سے جدا نہیں ہے۔

وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَ اَلۡوَانِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے، علم رکھنے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ: اللہ کے واحد رب اور مدبر ہونے کے شواہد میں سے ایک شاہد یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق وہی ہے اور رب اور معبود وہ ہوتا ہے جو خالق ہے۔

۲۔ وَ اخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَ اَلۡوَانِکُمۡ: اسی لب و دہن اور محدود حروف سے نہ ختم ہونے والے

الفاظ بنتے ہیں اور لاکھوں زبانیں وجود میں آتی ہیں۔ زبان انسان کی بقا و ارتقا کے لیے ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبانوں کا اختلاف اس صلاحیت کی وجہ سے ہے جو اللہ نے انسان میں ودیعت فرمائی ہے۔ جس سے انسان اپنے مافی الضمیر کا اظہار لفظوں کے ذریعے آسانی سے کر دیتا ہے۔ ورنہ ایک معنی کو سمجھانے کے لیے خود اس معنی کو پیش کرنا پڑتا۔ مثلاً کسی کو پانی سمجھانا ہوتو اس کے لیے اگر لفظ کا آسان ذریعہ نہ ہوتا تو خود پانی کو سامنے کر کے سمجھانا پڑتا۔ اختلاف زبان سے اختلاف لہجہ بھی مراد ہوسکتا ہے اور رنگوں کے اختلاف سے ایک دوسرے کی شناخت میں مشکل پیش نہیں آتی اور قبائل و اقوام میں امتیاز آ جاتا ہے۔

۳۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ: اس دلیل کو اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ زبانوں اور رنگوں کے اختلاف میں نوع انسانی کی بقا و ارتقا کے کون سے راز پنہاں ہیں۔ اگر سب کا رنگ اور زبان و لہجہ کلام ایک ہوتا تو کیا کیا مشکلات پیش آتیں۔ دنیا کا نظام ایک دوسرے سے امتیاز پر قائم ہے۔ اگر یہ امتیاز نہ ہوتا تو ظالم سے مظلوم کی شناخت نہ ہوتی۔ مدعی سے مدعا علیہ کی پہچان نہ ہوتی۔ کلوننگ کو ناجائز سمجھنے والے اسی بات سے استدلال کرتے ہیں۔

وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ ابۡتِغَآؤُکُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور تمہارا رات میں سو جانا اور دن میں اس کا فضل (رزق) تلاش کرنا اس کی نشانیوں میں سے ہے، (دلائل کو توجہ سے) سننے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں.

تفسیر آیات

۱۔ وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمۡ: اللہ کی ربوبیت کی آیات و شواہد کا ذکر ہے کہ رب صرف اللہ ہے جس نے انسان کی تخلیق کے ساتھ نیند بھی اس میں ودیعت فرمائی ہے اور نیند کے ذریعے انسانی زندگی کی تدبیر فرمائی ہے کہ نیند سے انسان کو وہ طاقت واپس مل جاتی ہے جو دن میں زندگی کی دوڑ دھوپ میں خرچ ہوگئی تھی۔ اگر انسان کی تخلیق کے ہمراہ تدبیر نہ ہوتی اور خالق مدبرانہ ارادہ نہ رکھتا تو اس تخلیق میں نیند ودیعت کر کے انسان کو ہمیشہ مستعد رکھ کر اس کی بقا و ارتقا کا سامان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

نیند ایک نعمت ہے۔ اس زندگی کا گزارنا آسان کام نہیں ہے۔ دنیا ہمیشہ آپ کی خواہش کے مطابق نہیں چلتی۔ پریشانی اور ذہنی تناؤ اس زندگی کا حصہ ہے۔ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی۔ دوسری طرف دن بھر کی جفاکشی اور محنت کے بعد آپ کے اعصاب تھک جاتے ہیں۔ ایسے میں نیند ایک ایسی نعمت ہے جس میں انسان تمام پریشانیوں سے بے خبر ہو کر سو جاتا ہے۔ خستہ اعصاب کو سکون ملتا ہے اور بدن کی

صلاحیتیں تازہ دم ہو جاتی ہیں۔

۲۔ وَابۡتِغَآؤُکُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ: تلاش معاش کے لیے محنت کرنا نیند پر موقوف ہے۔ نیند کے ذریعے انسان محنت کے لیے مستعد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا رات کی نیند اور دن کی محنت تدبیر حیات کے دو اہم ستون ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ مدبر ہونے کا ثبوت ہیں۔

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحۡیٖ بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اور خوف اور طمع کے ساتھ تمہیں بجلی کی چمک دکھانا اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرنے کے لیے آسمان سے پانی برسانا بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے، عقل سے کام لینے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ: برق، اللہ کی ربوبیت اور مدبریت پر دلالت کرنے والے شواہد میں سے ایک اہم شاہد ہے۔ اللہ کے تدبیری امور میں بادلوں میں چمکنے والی بجلیوں کا اہم کردار ہے کہ اس سے نکلنے والی حرارت سے فضا کی ہوا کے دباؤ میں کمی آتی ہے، بارش برسنا شروع ہو جاتی ہے اور زمین پر موجود بہت سے جراثیم ہلاک ہوتے ہیں اور زراعت کے لیے کھاد فراہم ہوتی ہے۔

۲۔ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا: اس برق میں ہلاکت کا خوف ہے۔ کبھی آسمانی بجلی گرنے سے ہلاکتیں ہوتی ہیں اور بارش کی طمع بھی اس سے وابستہ ہوتی ہے۔

۳۔ وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اوپر ذکر ہوا کہ یہ بجلی بارش کا سبب بنتی ہے جس سے زمین آباد اور ارزاق فراہم ہوتے ہیں۔

۴۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ: اس سے عقل سے کام لینے والوں کے لیے اللہ کی ربوبیت پر دلیل موجود ہے کہ وہی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جس ذات نے یہ نظام پیدا کیا ہے وہی اس نظام کو چلا رہی ہے۔

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَ الۡاَرۡضُ بِاَمۡرِہٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاکُمۡ دَعۡوَۃً ٭ۖ مِّنَ الۡاَرۡضِ ٭ۖ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ تَخۡرُجُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اور یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جب وہ تمہیں زمین سے ایک بار پکارے گا تو تم یکایک نکل آؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ: اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور ربوبیت و مدبریت کے شواہد میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان اور زمین امر خدا سے قائم ہیں۔ یہ دونوں صرف اپنے وجود میں آنے کے لیے اللہ کا محتاج نہیں ہیں بلکہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے بھی اللہ کے محتاج ہیں۔ چنانچہ اجرام سماوی اور زمین، اپنی گردش اور قوت جاذبہ و دافعہ میں تعادل کی وجہ سے قائم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ اسی تعادل کے ذریعے اس نظام کی تدبیر ہو رہی ہے۔ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ جاذبہ اور دافعہ اللہ کے علاوہ کسی اور نے پیدا کیا ہے۔ یہ حکم خدا ہے جو کل کائنات میں نافذ ہے۔

۲۔ ثُمَّ اِذَا دَعَاکُمۡ دَعۡوَۃً: اسی ذات کی طرف سے جب یہ حکم آئے گا تو تم کو زمین کے شکم سے نکلنا پڑے گا جس کا حکم کل کائنات کے ذرے ذرے پر نافذ ہے اس کا حکم تمہارے ذرات پر بھی نافذ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ واضح رہے کہ ان آیات کا رخ ان مشرکین کی طرف ہے جو غیر اللہ کو رب سمجھتے تھے اور تدبیر حیات میں انہی ارباب کو موثر سمجھتے تھے۔ وہ ان معبودوں کی عبادت اپنی دنیوی زندگی کے مسائل کے حل کے لیے کرتے تھے اور وہ حیات بعد الموت کے قائل نہ تھے۔ لہٰذا ان آیات میں ایک تو ان شواہد کا ذکر ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر دلالت کرتے ہیں، دوسرے وہ شواہد جو حیات بعد الموت پر اللہ کے قادر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

وَلَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے اور سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ کل کائنات کا مالک ہے۔ اللہ بذات خود مالک ہے۔ دوسرے اللہ کی طرف سے مالک بنانے پر مالک ہوتے ہیں۔ اللہ ہر شیء کی ذات کا مالک ہے کہ اس کا وجود اللہ کی طرف سے ہے اور اس کی بقا بھی اللہ کی طرف سے ہے جب کہ غیر اللہ کسی شیء کے صرف استعمال کا مالک ہے۔

۲۔ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ: کائنات کی ہر شیء اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع فرماں ہے۔ جس نظام پر ان اشیاء کو چلایا ہے اس سے ذرہ برابر انحراف نہیں کر سکتیں۔ اجرام سماوی کو جس مدار پر لگایا ہے، اربوں سال میں ایک سیکنڈ کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ نباتات کو نشو و نما کا جو نظام دیا ہے اس سے بالکل انحراف نہیں کر

سکتے۔ لہٰذا قنوت اطاعت کے معنوں میں ہے اور یہاں اطاعت سے مراد تکوینی اطاعت ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۷

۲۷۔ اور وہی خلقت کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرتا ہے اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے اور آسمانوں اور زمین میں اس کے لیے اعلیٰ شان و منزلت ہے اور وہ غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ کے لیے کوئی کام کسی دوسرے کام سے مشکل یا آسان نہیں ہوتا۔ مشکل اور آسان کا تصور وہاں آتا ہے جہاں کسی کام کی انجام دہی کے لیے وسائل اسباب کی ضرورت ہو۔ کم اسباب کا کام آساں اور زیادہ اور پیچیدہ وسائل و اسباب کا کام مشکل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کوئی کام کسی وسائل و اسباب کے ذریعے انجام نہیں دیتا۔ ہر کام میں اس کا ارادہ کارفرما ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ اللہ کے لیے اعادہ خلق زیادہ آساں ہے۔ یہ تعبیر بشری فہم کے مطابق اختیار کی گئی ہے کہ جہاں نقش اول مشکل اور نقش دوم آساں ہوتا ہے۔ سورہ ہائے یونس: ۴۔۳۴، نمل: ۶۴، عنکبوت: ۱۹ میں ابتدا و اعادہ خلق کے بارے میں رجوع فرمائیں۔

۲۔ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى: اللہ کی لا محدود قدرت، حیات، مالکیت، عظمت، جود و سخا کے چھوٹے چھوٹے اور محدود نمونے آسمانوں اور زمین موجود ہیں۔ یہاں موجود محدود حیات کی اعلیٰ مثال اللہ کی لا محدود حیات ہے۔ یہاں کی حیات مستعار ہے۔ اللہ کی حیات بذات خود ہے۔ کائنات میں جو حیات مستعار اور محدود ہے اس کی اعلیٰ ترین مثال اللہ کی حیات ہے۔ غرض کائنات میں موجود اوصاف محدود، مستعار اور غیر مستقل ہیں۔ ان اوصاف میں اعلیٰ ترین مثال اللہ کے لیے ہے۔ قدرت کی کائنات میں اعلیٰ ترین قدرت اللہ کی ہے۔ علم کی دنیا میں اعلیٰ ترین علم اللہ کا ہے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۭ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۗءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ

۲۸۔ وہ تمہارے لیے خود تمہاری ایک مثال دیتا ہے، جن غلاموں کے تم مالک ہو کیا وہ اس رزق میں تمہارے شریک ہیں جو ہم نے تمہیں دیا ہے؟ پھر وہ اس میں (تمہارے) برابر ہو جائیں اور

تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

تم ان سے اس طرح ڈرنے لگو جس طرح تم (آزاد) لوگ خود ایک دوسرے سے ڈرتے ہو؟ عقل رکھنے والوں کے لیے ہم اس طرح نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ: اس مثال کا موضوع یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق خود اللہ کی شریک نہیں ہوسکتی۔ نہ تخلیق میں، نہ کائنات کی تدبیر میں۔

مشرکین اللہ کو مالک تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی مملوک کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اس مثال میں یہ وضاحت ہے کہ تم اللہ کے دیے ہوئے مال میں اپنے مملوک غلام کو شریک کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو لیکن یہ بات کس قدر نامعقول ہے کہ اللہ کی مخلوق اور مملوک کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔

فِیْ مَا رَزَقْنٰكُمْ: قابل توجہ بات یہ ہے کہ تم اس چیز میں اپنے مملوک کو برابر شریک نہیں بنا سکتے جو اللہ نے تمہیں دی ہے۔ وہ خود تمہاری پیدا کردہ نہیں ہے، اللہ کی دی ہوئی ہے۔ پھر تم اپنی پیدا کردہ باتوں میں اس کی مخلوق کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔

۲۔ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ: تمہیں اس بات کا خوف لاحق ہے کہ تمہارے غلام تمہاری مرضی کے خلاف ان چیزوں میں تصرف نہ کریں جس طرح دو شریک تصرف کرتے ہیں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شریک کو یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ دوسرا شریک اس کی مرضی کے خلاف تصرف نہ کرے۔

۳۔ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ: تم اپنے غلاموں کے تصرف سے بالکل اسی طرح خائف رہتے ہو جس طرح تم آزاد لوگ اپنے مشترکہ مال میں خائف رہتے ہو کہ دوسرا شریک تمہاری مرضی کے خلاف تصرف نہ کرے۔ اَنْفُسَكُمْ سے مراد آزاد لوگ ہیں۔

تو جب تم مجازی مالک اپنے مجازی مملوک کو یہ حق دینے کے لیے آمادہ نہیں ہو تو حقیقی مالک کے لیے اپنی مخلوق اور حقیقی مملوک کو یہ حق دینے کا عقیدہ کیسے رکھتے ہو؟

۴۔ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ: اس مثال کا سمجھنا عقل سے کام لینے پر موقوف ہے۔

اہم نکات

۱۔ کبھی ایک مطلب کو سمجھانے کے لیے مخاطب کو خود اس کی حالت میں اتارنا پڑتا ہے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا

۲۹۔ مگر ظالم لوگ نادانی میں اپنی خواہشات کی

اَهۡوَآءَهُمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ۚ فَمَنۡ يَّهۡدِىۡ مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۹﴾

پیروی کرتے ہیں پس جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

تفسیر آیات

۱۔ ایک طرف خواہشات کا غلبہ ہو اور دوسری طرف جہالت ہو تو ایسے لوگوں کے لیے شرک جیسے ظلم کے ارتکاب کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ چنانچہ اگر عالم اپنی خواہشات کی پیروی کرے تو یہ امکان رہتا ہے کہ اس کا علم، اسے خواہشات سے کسی مرحلے میں روک سکتا ہے۔

۲۔ فَمَنۡ يَّهۡدِىۡ مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ: جس سے ہدایت کا واحد سرچشمہ "اللہ" ہاتھ اٹھائے اسے ہدایت اور کون دے گا؟ مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ جسے اللہ گمراہ کرے کا مطلب یہ ہے کہ جسے اللہ ہدایت نہ دے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝[1]		بے شک اللہ ظالموں کی راہنمائی نہیں کرتا۔

ظالموں یعنی مشرکوں نے ہدایت کے سارے ذرائع مسترد کر دیے اور ہدایت کے قابل نہ رہے تو اللہ ایسے ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا یعنی جبراً ہدایت ان پر مسلط نہیں کرتا چونکہ وہ اختیاری ہدایت قبول نہیں کرتے ہیں اور جبری ہدایت اللہ کو قبول نہیں ہے۔ جبری ہدایت تو قیامت کے دن سب کو حاصل ہوگی۔

اہم نکات

۱۔ ضلالت کے دو سرچشمے ہیں: خواہش پرستی اور جہالت۔

۲۔ جو اختیاری ہدایت کے لیے آمادہ نہیں ہے، اللہ اسے جبری ہدایت نہیں دیتا۔

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ پس (اے نبی) یکسو ہو کر اپنا رخ دین (خدا) کی طرف مرکوز رکھیں، (یعنی) اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہے، یہی محکم دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

---

[1] ۵ مائدہ: ۵۱

تفسیر آیات

۱۔ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ: مشرکین کی طرف سے ہونے والی تکذیب و تمسخر اور خواہش پرستی کی پرواہ کیے بغیر اپنی ساری توجہ دین پر مرکوز رکھیں اور اپنے موقف پر استقامت کے ساتھ قائم رہیں۔

۲۔ حَنِيۡفًا: پوری یکسوئی کے ساتھ باطل نظریات سے لاتعلق اور تمام غیر اللہ سے بے نیاز ہو کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر تکیہ کر کے،

۳۔ فِطۡرَتَ اللّٰهِ: اللہ کی فطرت کی طرف اپنی ساری توجہ مرکوز رکھیں۔ اعنی فطرۃ اللّٰہ۔ جس دین کی طرف اپنی پوری توجہ مرکوز رکھنے کا حکم ہے وہ اللہ کی فطرت سے عبارت ہے۔ وہ دین فطری تقاضوں سے عبارت ہے۔ دین ایک جبری اور مسلط کردہ چیز نہیں ہے۔ وہی فطرت اور جبلت میں موجود تقاضے ہیں۔

۴۔ الَّتِيۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا: فطرت وہ اساس اور وہ بنیاد ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور دین بھی اسی اساس اور بنیاد پر قائم ہے چونکہ دین زندگی کے لیے ایک دستور حیات کا نام ہے۔ جس نے حیات بخشی ہے اسی نے اس حیات کے لیے دستور عنایت فرمایا۔ لہٰذا اس دستور اور حیات میں تصادم نہیں ہوسکتا بلکہ یہ دستور اس حیات کے تمام تقاضوں کے مطابق ہی ہوسکتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات تخلیق فرمائی تو اس وقت کائنات کی ہر چیز میں وہ باتیں ودیعت فرمائیں جو ان چیزوں کی بقا و ارتقا کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَيۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۞ [1]	موسیٰ نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

واضح رہے فطرت کے تقاضے خلقت کے ماوراء میں ودیعت ہیں خود خلقت نہیں ہیں جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے کہ خلقت کے بعد ہدایت اس میں ودیعت ہوئی ہے۔ پس جس طرح تمام موجودات کی بقا و ارتقا کے لیے ضروری ہدایات اور سوجھ بوجھ ان میں ودیعت ہوئی ہیں بالکل اسی طرح شریعت نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

فطرت میں اس بات کی سوجھ بوجھ ودیعت فرمائی کہ معاشروں میں عدل و انصاف ہونا چاہیے۔ شریعت نے اس کی تفصیل بیان کی کہ عدل و انصاف کس طرح قائم ہوسکتا ہے:

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۞ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۞ [2]	اور (قسم ہے) نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا، پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔

---

[1] ۲۰ طٰہٰ: ۵۰ [2] ۹۱ شمس: ۷۔ ۸

پس فطرت میں بدکاری اور اس سے بچنے کی سوجھ بوجھ موجود ہے۔ شریعت نے اس کی تفصیل بیان کی ہے، بدکاری کون سی چیزیں ہیں اور اس سے بچنے کے طریقے کون سے ہیں۔

اللہ نے توحید اور معرفت رب فطرت میں ودیعت فرمائی۔ شریعت نے اس کی تفصیل بیان کی کہ معرفت رب کے تقاضے کیا ہیں۔

لہٰذا فطرت اور شریعت میں اگر کوئی فرق ہے تو اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام فطرت کے اجمال کی تفصیل بیان کرنے کے لیے مبعوث ہوئے۔ اسی لیے فطرت، انبیاء علیہم السلام کی آواز کو پہچانتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو پذیرائی ملتی ہے۔ ورنہ غیر فطری مسلط شدہ چیز کو پذیرائی نہ ملتی اور ندائے اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ کا مثبت جواب بَلٰی نہ ملتا۔

چنانچہ اعراف آیت ۱۷۲ کے ذیل میں ہم نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ خالق نے تخلیق انسان کے موقع پر اولاد آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تھا۔ ہمارے نزدیک اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے: انسان کی تخلیق کے موقع پر اس کی فطرت اور سرشت میں معرفت رب ودیعت فرمائی۔ یہ معرفت جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ماورائے خلقت ودیعت ہوئی ہے۔ جیسا کہ انسان کی تخلیق میں کام آنے والے کھربوں خلیات کی پیدائش ایک خلیے سے ہوئی اور جو سبق ابتدائی خلیے میں موجود جین (Gene) کو پڑھایا گیا وہ آنے والے تمام خلیات میں بطور وراثت منتقل ہوتا گیا۔

انسان نے اب تک جس حد تک عالم خلیات میں جھانک کر دیکھا ہے اور تخلیق و تعمیر پر مامور اس محیر العقول لشکر کی حیرت انگیز کرشمہ سازیوں کا مشاہدہ کیا ہے اس سے یہ بات بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی پشت سے ان کی نسل کو نکالا تھا تو نسل انسانی کی جبلت کے ابتدائی خلیے کو اپنی ربوبیت کا درس پڑھایا ہو پھر اس سے اس کا اقرار لیا ہو۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے مبعوث ہونے کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ فرمایا:

لِیَسۡتَاۡدُوۡھُمۡ مِیۡثَاقَ فِطۡرَتِہٖ۔۔۔۔[1] انہیں اس لیے بھیجا تا کہ لوگوں کو اللہ کی فطرت کا عہد و میثاق یاد دلائیں۔

اور یہ سوال جو پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا عہد و میثاق ہم سے لیا گیا ہے ہمیں یاد کیوں نہیں حضرت امام صادقؑ اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں:

ثبتت المعرفة فی قلوبهم و نسوا الموقف۔[2] یعنی لوگ واقعہ بھول گئے مگر معرفت دلوں میں نقش ہو گئی

ہم اپنے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں: کلاس بھول گئے مگر سبق یاد ہے۔

---

[1] نہج البلاغۃ باب المختار خ ۱ [2] المحاسن ۱: ۲۴۱

رسول اللہ ﷺ کی حدیث مشہور ہے:

کل مولود یولد فھو علی الفطرۃ و انما ابواہ یھودانہ او ینصرانہ۔[1]	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہ اس کے والدین ہیں جو اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔

دین کے فطری ہونے کے سلسلے میں درج ذیل نکات قابل توجہ ہیں:

i۔ فطرت کے تقاضے کبھی بیرونی منفی عوامل کی وجہ سے دب جاتے ہیں۔ مثلاً علم دوستی بھی انسان کی فطرت میں بالاتفاق موجود ہے لیکن منفی تربیت کی وجہ سے علم دوستی کا رجحان ناپید ہو جاتا ہے۔ جب یہ بیرونی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں تو فطرت سلیمہ کو اپنا تقاضا پورا کرنے کا موقع مل جاتا ہے:

وَ اِذَا غَشِیَهُمۡ مَّوۡجٌ کَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ ...[2]	اور جب ان پر (سمندر کی) موج سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو وہ عقیدے کو اسی کے لیے خالص کر کے اللہ کو پکارتے ہیں۔

جب انسان کے دل و دماغ سے تمام بیرونی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں تو اس وقت انسان کو اپنی فطرت کے ساتھ سرگوشی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس وقت فطرت کو اس کے خالق کے سوا کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔

ii۔ نفسیاتی ماہرین کو اس بات کا علم ہو گیا کہ جمال پرستی، علم اور احسان دوستی انسانی فطرت میں رچی بسی ہے۔ بعد میں ماہرین پر یہ بات واضح ہوگئی کہ خدا پرستی بھی انسان کی فطرت میں رچی بسی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ باقی فطری باتوں کے لیے خدا پرستی بنیاد ہے۔ یعنی ذوق جمالیات کی بنیاد ذوق بندگی سے ہے: اِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ۔[3] علم دوستی کی بنیاد بھی معرفت رب کے حصول سے ہے اور احسان دوستی کا جذبہ بھی انسان کو اللہ کی عبودیت سے ملا ہے۔ چنانچہ انسان ایسے لوگوں کے عاشق ہوتے ہیں جو دوسروں پر احسان کرتے ہیں۔

iii۔ دین اگر فطری نہ ہوتا تو اسے دوام نہ ملتا۔ چنانچہ غیر فطری امور بیرونی عوامل کی وجہ سے بدلتے رہتے ہیں جب کہ دین ماقبل تاریخ کے زمانوں میں بھی رائج تھا۔

۵۔ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ: اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ تخلیق سے مراد فطرت ہے۔ فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ تمام انسانوں کی فطرت ایک ہے۔ نوع ایک ہے۔ مصلحت ایک ہے۔ رہنما بھی ایک ہے۔ فطرت ہی رہنما ہے۔ ہادی میں تبدیلی نہیں اور ہدایت میں بھی تبدیلی نہیں ہے۔ اگر فطرت میں انحراف آ جائے تو دین دوبارہ فطرت کی طرف واپس کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین تمام ادوار اور تمام اقوام کے لیے ایک ضرورت ہے۔

---

[1] تصحیح الاعتقاد: ۱ [2] ۳۱ لقمان: ۳۲ [3] الکافی ۶: ۴۳۸ بروایت امیر المومنین علیہ السلام

۶۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ : فطرت اور شریعت کی یہ وحدت، دین قیم ہے۔ دین، انسانی فطرت سے قابل تفریق نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ دین کے فطری ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اقامہ دین کے لیے کوشش کی ضرورت نہیں: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ ....

۲۔ دین ہر انسان کی فطرت و جبلت میں رچی بسا ہے: فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ....

۳۔ دین کو فطرت کا سہارا حاصل ہے اور محکم ہے: ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ....

۴۔ فطری تقاضے ماند پڑ جاتے ہیں نابود نہیں ہوتے: لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ....

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہونا۔

تفسیر آیات

۱۔ سابقہ آیت میں خطاب صرف رسول اللہ ﷺ سے ہوا اور جب یہ بات ہو چکی کہ فطرت ہی دین قیم ہے تو اس آیت میں سب سے خطاب کر کے فرمایا: ہر انحراف کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرو۔

۲۔ وَاتَّقُوْهُ : فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے غضب اور اس کے انتقام سے بچو۔ بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ نماز قائم ہو جائے اور کسی قسم کے شرک کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

اہم نکات

۱۔ فطرت کا شجر جب پھیلتا ہے تو تقویٰ و نماز کا پھل دیتا ہے: وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ....

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور جو گروہوں میں بٹ گئے، ہر فرقہ اس پر خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ نہ ہی ان لوگوں میں ہونا جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی ہے۔ چونکہ شرک ہوس پرستی کی

وجہ سے وجود میں آتا ہے اور خواہشات کی بنیاد پر جو چیز وجود میں آئے گی اس میں اختلاف ضرور آئے گا۔ چونکہ لوگوں کی خواہشات مختلف ہوتی ہیں۔

۲۔ کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ: جب ہوس پرست لوگ مختلف فرقوں میں بٹ جاتے ہیں اور ہر ایک فرقہ اپنے لیے ایک معبود بنا لیتا ہے تو ہر ایک اپنے پاس موجود عقائد و خرافات پر خوش رہتا ہے چونکہ خواہشات اسے خوشنما بنا دیتی ہیں۔ کسی کو ستارہ پرستی اچھی لگتی ہے تو کسی کو بت پرستی، کسی کو آتش پرستی، کسی کو جن پرستی بھلی لگتی ہے۔ ہر ایک کو اپنا خود ساختہ معبود و مذہب اچھا لگتا ہے۔ جب کہ دین فطرت ہر جگہ، ہر وقت، ہر قوم، ہر زمانہ میں ایک ہی ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تفرقہ بازی فطرت کے اثرات کے سامنے رکاوٹ بنتی ہے: مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ ....

۲۔ فرقہ بازی کی وجہ سے انسان باطل پر خوش رہتا ہے: بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ۔

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوۡا رَبَّہُمۡ مُّنِیۡبِیۡنَ اِلَیۡہِ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَہُمۡ مِّنۡہُ رَحۡمَۃً اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ بِرَبِّہِمۡ یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں پھر جب وہ انہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک فرقہ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تکلیف کے وقت ضمیر آزاد، فطرت شفاف اور وجدان بیدار ہو جاتا ہے، غیر فطری رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور اپنے خالق کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لیے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی فطری محرک کے مطابق اللہ کی بارگاہ میں پہنچ جاتے، دَعَوۡا رَبَّہُمۡ اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

۲۔ مُّنِیۡبِیۡنَ اِلَیۡہِ: اس وقت یہ حقیقی معنوں میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

۳۔ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَہُمۡ مِّنۡہُ رَحۡمَۃً: تکلیف ختم ہونے کے بعد صحت و عافیت، امن و سلامتی کی نعمتوں میں خوشی کی زندگی میسر آ جاتی ہے تو ضمیر پر وہی پرانا پردہ پڑ جاتا ہے۔ فطرت مکدر اور وجدان مردہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ دوبارہ فطرت سے منحرف ہو جاتے اور شرک جیسی غلاظت میں گر جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ غیر مومن صرف مصیبت کے وقت خدا کو یاد کرتا ہے جب کہ مومن اللہ کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے:

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ ....

لِیَکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اٰتَیۡنٰہُمۡ ؕ فَتَمَتَّعُوۡا ٝ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ تاکہ جو ہم نے انہیں بخشا ہے اس کی ناشکری کریں، پس اب مزے اڑاؤ، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ لِیَکۡفُرُوۡا: لام برائے بیان عاقبت ہے۔ وہ دوبارہ شرک میں مشغول ہو جاتے ہیں تاکہ ہم نے جو نعمتیں انہیں دی ہیں ان کی ناشکری کریں۔ بعض کے نزدیک یہ لام امر غائب کے لیے ہے۔ یعنی جو ہم نے انہیں عنایت کیا ہے اس کی ناشکری کرو اور مزے اڑاؤ۔ یہ تہدید کی صورت بنتی ہے۔

اَمۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنًا فَہُوَ یَتَکَلَّمُ بِمَا کَانُوۡا بِہٖ یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل نازل کی ہے جو اس شرک کی شہادت دے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ سلطان سے مراد دلیل ہے کہ کیا ہم نے ان مشرکین پر کوئی دلیل نازل کی ہے کہ وہ اپنے شرک کے لیے اس دلیل کو پیش کریں۔ دلیل کا واحد مصدر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ سے مربوط ہے۔ اللہ کی طرف سے سند کے بغیر خود کوئی حکم صادر کرتا ہے تو یہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت ہے۔

وَ اِذَاۤ اَذَقۡنَا النَّاسَ رَحۡمَۃً فَرِحُوۡا بِہَا ؕ وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ اِذَا ہُمۡ یَقۡنَطُوۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور جب ہم لوگوں کو کسی رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر خوش ہو جاتے ہیں اور جب ان کے برے اعمال کے سبب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔

تفسیر آیات

جو شخص بھی ایک محکم اور استوار موقف پر قائم نہیں ہے وہ بدلتے حالات کی رو میں تنکے کی طرح بہ جاتا ہے۔ خوشحالی پر اترانا اور گردش ایام میں ناامیدی کی تاریکی میں ڈوب جانا بے موقف انسان کا شیوہ ہے۔ جب کہ اللہ پر پختہ یقین رکھنے والے لوگ جبل راسخ کی طرح ہوتے ہیں اور وہ تیز ترین آندھیوں سے

نہیں ملتے۔

آیت ۳۳ میں فرمایا: یہ لوگ مصیبت کے موقع پر اللہ کو پکارتے ہیں جب کہ اس آیت میں فرمایا: مصیبت کے وقت مایوس ہوتے ہیں۔ پکارنا مایوس نہ ہونے کی صورت میں ہوتا ہے جب کہ مایوس ہونے کی صورت میں پکارتے نہیں ہیں، تو کیا ان دونوں آیتوں میں تصادم ہے؟

اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ آیت ۳۳ میں ناگہانی آفت جیسے زلزلہ طوفان وغیرہ کی صورت میں مؤمن اور مشرک سب اللہ کی طرف رجوع کر کے دعا کرتے ہیں جب کہ اس آیت میں فرمایا: خود ان کے اپنے کیے کے نتیجہ میں بِمَاقَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو مایوس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قدرتی آفات اور اپنی شامت اعمال میں فرق ہوتا ہے۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۷﴾	۳۷۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ اور تنگ کر دیتا ہے؟ مومنین کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

ا۔ کیا جو لوگ مصیبت کے وقت مایوس ہو جاتے ہیں، نہیں جانتے کہ روزی میں کشادگی اور تنگی اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ فیصلے کے مطابق ہوتی ہے۔ لہٰذا نعمت کے موقع پر اترانا نہیں چاہیے۔ یہ نعمت زوال پذیر ہے اور مصیبت کے وقت مایوس نہیں ہونا چاہیے چونکہ یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ صحیح ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے کچھ علل و اسباب، عوامل و محرکات ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب اور علة العلل ہے۔ تمام معاملات بالآخر اللہ کی حکیمانہ مشیت پر منتہی ہوتے ہیں۔

فَاٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ وَ الۡمِسۡكِیۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِیۡلِ ؕ ذٰلِكَ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَ اللّٰهِ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۸﴾	۳۸۔ پس تم قریبی رشتہ داروں کو اور مسکین اور مسافر کو ان کا حق دے دو، یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی رضامندی چاہتے ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

تفسیر آیات

ا۔ فَاٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ: قریبی رشتہ دار کو اس کا حق دے دیں۔ خطاب رسول اللہ ﷺ سے

ہے۔ حَقَّہٗ سے ظاہر ہوتا ہے قریبی ترین رشتہ داروں کا حق پہلے سے متعین ہے۔ اسی طرح مساکین اور مسافر کا بھی حق معین ہے۔

مجمع البیان میں ابوسعید خدری سے روایت ہے:

لما نزلت هذه الاية على النبی اعطی فاطمة فدکا و سلمها الیها۔	جب یہ آیت رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تو فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فدک عنایت فرمایا اور ان کے سپرد فرمایا۔

شواھد التنزیل میں اس آیت کے ذیل میں ابن عباس سے روایت ہے:

لما نزل فَاٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ دعا رسول اللّٰہ فاطمة و اعطاها فدکاً و ذلك لصلة القرابة۔	جب آیت فَاٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو بلایا اور قرابتی رشتے کی بنا پر انہیں فدک عطا فرمایا۔

حضرت امام محمد باقر و حضرت امام صادق علیہما السلام سے بھی یہی روایت ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ بنی اسرائیل آیت ۲۶۔

اگر اس آیت کو مدنی قرار دیتے ہیں تو یہاں مراد خمس ہے۔ چنانچہ مضمون آیت اور روایت دونوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ سورہ مکی ہے تاہم یہ آیت اور آنے والی آیت جس میں ربا اور زکوۃ کا ذکر ہے مدنی ہیں لیکن اگر یہ آیت مکی ہے تو اس صورت میں قرابتداروں کا ان کا حق دے دو سے مراد ہر قسم کا احسان ہے نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رسالتماب ﷺ نے فدک حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے حوالے کرتے ہوئے اس آیت کی تلاوت فرمائی ہو۔

مصارف ہشتگانہ میں سے صرف تین مصارف کے ذکر سے ان کی اہمیت کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

وَمَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَا۠ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ وَمَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ ﴿۳۹﴾	۳۹۔ اور جو سود تم لوگوں کے اموال میں افزائش کے لیے دیتے ہو وہ اللہ کے نزدیک افزائش نہیں پاتا اور جو زکوۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دیتے ہو پس ایسے لوگ ہی (اپنا مال) دوچند کرنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا: اپنے کاروبار میں سہولت اور دولت میں اضافہ کے لیے بااثر لوگوں کو تم جو تحائف پیش کرتے ہو ان سے سرمائے میں اضافہ نہیں ہوتا۔ سرمائے میں اضافے کی بہتر صورت یہ ہے تم

اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اس سے تمہاری دولت بڑھے گی۔

اگر اس آیت کو مکی تسلیم کیا جائے تو ربا سے مراد یہاں اصطلاحی سود نہیں جو حرام ہے بلکہ ہر قسم کا اضافہ مراد ہے۔ نہ ہی زکوٰۃ سے اصطلاحی زکوٰۃ مراد ہے بلکہ ہر قسم کا صدقہ مراد ہے لیکن اگر ان آیات کو مدنی تسلیم کیا جائے تو سود سے وہی حرام سود مراد ہو سکتا ہے اور زکوٰۃ سے اصطلاحی زکوٰۃ۔

اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ ثُمَّ رَزَقَکُمۡ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ؕ هَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ مَّنۡ یَّفۡعَلُ مِنۡ ذٰلِکُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۴۰﴾ ع

۴۰۔ اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا وہی تمہیں موت دیتا ہے پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا، کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو ان میں سے کوئی کام کر سکے؟ پاک ہے اور بالاتر ہے وہ ذات اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین اللہ کو خالق تسلیم کرتے ہیں، رازق تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اپنے معبودوں میں سے بعض کو رزق کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ اس آیت میں خلق کے ساتھ رزق کا بھی ذکر اس لیے کیا کہ رزق بھی تخلیق مسلسل کا نام ہے۔ لہٰذا رازق، خالق سے جدا نہیں ہو سکتا۔

۲۔ هَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ: کیا تمہارے شریکوں میں کوئی معبود ایسا ہے جو خلق کرے اور موت و حیات اس کے ہاتھ میں ہو۔ جواب نفی میں ہو گا تو معلوم ہوا جو معبود خلق، زندہ کرنے اور مارنے پر قادر نہیں ہے وہ رزق دینے پر بھی قادر نہ ہو گا۔ وہ معبود نہیں ہو سکتا۔

ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ لِیُذِیۡقَهُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ عَمِلُوۡا لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ لوگوں کے اپنے اعمال کے باعث خشکی اور سمندر میں فساد برپا ہو گیا تاکہ انہیں ان کے بعض اعمال کا ذائقہ چکھایا جائے، شاید یہ لوگ باز آ جائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ ظَهَرَ الۡفَسَادُ: خشکی اور سمندر میں فساد پھیل گیا۔ یعنی پورے کرۂ ارض کو فساد نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب خشک سالی آتی ہے تو اس صورت میں سمندری حیات میں بھی خلل پیدا ہو جاتا ہے، خشکی میں قحط

آ جاتا ہے اور زمین آسمانی برکتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔

۲۔ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ: قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ صورت حال لوگوں کے عمل بد کے نتیجے میں پیش آئے گی۔

ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت آج کے انسانوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جن کی بداعمالیوں کی وجہ سے اوزون میں سوراخ ہونے سے کرۂ ارض پر ماحولیاتی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور پورا کرۂ ارض ایک ناقابل تلافی فساد کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔

۳۔ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا: تاکہ لوگوں کو اپنی بداعمالی کی سزا مل جائے اور ان کے ضمیر اور وجدان کو بیدار کیا جائے۔

۴۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ: تاکہ وہ اس جرم سے باز آ جائیں جس سے فساد پھیلتا ہے۔

کہا جاتا ہے آیت کا اشارہ اس قحط کی طرف ہے جس سے مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی وجہ سے دوچار ہو گئے تھے۔

یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے اشارہ ایران و روم کے درمیان جنگ کی طرف ہو۔ اس وقت جنگوں میں سمندری بیڑا بھی استعمال میں لایا جاتا تھا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

حیاۃ دواب البحر بالمطر فاذا کف المطر ظھر الفساد فی البر و البحر و ذلك اذا کثرت الذنوب والمعاصی۔[1]	خشکی اور سمندر میں جانداروں کی زندگی بارش سے وابستہ ہے۔ اگر بارش نہ ہو تو خشکی اور سمندر میں فساد پھیلتا ہے۔ جب انسانوں کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں، بارش بند ہو جاتی ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿۴۲﴾	۴۲۔ کہد یجیے: زمین میں چل پھر کر دیکھ لو گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہوا؟ ان میں سے اکثر مشرک تھے۔

تفسیر آیات

سیر فی الارض کے ذریعے تاریخ اقوام کا بصری و مشاہداتی مطالعہ درس آموز ہوتا ہے۔ گزشتہ تباہ شدہ اقوام کی اکثریت کا تعلق مشرک اقوام سے تھا۔

---

[1] بحار الانوار ۷۰: ۳۴۹

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ الۡقَيِّمِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوۡمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ لہٰذا آپ اپنا رخ محکم دین کی طرف مرکوز رکھیں قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس کے اللہ کی طرف سے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں ہے، اس دن لوگ پھوٹ کا شکار ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ الۡقَيِّمِ: جب مسئلہ نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے تو رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے حکم فرماتا ہے تاکہ دوسرے لوگ یہ سمجھیں کہ جب اپنے حبیب سے اس لہجے میں بات ہو رہی ہے تو اس حکم سے انحراف نہایت سنگین ہو گا۔

حکم یہ فرمایا: اپنی پوری توجہ اس محکم اور مضبوط دین پر مرکوز رکھیں جو شکست ناپذیر ہے۔ جس میں کسی قسم کا خلل نہیں ہے۔ اس میں اس دین کی الی الابد کامیابی کی نوید ہے۔

۲۔ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ: اگر اس دین پر توجہ مرکوز کرنے میں کوتاہی ہوئی اور انحراف آ گیا تو قیامت کے دن اس انحراف کے خوفناک نتائج کو ٹالنے والا کوئی نہ ہو گا۔

۳۔ يَوۡمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوۡنَ: اس دن لوگ پھوٹ کا شکار ہوں گے۔ کچھ جنت اور کچھ جہنم میں جائیں گے یا پھوٹ کا اشارہ ایک دوسرے سے فرار ہونے کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔

يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيۡهِ ۝ [1]

تو جس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا، نیز اپنی ماں اور اپنے باپ سے۔

مَنۡ كَفَرَ فَعَلَيۡهِ كُفۡرُهٗ ۚ وَمَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنۡفُسِهِمۡ يَمۡهَدُوۡنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ جس نے کفر کیا اس کے کفر کا ضرر اسی کے لیے ہے اور جنہوں نے نیک عمل کیا وہ اپنے لیے ہی راہ سدھارتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہاں کفر و ایمان کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ کفر اور عمل صالح کا مقابلہ ہے۔ اس سے یہ بات نہایت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان عمل صالح سے عبارت ہے۔

---

[1] ۸۰ عبس: ۳۴۔ ۳۵

سورہ بقرہ آیت ۱۴۳ میں قبلہ اول کی طرف پڑھی گئی نمازوں کے درست ہونے کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ ... اور اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا...۔

یہاں نماز کو ایمان کہا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

الایمان عمل کلہ۔[1] ایمان مکمل طور عمل ہی سے عبارت ہے۔

فَلِاَنۡفُسِہِمۡ یَمۡہَدُوۡنَ: عمل صالح کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

عمل صالح اس کے بجا لانے والے سے پہلے جنت پہنچ جائے گا اور اس کے لیے آمادہ کرے گا جس طرح تمہارا خادم تمہارے لیے بستر آمادہ کرتا ہے۔[2]

لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور نیک اعمال انجام دینے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے، بے شک وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

تا کہ اللہ اپنے فضل سے جزا دے۔ یعنی جزا اور ثواب اللہ کے فضل و کرم کی وجہ سے ملتا ہے۔ ورنہ ہم اس کے مملوک اور مخلوق ہیں۔ جو بھی ہم عمل انجام دیں گے اس سے اللہ کی نعمتوں کا حق ادا نہیں ہوتا چہ جائیکہ کسی اجر و ثواب کے مستحق ٹھہریں۔

اہم نکات

۱۔ دین اسلام شکست ناپذیر ابدی دین ہے۔
۲۔ قیامت کے خطرات کو سامنے رکھیں تو انحراف نہیں آئے گا۔
۳۔ ایمان پر عمل صالح کے علاوہ کوئی اور ثبوت نہیں ہے۔
۴۔ اجر و ثواب اللہ کے فضل سے ملتا ہے، صرف ہمارے اعمال سے نہیں۔

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ یُّرۡسِلَ الرِّیَاحَ

۴۶۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہواؤں

---

[1] الکافی ۲: ۳۳ [2] زبدۃ التفاسیر

مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِيُذِيۡقَكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَ لِتَجۡرِيَ الۡفُلۡكُ بِاَمۡرِهٖ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ وَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۴۶﴾	کو بشارت دہندہ بنا کر بھیجتا ہے تاکہ تمہیں اپنی رحمت کا ذائقہ چکھائے اور کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شاید تم شکر کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ: اللہ تعالیٰ کے مدبر کائنات اور معبود برحق ہونے کے دلائل میں سے ایک دلیل ہوائیں ہیں۔ ان ہواؤں سے تمہاری حیات کی تدبیر سے متعلق درج ذیل امور انجام پاتے ہیں:

الف: مُبَشِّرٰتٍ: یہ ہوائیں بشارت دہندہ ہوتی ہیں۔ بادلوں کی تشکیل کرتی ہیں یعنی بادلوں کو گھنا کر دیتی ہیں۔ پھر انہیں خشکی کی طرف چلا دیتی ہیں۔ پھر بارش آجاتی ہے۔

ب: وَّ لِيُذِيۡقَكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ: تعفن کو دور کر دیتی ہیں۔ درختوں کو باردار کرتی ہیں۔ فضا کو معطر کر دیتی ہیں۔ ہواؤں کی وجہ سے ہونے والی بارش سے زندگی کے لیے سامان فراہم ہوتا ہے۔

ج: ہواؤں کی وجہ سے سمندر میں کشتیاں چلتی ہیں۔ ان کشتیوں کے ذریعے ہونے والی تجارت سے تم اپنے لیے معاش فراہم کرتے ہو۔ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ان نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ تم اللہ ہی کو مدبر اور معبود قبول کرو۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوۡمِهِمۡ فَجَآءُوۡهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَانۡتَقَمۡنَا مِنَ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۷﴾	۴۷۔ اور بتحقیق ہم نے آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کو ان کی اپنی قوم کی طرف بھیجا ہے، سو وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے، پھر جنہوں نے جرم کیا ان سے ہم نے بدلہ لیا اور مومنین کی مدد کرنا ہمارے ذمے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ رُسُلًا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی و تقویت کے لیے تاریخ انبیاء کے وہ اوراق سامنے رکھے جا رہے ہیں جو ان کی تحریک سے متعلق ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں:

الف: ہم نے آپ کو آپ کی قوم کی طرف بھیجا ہے تو یہ پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ آپ سلسلہ انبیاء علیہم السلام کے رسول ہیں۔

ب: فَجَآءُوۡہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ: سابقہ انبیاء علیہم السلام بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح اپنی رسالت کے ثبوت کے لیے واضح شواہد لے کر آئے تھے مگر لوگوں نے ان شواہد کو مسترد کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے جو شواہد پیش کیے ہیں انہیں ان لوگوں نے مسترد کر دیا۔

ج: فَانۡتَقَمۡنَا مِنَ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا: ان شواہد کو مسترد کر کے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرنے والے مجرمین سے ہم نے انتقام لیا ہے اس میں یہ نوید ہے کہ اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کے معاصر مجرم لوگوں سے بھی ہم انتقام لیں گے۔

د: وَکَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: ان مجرمین کے درمیان موجود مؤمنین کی چھوٹی سی جماعت کی مدد کرنا ہمارے ذمے ہے۔ قابل توجہ ہے کہ مؤمنین کی نصرت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے ایک حق قرار دیا ہے جو فتح و نصرت کا صرف وعدہ نہیں بلکہ ضمانت ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیۡرُ سَحَابًا فَیَبۡسُطُہٗ فِی السَّمَآءِ کَیۡفَ یَشَآءُ وَ یَجۡعَلُہٗ کِسَفًا فَتَرَی الۡوَدۡقَ یَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِہٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اِذَا ہُمۡ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اللہ ہی ہواؤں کو چلاتا ہے تو وہ بادل کو ابھارتی ہیں پھر اسے جیسے اللہ چاہتا ہے آسمان پر پھیلاتا ہے پھر اسے ٹکڑوں کا انبوہ بنا دیتا ہے پھر آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے بیچ میں سے بارش نکلنے لگتی ہے پھر اس (بارش) کو اپنے بندوں میں سے جس پر وہ چاہتا ہے برسا دیتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَمُبۡلِسِیۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ جب کہ اس بارش کے ان پر برسنے سے پہلے وہ ناامید ہو رہے تھے۔

تشریح کلمات

الودق (و د ق) بعض نے کہا ہے: بارش میں جو غبار سا نظر آتا ہے اسے ودق کہا جاتا ہے اور کبھی اس سے مراد بارش بھی ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ: اللہ تعالیٰ اس حیات کی تدبیری امور کس حکیمانہ انداز میں انجام دیتا

ہے، سب سے پہلے ہواؤں کو روانہ فرماتا ہے۔ یہ ہوائیں سمندر سے اٹھنے والے بخارات کی تشکیل کے لیے درج ذیل امور انجام دیتی ہیں:

الف: فَتُثِيْرُ سَحَابًا: یہ ہوائیں بادلوں کو ابھارتی یعنی بادلوں کی تشکیل کرتی ہیں۔

ب: فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ: پھر اللہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلا دیتا ہے تاکہ کرہ ارض کا ایک وسیع حصہ سیراب ہو جائے۔ جن علاقوں کو سیراب کرنا اللہ کی مشیت میں ہے ان تک یہ بادل پہنچ جائیں۔

ج: وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا: پھر اسے تہ در تہ کر کے انبوہ بنا دیتا ہے چونکہ پتلا بادل بارش نہیں دے سکتا۔

د: فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ: اَلْوَدْقَ بارش کو کہتے ہیں۔ بادلوں کا انبوہ بننے پر اس کے درمیان سے بارش کے قطرے نکلتے ہیں۔

ھ: فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ: جب بارش کے قطروں سے لوگ سیراب ہوتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں چونکہ اس بارش کے پانی میں زمین کی شادابی اور زندگی ہے۔

۲۔ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ: یأس و نومیدی کے بعد برسنے والی بارش سے لوگوں میں زیادہ خوشی کی لہر دوڑتی ہے۔ مِّنْ قَبْلِهٖ کی ضمیر کو ارسال ریاح سے مربوط گردانا جاتا ہے۔ یعنی اگرچہ وہ لوگ بارش برسنے اور ہواؤں کے چلنے سے پہلے ناامیدی کا شکار تھے۔

فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾	۵۰۔ اللہ کی رحمت کے اثرات کا نظارہ کرو کہ وہ زمین کو کس طرح زندہ کر دیتا ہے اس کے مردہ ہونے کے بعد، یقیناً وہی مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ: یہ قرآن کا طرز استدلال ہے جس میں دلیل کے عناصر مشاہدات محسوسات سے لیے جاتے ہیں کیونکہ انسان کے مشاہدے میں یہ بات ہے کہ بارش سے مردہ زمین میں جان آ جاتی ہے بنابراین یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ وہی خالق انسان کو بھی دوبارہ زندہ کرے گا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا — اور تحقیق پہلی پیدائش کو تم جان چکے ہو، پھر تم عبرت

تَذَكَّرُوْنَ ۝ ا حاصل کیوں نہیں کرتے؟

اہم نکات

۱۔ بارش رحمت خدا کے آثار اور معاد پر حجت خدا ہے۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ۝۵۱

۵۱۔اور اگر ہم ایسی ہوا بھیجیں جس سے وہ کھیتی کو زرد ہوتے دیکھ لیں تو وہ اس کے بعد ناشکری کرنے لگتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اگر ان سے یہ نعمت چھن جاتی ہے تو گذشتہ تمام نعمتوں کو بھول جاتے ہیں اور ناشکری کرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے اور ایک کمزور تنکے کی طرح ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ادھر ادھر ہو جاتے ہیں جب کہ مؤمن چٹان کی طرح مضبوط اور نہایت نامساعد حالات میں بھی اللہ کے شاکر رہتا ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝۵۲

۵۲۔ آپ یقیناً مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ ان بہروں کو (اپنی) پکار سنا سکتے ہیں جب کہ وہ پشت پھیرے جا رہے ہوں۔

جو لوگ ہدایت کے اہل نہیں ہیں انہیں آپ بزور ہدایت نہیں دے سکتے۔ اس آیت کی تشریح سورہ نمل آیت ۸۰ میں گزر چکی ہے۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۵۳ ع ۸

۵۳۔اور نہ ہی آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر ہدایت دے سکتے ہیں، آپ صرف انہیں سنا سکتے ہیں جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں اور فرمانبردار ہیں۔

۱۔اس آیت کی تشریح سورہ نمل آیت ۸۱ میں ہو چکی ہے۔

ا ۵۶ واقعہ: ۶۲

قرء حفص بضم الضاد وفتحها فی الثلاثۃ لکن الضم مختارہ ۱۲

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ ضُعۡفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ ضُعۡفٍ قُوَّۃً ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّۃٍ ضُعۡفًا وَّ شَیۡبَۃً ؕ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ ھُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡقَدِیۡرُ ﴿۵۴﴾	۵۴۔اللہ وہ ہے جس نے کمزور حالت سے تمہاری تخلیق (شروع) کی پھر کمزوری کے بعد قوت بخشی پھر قوت کے بعد کمزور اور بوڑھا کر دیا، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ بڑا جاننے والا صاحب قدرت ہے۔

تفسیر آیات

اس بات پر ایک واضح دلیل قائم ہو رہی ہے کہ انسان بذات خود ایک بے بس وجود ہے۔ ایک قوت ہے جو اس کی زندگی کو چلا رہی ہے۔ وہی قوت اس کی مدبر ہے اور اس قوت کا مالک اس کا رب ہے۔

۱۔ اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ ضُعۡفٍ: ایک نہایت کمزور جرثومہ کمزور بوند سے پیدا کیا۔ حالت جنین میں بھی کمزور، شیر خوار بچہ بھی کمزور اور بے بس ہوتا ہے۔

۲۔ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ ضُعۡفٍ: ان کمزور مراحل سے گزارنے کے بعد عالم شباب میں داخل ہو جاتا ہے۔ کچھ طاقت و قوت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس مرحلے میں آ کر یہ نادان اپنے ماضی اور مستقبل سے غافل رہتا ہے۔ حدیث میں ہے:

الشَّبَابُ شُعۡبَۃٌ مِنَ الۡجُنُونِ۔[1]	جوانی جنون کی ایک قسم ہے۔

دوسری حدیث میں ہے:

السکر اربعۃ سکر الشباب سکر المال و سکر النوم و سکر الملک۔[2]	نشہ کی چار حالتیں ہیں: جوانی کا نشہ، مال کا نشہ، نیند کا نشہ اور کرسی کا نشہ۔

۳۔ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّۃٍ ضُعۡفًا وَّ شَیۡبَۃً: عالم شباب کی طاقت کا مزہ چکھانے کے بعد آہستہ آہستہ یہ طاقت و قوت اس سے سلب کی جاتی ہے:

وَ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ لِکَیۡ لَا یَعۡلَمَ بَعۡدَ عِلۡمٍ شَیۡئًا ...[3]	اور تم میں سے کوئی نکمی ترین عمر کو پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے

۴۔ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ: اللہ کبھی کمزور خلق فرماتا ہے۔ کبھی طاقت و قوت عنایت فرماتا ہے۔ وہ خلق کے تمام اسرار و رموز کو بہتر جانتا ہے: وَ ھُوَ الۡعَلِیۡمُ ۔ وہ قدرت رکھتا ہے اپنی مشیت و حکمت کے مطابق جو چاہے خلق کرے: الۡقَدِیۡرُ۔

---

[1] الفقیہ ۴: ۳۷۷ [2] تحف العقول: ۱۲۴ [3] ۱۶ نحل: ۷۰

وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ یُقۡسِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۬ۙ مَا لَبِثُوۡا غَیۡرَ سَاعَۃٍ ؕ کَذٰلِکَ کَانُوۡا یُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَ الۡاِیۡمَانَ لَقَدۡ لَبِثۡتُمۡ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ اِلٰی یَوۡمِ الۡبَعۡثِ ۫ فَہٰذَا یَوۡمُ الۡبَعۡثِ وَ لٰکِنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۵۔ اور جس روز قیامت برپا ہو گی مجرمین قسم کھائیں گے کہ وہ (دنیا میں) گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے، وہ اسی طرح الٹے چلتے رہتے تھے۔

۵۶۔ اور جنہیں علم اور ایمان دیا گیا تھا وہ کہیں گے: نوشتہ خدا کے مطابق یقیناً تم قیامت تک رہے ہو اور یہی قیامت کا دن ہے لیکن تم جانتے نہیں تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ: جب قیامت برپا ہو گی تو انہیں ایسا لگے گا کہ مرنے کے فوراً بعد قیامت برپا ہو گئی ہے۔ وہ قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم مرنے کے بعد صرف گھڑی بھر قبر میں رہے ہیں۔

۲۔ کَذٰلِکَ کَانُوۡا یُؤۡفَکُوۡنَ: یہ لوگ دنیا میں بھی ایسی ہی خلاف واقع اور خلاف حق باتیں کرتے رہے ہیں۔

۳۔ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَ الۡاِیۡمَانَ: جب کہ علم و ایمان سے سرشار لوگ اس مدت کے بارے میں صحیح موقف بیان کریں گے۔ یہاں الۡعِلۡمَ سے مراد برزخ میں توقف کی مدت کا علم ہو سکتا ہے۔ الۡاِیۡمَانَ سے مراد ایمان بہ آخرت ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی عالم برزخ کے بارے میں علم اور آخرت پر ایمان رکھنے والے یہ موقف بیان کریں گے۔

۴۔ لَقَدۡ لَبِثۡتُمۡ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ اِلٰی یَوۡمِ الۡبَعۡثِ: تم نوشتہ خدا میں قیامت تک رہے ہو۔ کتاب اللہ سے مراد اللہ کا وہ فیصلہ ہے جو لوح محفوظ میں درج ہے یا اس کتاب میں درج ہے جہاں سے اہل علم و ایمان کو خبر دی گئی ہے۔

اہل علم و ایمان دنیاوی زندگی کے مراحل سے آگاہ ہوتے ہیں کہ یہ ایک سفر ہے اور منزل ان کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طرح وہ مرنے کے بعد کے مراحل سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔ جب کہ جو لوگ علم و ایمان سے محروم ہیں وہ اس زندگی کے مراحل و منازل سے بے خبر ہوتے ہیں۔

قیامت برپا ہوتے ہی قیامت سے پہلے جو وقت گزرا ہے وہ اسے ایک گھڑی سے زیادہ معلوم نہیں

ہو گا۔

ان آیات سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں حیات برزخی حاصل نہ تھی۔ وہ خیال کریں گے کہ مرنے کے بعد فوراً اٹھائے گئے ہیں۔ جیسا کہ سورہ یٰس میں فرمایا کہ یہ لوگ کہیں گے:

قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ...[1] ہماری خوابگاہوں سے ہمیں کس نے اٹھایا؟

جب کہ اہل علم و ایمان کو حیات برزخی حاصل تھی۔ انہیں اس مدت کا اندازہ ہے جو ان کی موت اور قیامت کے درمیان گزری ہے۔ اس لیے یہ اہل ایمان دوسروں سے کہیں گے: وَ لٰکِنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ لیکن تم جانتے نہیں تھے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مجرموں کو موت اور قیامت کے درمیان فاصلہ صرف ایک گھڑی لگا ہے تو کیا انہیں قبر میں عذاب نہیں ہوتا تھا؟ جواب یہ ہے کہ یہ ان مجرمین کے بارے میں جنہیں قبر کے سوال و عذاب کے بعد حیات برزخی نہیں ملے گی۔ البتہ بہت بڑے مجرموں کو حیات برزخی ملے گی اور تا قیام قیامت وہ عذاب میں ہوں گے۔

فَیَوۡمَئِذٍ لَّا یَنۡفَعُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مَعۡذِرَتُہُمۡ وَ لَا ہُمۡ یُسۡتَعۡتَبُوۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ پس اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کوئی فائدہ نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا۔

تفسیر آیات

قیامت کا دن حساب اور سزا کا دن ہے۔ توبہ و عمل کا دن گزر گیا۔ قیامت کے دن اللہ کو راضی کرنے کے لیے نہیں کہا جائے گا چونکہ جوابدہی کے موقع پر حساب دینا ہوتا ہے، راضی کرنے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

وَ لَا یُؤۡذَنُ لَہُمۡ فَیَعۡتَذِرُوۡنَ ○ [2] اور انہیں اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کریں۔

اگرچہ انہیں معذرت کرنے تک کی اجازت نہیں دی جائے گی چونکہ معذرت کا کوئی نتیجہ نہیں ہے کہ اجازت دی جائے۔

---

[1] ۳۶ یٰس: ۵۲ [2] ۷۷ مرسلات: ۳۶

وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنۡ جِئۡتَہُمۡ بِاٰیَۃٍ لَّیَقُوۡلَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُبۡطِلُوۡنَ﴿۵۸﴾

۵۸۔اور بتحقیق ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال بیان کی ہے اور اگر آپ ان کے سامنے کوئی نشانی پیش کر بھی دیں تو کفار ضرور کہیں گے: تم تو صرف باطل پر ہو۔

کَذٰلِکَ یَطۡبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ﴿۵۹﴾

۵۹۔ اس طرح اللہ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ: قرآن کتاب ہدایت ہے اور مثال، حقائق سمجھانے کے لیے مؤثر ترین طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حقائق سمجھانے کے لیے خطاب کے تمام اسلوب اختیار کیے اور دلوں اور عقلوں کی بیدار کے لیے ہر وسیلہ اختیار کیا ہے۔ ایسا اسلوب سخن اختیار کیا ہے جو ہر عقل اور ہر قلب ہر ماحول ہر طبقہ کے لیے قابل فہم ہے۔ اگر کوئی مطلب مادی ذہنوں سے دور ہے، اسے محسوسات کی مثال میں پیش فرمایا۔ اگر کوئی مطلب ملکوتی ہے اسے مشاہداتی دنیا میں لا کر پیش فرمایا۔ حتیٰ کہ سطحی ذہنوں کے لیے سطحی مثال پیش فرمائی۔ صاحبان عقل و خرد کے لیے ان کی سطح کی مثال پیش فرمائی۔ ہر طبقہ کے لیے اس کی فکری سطح کے مطابق مثال پیش فرمائی۔ یہاں تک کہ بعض دشمنان اسلام نے تو ان مثالوں کے سطحی ہونے پر اعتراض بھی کیا: مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ...۔[۱] مچھر کی مثال سے اللہ کا کیا مقصد ہے۔

۲۔ وَلَئِنۡ جِئۡتَہُمۡ بِاٰیَۃٍ: اگر آپ کوئی معجزہ پیش کرتے بھی ہیں تو یہ لوگ اس پر ایمان لانے کی جگہ اس معجزہ کو باطل کی کرشمہ سازی قرار دیتے ہیں۔ کبھی کذاب، کبھی ساحر، کبھی مجنون قرار دیتے ہیں۔

۳۔ کَذٰلِکَ یَطۡبَعُ اللّٰہُ: جو لوگ قرآنی امثال و آیات پر ایمان نہیں لاتے اور معجزات کو بھی باطل قرار دیتے ہیں، ایسے لاعلم، جاہل، ناقابل علاج لوگوں کو اللہ اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ جب اللہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے تو ہدایت کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں اور دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّلَا یَسۡتَخِفَّنَّکَ الَّذِیۡنَ لَا یُوۡقِنُوۡنَ﴿۶۰﴾ ع

۶۰۔ پس (اے نبی) آپ صبر کریں، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور جو لوگ یقین نہیں رکھتے وہ آپ کو سبک نہ پائیں۔

---

[۱] ۲ بقرۃ: ۲۶

تفسیر آیات

۱۔ فَاصۡبِرۡ: مشرکین کی طرف سے استعمال ہونے والے حربوں کے مقابلے میں صبر و استقامت جیسی الٰہی طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں۔

۲۔ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ: اس صبر کے پیچھے آپ کے لیے پشت پناہ اللہ کا وعدہ برحق ہے کہ آخر فتح و کامرانی آپ کی ہو گی۔ چنانچہ اسی سورہ کی آیت ۴۷ میں فرمایا:

وَکَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○ اور مومنین کی مدد کرنا ہمارے ذمے ہے۔

۳۔ وَّلَا یَسۡتَخِفَّنَّکَ الَّذِیۡنَ لَا یُوۡقِنُوۡنَ: آپ کو دشمن ایسا سبک نہ پائیں کہ آپ ان کی دھمکیوں، طعنوں اور تمسخروں سے بلاحوصلہ ہو جائیں بلکہ دشمن کی تمام تر سازشوں کے مقابلے آپ کے عزم و ارادے میں مزید مضبوطی آنی چاہیے۔ واضح رہے کہ یہ کوئی حکم تشریعی نہیں ہے بلکہ یہ امر تکوینی ہے جو حتماً وقوع پذیر ہو گا۔

سُورَةُ لُقْمَانْ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ المبارکۃ کا نام سورۃ لقمان ہے چونکہ اس میں لقمان کی حکمت کا ذکر ہے۔

بعض کے مطابق یہ سورۃ بعثت کے تیسرے سال نازل ہوا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا برملا اعلان فرمایا ہے۔

یہ سورۃ حجازیوں کے نزدیک ۳۳ آیات پر مشتمل ہے اور کوفی قرائت کے مطابق ۳۴ آیات ہیں۔ یہ قرائت علوی ہونے کی وجہ سے مستند ترین قرائت ہے۔

مضامین: اس سورۃ المبارکہ میں بعض اہم مباحث مذکور ہیں:

۱۔ لھو الحدیث کے عنوان سے حق کے مقابلے میں داستان سرائی اور غنا جیسی عظیم معصیت سے پرہیز کرنے کا حکم ہے۔

۲۔ لقمان کے نصائح میں چند ایک آداب وسلوک کی باتوں کا ذکر ہے۔ خصوصاً اونچی آواز میں بات کرنے کی ممانعت کا ذکر ہے۔

۳۔ اللہ کی ربوبیت اور مدبریت کے اثبات میں چند ایک دلائل کا ذکر ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمٰن رحیم
الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾	۱۔ الف، لام، میم۔
تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ۙ﴿۲﴾	۲۔ یہ حکمت بھری کتاب کی آیات ہیں۔
ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّلۡمُحۡسِنِیۡنَ ۙ﴿۳﴾	۳۔ نیکوکاروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تِلۡکَ اٰیٰتُ: تِلۡکَ اس کتاب کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ وہ کتاب ہے جو حکمت بھری

ہے۔ حکمۃ کی تشریح پہلے بھی ہو گئی ہے کہ واقع بینی کو کہتے ہیں۔ حکیم وہ ہے جو واقع اور حقائق کی نشاندہی کرے۔ آیت کا مطلب یہ بنتا ہے: یہ حقائق تک رسائی دینے والی کتاب کی آیات ہیں۔

۲۔ هُدًى وَّرَحْمَةً: جب یہ کتاب انسان کو حقائق تک رسائی دیتی ہے تو یہی ہدایت ہے۔ ہدایت یعنی حق کی طرف جانے والا راستہ دکھانا۔ جب یہ دونوں کام ہو گئے تو رحمت الٰہی شامل حال ہونا قدرتی بات ہے۔

۳۔ لِّلْمُحْسِنِيْنَ: اگرچہ یہ کتاب تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے ہے تاہم اس سے ہدایت لینے والوں کے ساتھ عملاً مختص ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کبھی فرمایا: یہ تقویٰ والوں کی ہدایت کے لیے ہے۔ کبھی فرمایا: یہ ایمان والوں کی ہدایت کے لیے ہے۔ اس ہدایت کے لیے آمادگی صرف نیکی کرنے والوں میں پائی جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ نیکی کرنے والے ہی ہدایت و رحمت کے اہل ہوتے ہیں: هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴

۴۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور وہی تو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

۵۔ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

تفسیر آیات

المحسنین نیکی کرنے والوں کی تفصیل کا بیان ہے۔ اسے اجمال میں نہیں رکھا کہ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ دین سے صرف نسبت قائم ہونے سے نیکی کرنے والا بن جاتا ہے۔ فرمایا: نیکی کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو عملاً اللہ کی بندگی کریں۔ نماز بندے کا اللہ کے ساتھ رابطۂ بندگی کا نام ہے۔ یہ نہ ہو تو کوئی رابطہ نہیں رہتا اور زکوۃ بندگان خدا کے ساتھ رابطے کا نام ہے جو اللہ کی بندگی کا ایک اہم تقاضا ہے کہ آخرت پر ایمان۔ انسان کا اپنی زندگی پر ایمان ہے کہ یہ بے مقصد اور عبث نہیں ہے بلکہ ایک ابدی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ: ان مذکورہ اوصاف کے حامل لوگ ہی ہدایت پر ہیں اور اپنی زندگی میں کامیاب ہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ٭ۖ وَّ یَتَّخِذَہَا ہُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴿۶﴾

۶۔ اور انسانوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو بیہودہ کلام خریدتے ہیں تاکہ نادانی میں (لوگوں کو) راہ خدا سے گمراہ کریں اور اس (راہ) کا مذاق اڑائیں، ایسے لوگوں کے لیے ذلت میں ڈالنے والا عذاب ہوگا۔

شان نزول: اس آیت کے شان نزول میں روایت ہے:

نضر بن حارث تاجر تھا۔ فارس (ایران) کے علاقوں میں سفر کرتا تھا۔ وہاں کی داستانوں پر مشتمل کتاب خرید کر لاتا، انہیں قریش والوں کو سنایا کرتا اور کہتا تھا: محمد تمہیں عاد و ثمود کی داستانیں سناتا ہے اور میں تمہیں رستم و اسفندیار اور بادشاہوں کی داستانیں سناتا ہوں۔ چنانچہ لوگ قرآن کی جگہ یہ داستانیں سنا کرتے تھے۔[1]

تفسیر آیات

۱۔ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ: لہو ان بیہودہ باتوں کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنی ضرورت کی باتوں سے باز رکھے (المفردات)۔ الۡحَدِیۡثِ: خبر، حکایت، کلام کو کہتے ہیں۔ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ یعنی بیہودہ باتیں۔

اس آیت میں ان لوگوں کو ذلت آمیز عذاب کی خبر دی گئی جو بیہودہ باتوں کو خرید لاتے ہیں۔

یَّشۡتَرِیۡ خریدنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ یا تو مال دے کر لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ خریدتے ہیں، خرافات پر مشتمل داستانیں خرید لاتے ہیں یا گلوکاروں کو معاوضہ دے کر لہویات پر مشتمل محافل جماتے ہیں یا کوئی ایسا عمل انجام دیا جاتا ہے جس سے وہ ان بیہودہ گویوں کو بلاتے ہیں۔

لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ کا ایک مصداق وہ داستانیں ہیں جن سے کلام اللہ سننے سے لوگوں کو باز رکھتے ہیں۔

لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ کا دوسرا اہم مصداق غنا ہے۔

غنا کی تعریف: الصوت المرجع فیه علی سبیل اللهو و الباطل۔ وہ اتار چڑھاؤ والی آواز جو لہو اور باطل کے طور پر نکالی جاتی ہے۔ دوسری تعریف یہ کی گئی ہے: وہ آواز جو اہل لہو و لعب کے ہاں معمول ہے۔ جیسے فلمی گانے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلْغِنَاءُ مِمَّا وَعَدَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَیْہِ النَّارَ وَ تَلَا ھٰذِہِ الْآیۃَ ....[2]

غنا وہ ہے جس پر اللہ نے جہنم کی سزا رکھی ہے۔ پھر امام علیہ السلام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

---

[1] مجمع البیان [2] الکافی ۶: ۴۳۱

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت کے ذیل میں فرمایا: غنا بھی لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ میں شامل ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے بھی یہی مروی ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے فرمایا:

اَلْغِنَاءُ عُشُّ النِّفَاقِ۔[1]　　　غنا نفاق کی آماجگاہ ہے۔

۲۔ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: ان بیہودہ باتوں کو خریدنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو راہ خدا سے منحرف کر کے گمراہ کیا جائے۔ یہاں سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سَبِیۡلِ اللّٰہِ سے مراد قرآن ہے۔ بیہودہ گوئی رائج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن سے دور کیا جائے۔

۳۔ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ: گمراہ کرنے والوں کا کسی علم کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا بلکہ گمراہی اور جہالت باہم مترادف ہیں۔

۴۔ وَّ یَتَّخِذَہَا ہُزُوًا: بیہودہ باتوں کا دوسرا مقصد راہ خدا سے تمسخر کرنا ہے کہ وہ بیہودہ باتیں سنا کر آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وَّ یَتَّخِذَہَا میں ضمیر سبیل کی طرف ہے۔سبیل مؤنث مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (التبیان)

اہم نکات

۱۔　جو بات بھی قرآن کے مقابلے میں آئے وہ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ ہے۔

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی مُسۡتَکۡبِرًا کَاَنۡ لَّمۡ یَسۡمَعۡہَا کَاَنَّ فِیۡۤ اُذُنَیۡہِ وَقۡرًا ۚ فَبَشِّرۡہُ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۷

۷۔ اور جب اسے ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ تکبر کے ساتھ اس طرح منہ موڑ لیتا ہے جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو، گویا اس کے دونوں کان بہرے ہیں، پس اسے دردناک عذاب کی بشارت دے دیں۔

تفسیر آیات

۱۔جو لوگ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ یعنی غنا جیسے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں انہیں اگر اللہ کی آیات پڑھ کر سنائی جائیں تو وہ بڑی نخوت و تکبر کے ساتھ منہ موڑ لیتے ہیں۔ (صدق اللّٰہ)

۲۔ کَاَنۡ لَّمۡ یَسۡمَعۡہَا: ایسی بے اعتنائی اختیار کرتے ہیں کہ جیسے کسی کلام کو سنا ہی نہیں ہے۔گویا اس کے پاس قوت سماعت ہے ہی نہیں۔

---

[1] حوالہ سابق

۳۔ فَبَشِّرۡہُ : اس کو دردناک عذاب کی بشارت دو۔ عذاب اور بشارت!! اللہ تعالیٰ اس شخص کے ساتھ تمسخرانہ لہجے میں بات کرتا ہے۔ اسے دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔

اہم نکات

۱۔ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ یعنی غنا پر جہنم کی سزا ہے۔

۲۔ آیات قرآنی کو ناپسند کرنا دردناک عذاب کو دعوت دینا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ جَنّٰتُ النَّعِیۡمِ ۙ﴿۸﴾ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقًّا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۹﴾

۸۔ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک اعمال انجام دیں ان کے لیے نعمت والے باغات ہوں گے،
۹۔ جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور وہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ بیہودہ گو لوگوں کے مقابلے میں اہل ایمان ہیں جو عمل صالح سے اپنے ایمان کا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے لیے جنت کی نعمتوں کی فراوانی ہے۔ یہ فراوانی ابدی ہو گی۔

۲۔ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقًّا: یہ اللہ کا وہ وعدہ برحق ہے جس کی کسی عذر کی وجہ سے خلاف ورزی نہیں ہو سکتی چونکہ وعدہ کرنے والا عزیز ہے، بالا دست، غالب آنے والا ہے۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر وعدہ نہیں فرمایا۔ وہ حکیم ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا وَ اَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ؕ وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر پیدا کیا جو تمہیں نظر آئیں اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈگمگا نہ جائے اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس (زمین) میں ہر قسم کے نفیس جوڑے اگائے۔

تشریح کلمات

تَمِیۡدَ بِکُمۡ : (م ی د) زمین کی طرح کسی بڑی چیز کا مضطر ہونا۔

بَثَّ : (ب ث ث) کے معنی کسی چیز کو متفرق اور پراگندہ کرنا کے ہیں۔

کَرِیۡمٍ : (ك ر م) الکریم ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ہم نوع چیزوں میں سب سے زیادہ قابل ستائش ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا : آیت کے اس جملے کی تشریح کے لیے سورہ طٰہ آیت ۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ وَ اَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ : آیت کے اس جملے کی تشریح کے یے ملاحظہ فرمائیں سورہ نحل آیت ۱۵ اور سورۃ الانبیاء آیت ۳۱، سورہ نباء آیت ۷۔

۳۔ وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ : اس جملے کی تشریح کے لیے سورہ بقرہ آیت ۱۶۴ ملاحظہ کریں۔

۴۔ فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ : زوج کریم یعنی نفیس جوڑے۔ اس سلسلے میں اب تک جو حقیقت سامنے آئی ہے وہ یہ ہے: ہر نبات نر و مادہ خلیوں پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں یا تو کبھی ایک پھول میں ہوتے ہیں اور کبھی ایک میں نر دوسرے میں مادہ۔ کبھی ایک شاخ میں نر دوسری شاخ میں مادہ۔ کبھی ایک درخت میں نر دوسرے درخت میں مادہ ہوتے ہیں۔ جب تک کسی ذریعے سے ان دونوں میں ملاپ نہ ہو وہ درخت پھل نہیں دیتا۔

ہٰذَا خَلۡقُ اللّٰہِ فَاَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۱﴾ ع

۱۱۔ یہ ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ اللہ کے سوا دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے بلکہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ ہٰذَا خَلۡقُ اللّٰہِ : آسمانوں کو نامرئی ستونوں پر قائم اور پہاڑوں کے ذریعے زمین کو ڈولنے سے محفوظ رکھنا، زمین کو ہر قسم کے جانداروں کے لیے قابل سکونت بنانا، بارش کے ذریعے اس زمین کو زمین والوں کے لیے سرسبز بنا دینا، یہ سب اللہ کی تخلیق و تدبیر ہے۔

۲۔ فَاَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ : اللہ کے علاوہ اپنے معبودوں کے تخلیقی و تدبیری کارنامے

دکھاؤ۔ ان تخلیقی امور میں ان معبودوں کا کوئی دخل ہے کہ اللہ کے شریک ہو جائیں؟ یا ان کے تخلیقی کارنامے الگ ہیں؟ جب سب مانتے ہیں کہ پیدا تو صرف اللہ کرتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ پھر تدبیر بھی صرف اللہ کرتا ہے کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ خلق کوئی کرے، تدبیر کوئی اور کرے۔ جب خلق و تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے تو دوسروں کے پاس کیا لینے جاتے ہو؟

اہم نکات

۱۔ کائناتی تخلیق کی کیفیت میں تدبیر پنہاں ہے۔ لہٰذا خلق و تدبیر قابل تفریق نہیں ہیں۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِکۡمَۃَ اَنِ اشۡکُرۡ لِلّٰہِ ؕ وَ مَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور بتحقیق ہم نے لقمان کو حکمت سے نوازا کہ اللہ کا شکر کریں اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے (فائدے کے) لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ یقیناً بے نیاز، لائق ستائش ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لقمان کے بارے میں اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک عبد صالح اور حکیم تھے۔ بعض روایات کے مطابق حبشی اور سیاہ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض کے نزدیک ان کا تعلق مصر سے تھا اور بعض کہتے ہیں ان کا تعلق قوم عاد سے تھا جو حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ بچ نکلنے والوں میں شامل تھے۔ عرب لوگ لقمان کی حکمت کے معترف تھے اس لیے انہیں بتایا جا رہا ہے کہ توحید کا عقیدہ کوئی نئی فکر نہیں بلکہ قدیم ایام سے لقمان حکیم بھی توحید کے عقیدے کے داعی تھے۔

۲۔ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِکۡمَۃَ: ہم نے لقمان کو حکمت سے نوازا۔ حقائق کے ادراک کی سمجھ دی جس کی وجہ سے وہ لوگوں سے علم و حکمت کی باتیں بیان کرتے تھے۔

۳۔ اَنِ اشۡکُرۡ لِلّٰہِ: یہ بات ان کو سمجھا دی کہ اللہ کا شکر ادا کرو۔ شکر خدا حکمت کے مصادیق میں سب سے پہلا مصداق ہے۔ دنیائے حقیقت میں سب سے اہم حقیقت ہے۔ نعمت اور نعمت دہندہ کی قدر دانی کرنا بہت بلند اقدار کا مالک ہونے کی علامت ہے۔ اسی لیے مقام شکر پر کما حقہ فائز ہونے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ ﴿۰﴾ [1] میرے بندوں میں شکر کرنے والے کم ہیں۔

---

[1] ۳۴ سبا: ۱۳

۴۔ وَ مَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ: شکر گزاری ایک نعمت، ایک درجہ ہے۔ ایک اہم مقام ہے جس پر فائز ہونے والا خود خوش قسمت ہے۔ اس شکر گزاری کا اللہ کو کوئی فائدہ نہیں ملتا۔ خدا کسی بندے کی شکر گزاری کا محتاج نہیں ہے۔

۵۔ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ: جو لوگ اللہ کی نعمتوں کی قدر دانی نہیں کرتے وہ خود کو انسان اور عبد ہونے کے مقام اور پھر قدر دانی کی قدروں سے محروم کرتے ہیں۔ اللہ کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔

وَ اِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِہٖ وَ ہُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰہِ ؕؔ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے بیٹا! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِہٖ: واقع بین حکیم لقمان اپنی حکمت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی حکمت کا آغاز اپنے فرزند کی تربیت و تعلیم سے کرتے ہیں۔ اس سے ہم بجا طور پر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ والدین پر سب سے پہلی ذمے داری اولاد کی تربیت ہے۔

۲۔ یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰہِ: اس تربیت میں سب سے پہلی بات توحید ہے۔ چنانچہ حکمت کا تقاضا بھی توحید اور نفی شرک ہے۔

۳۔ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ: شرک کا مرتکب اپنے آپ کو اللہ کی بندگی کے دائرے سے خارج کرتا اور ایک ناچیز کو رب العالمین کے مقابلے لاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا زیادتی ہو سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ شرک باللہ عظیم ظلم ہے۔

وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ ۚ حَمَلَتۡہُ اُمُّہٗ وَہۡنًا عَلٰی وَہۡنٍ وَّ فِصٰلُہٗ فِیۡ عَامَیۡنِ اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیۡکَ ؕ اِلَیَّ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں نصیحت کی، اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری سہ کر اسے (پیٹ میں) اٹھایا اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال ہے (نصیحت یہ کہ) میرا شکر بجا لاؤ اور اپنے والدین کا بھی (شکر ادا کرو آخر میں) بازگشت میری طرف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ: یہ آیت کلام لقمان کے درمیان شکر خدا کی مناسبت سے ذکر کی گئی ہے۔ فرمایا: ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں نصیحت کی ہے۔ قرآن مجید میں والدین کے بارے میں مکرر تاکید کی گئی ہے جب کہ والدین کو اولاد پر احسان کرنے کی کوئی تاکید نہیں ہے کیونکہ یہ بات والدین کی فطرت میں ودیعت ہے کہ والدین اولاد کو جان سے عزیز رکھتے ہیں جب کہ والدین چونکہ جانے والی نسل ہیں ان پر احسان کے حکم کی ضرورت ہے۔ حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ اس جانے والی نسل کی ضمانت فطرت میں نہیں رکھی۔ چونکہ ان سے عموماً جدائی برداشت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے اس جدائی کو آسان کر دیا۔ اولاد کی طرح فطرت میں ودیعت نہیں فرمایا بلکہ نصیحت کی اور اس تاکید کے ساتھ نصیحت کی کہ خود اللہ کے بعد سب سے پہلے درجے پر والدین کو رکھا۔

۲۔ حَمَلَتۡہُ اُمُّہٗ: یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ ماں کو زیادہ خصوصیت کے ساتھ اہمیت دینے کے لیے اولاد کو یاد دلاتا ہے کہ ماں نے تمہیں اپنے شکم میں ناتوانی کے ساتھ اٹھائے رکھا۔ پھر دو سال تک تمہیں دودھ پلایا۔ پس والدہ کے اس احسان کو فراموش نہ کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ماں کا حق باپ کی نسبت زیادہ ہے۔

مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

مَنۡ اَبَرُّ قَالَ اُمَّکَ. قَالَ: ثُمَّ مَنۡ؟ قَالَ: اُمَّکَ. قَالَ: ثُمَّ مَنۡ؟ قَالَ: اُمَّکَ. قَالَ: ثُمَّ مَنۡ؟ قَالَ: اَبَاکَ.[۱]	میں کس پر احسان کروں۔ فرمایا: اپنی ماں پر کہا: پھر کس پر؟ فرمایا: اپنی ماں پر کہا: پھر کس پر؟ فرمایا اپنی ماں پر۔ کہا: پھر کس پر؟ فرمایا: اپنے باپ پر۔

۳۔ اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیۡکَ: وہ نصیحت یہ ہے کہ پہلے میرا شکر کرو۔ اس کے بعد اپنے والدین کا شکر کرو۔ والدین کے حقوق کی اہمیت پر تاکید اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے خود خالق و رازق اللہ تعالیٰ کے بعد والدین کی شکر گزاری کو درجہ دیا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور رازقیت کا فیض والدین کے ذریعہ پہنچا ہے۔ اس طرح یہ دونوں فیض الٰہی کا ذریعہ بنے ہیں۔

۴۔ اِلَیَّ الۡمَصِیۡرُ: اگر کوتاہی ہوئی تو میری بارگاہ میں حاضر ہو کر جواب دینا ہے۔ اس جملے میں ایک تنبیہ ہے کہ والدین کے حقوق کے بارے میں سوال ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ شکر گزاری ایک حکیمانہ کردار ہے۔

۲۔ اللہ کے بعد والدین کی شکر گزاری واجب گردانا اللہ کی رحمت ہے۔

---

[۱] الکافی ۲: ۱۵۹

وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤی اَنۡ تُشۡرِكَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَ صَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا ۫ وَّ اتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔اور اگر وہ دونوں تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک قرار دے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی بات نہ ماننا، البتہ دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھنا اور اس کی راہ کی پیروی کرنا جس نے میری طرف رجوع کیا ہے، پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہے، پھر میں تمہیں بتادوں گا کہ تم کیا عمل کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔اگر یہ دونوں تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک بنائے تو اللہ پر ان کو مقدم نہ کرنا۔ اگرچہ والدین اپنے عقیدے کے مطابق اپنے فرزند پر مہربانی کر کے یہ دباؤ ڈال رہے ہوں گے لیکن والدین کا موقف مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ کسی علم، کسی سند کی بنا پر نہیں ہے چونکہ شرک باللہ ایک امر عدمی اور موہوم تصور ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لہٰذا اس جہالت کو اعتنا میں نہ لاتے ہوئے والدین کی اس جاہلانہ خواہش کو پورا نہیں کرنا ہے۔

۲۔ وَ صَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا: البتہ ان مشرک والدین کے ساتھ دنیوی زندگی کے معاملات میں اچھا برتاؤ کرو۔ مذہبی پہلو میں ان کی خواہش پوری نہ کرسکو تو انسانی پہلو میں فرق نہ آنے دینا۔ ان کے نظریے سے بیزاری کرو مگر ان کی ذات سے الفت و محبت برقرار رکھو۔

والدین خواہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں، اسلام کے نزدیک احترام آدمیت اور مقام انسانیت میں پھر بھی اہمیت کے حامل ہیں۔عقیدے سے ہٹ کر عام انسان خصوصاً والدین کا ایک انسانی مقام ہے۔

۳۔ وَّ اتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ: اتباع ہمیشہ اس شخص کی ہو گی جو اللہ کی طرف متوجہ ہو، جس کا رخ اللہ کی طرف ہو۔

اہم نکات

۱۔ مشرک والدین کے بھی انسانی و اخلاقی حقوق ہوتے ہیں۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنۡ تَكُ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَكُنۡ فِیۡ صَخۡرَةٍ اَوۡ

۱۶۔اے میرے بیٹے! اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی (اچھی یا بری) چیز کسی پتھر کے اندر یا

فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِہَا اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۶﴾

آسمانوں میں یا زمین میں ہو تو اللہ اسے یقیناً نکال لائے گا یقیناً اللہ بڑا باریک بین، خوب باخبر ہے۔

تشریح کلمات

خَرۡدَلٍ: (خ ر د ل) رائی کا دانہ۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰبُنَیَّ اِنَّہَاۤ اِنۡ تَکُ مِثۡقَالَ حَبَّۃٍ: اے میرے بیٹے! اِنَّہَاۤ انسان کے اعمال خیر ہوں یا شر۔ وہ رائی کے دانے کے برابر تیری نظر میں حقیر اور ناچیز ہوں،

۲۔ فَتَکُنۡ فِیۡ صَخۡرَۃٍ: پھر وہ ناچیز کسی چٹان کے اندر پوشیدہ ہوں یا آسمانوں کے کسی کنارے میں چھپے ہوئے ہوں یا زمین کی تہوں میں پوشیدہ ہوں،

۳۔ یَاۡتِ بِہَا اللّٰہُ: اللہ انہیں نکال لائے گا۔ قیامت کے دن ان اعمال کو پیش کیا جائے گا اور تجھے ان کا حساب دینا ہوگا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اتقو المحقرات من الذنوب فان لها طالبا لا يقولن احدكم اذنب واستغفر اللّٰه تعالىٰ ان اللّٰه تعالىٰ يقول: اِنۡ تَکُ مِثۡقَالَ حَبَّۃٍ ....[1]

حقیر گناہوں سے پرہیز کرو چونکہ ان کا بھی کوئی طلبگار موجود ہے۔ تم یہ نہ کہو: گناہ کرتا ہوں تو اللہ سے مغفرت چاہوں گا۔ کیونکہ اللہ فرماتا ہے: اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہو تو اللہ اسے نکال لائے گا۔

اہم نکات

۱۔ گناہ کو چھوٹا سمجھنا گناہ کبیرہ ہے۔

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَ اۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ انۡہَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ اصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو اور نیکی کا حکم دو اور بدی سے منع کرو اور جو مصیبت تجھے پیش آئے اس پر صبر کرو، یہ معاملات میں عزم راسخ (کی علامت) ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۷: ۲۰

تفسیر آیات

۱۔ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ: حضرت لقمان انسانی بندگی اور سعادت سے مربوط اہم ترین امور کی نصیحت کر رہے ہیں۔ ان میں نماز کو ہر دور، ہر قوم اور ہر فرد کے لیے بنیادی کردار حاصل ہے اور انسانی شخصیت کی تعمیر میں بھی نماز کی متبادل کوئی چیز نہیں ہے۔

۲۔ وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ: نیکی کو رواج دینے اور برائی کو دور کرنے میں کردار ادا کرنے سے معاشرہ پاک ہو جاتا ہے جس کی ہر معاشرے کو ضرورت ہے۔

۳۔ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ: حالات ہمیشہ انسان کے حق میں نہیں ہوا کرتے۔ نامساعد حالات میں صبر سے کام لینے والے مضبوط شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور صبر انسان کو شکست ناپذیر بناتا ہے۔ روایت کے مطابق اس جگہ صبر کا اشارہ امر بمعروف نہی از منکر کی راہ میں پیش آنے والی مشقت اور اذیت میں صبر سے کام لینے کی طرف ہے۔

۴۔ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ: مشقت اور اذیت کے موقع پر صبر سے کام لینا مضبوط ارادے کا مالک ہونے کی علامت ہے:

وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ○[1]

اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ معاملات میں عزم راسخ (کی علامت) ہے۔

عزم، نفس کی ایک طاقت و جرأت کا نام ہے۔ جس میں یہ طاقت موجود ہو، اس کے ارادے میں تزلزل نہیں آتا۔

اہم نکات

۱۔ صبر، عزم راسخ اور امر بمعروف و نہی از منکر ہر امت کی ضرورت ہے۔

۲۔ صبر، عزم راسخ اور مضبوط شخصیت کی علامت ہے۔

وَلَا تُصَعِّرۡ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ ۚ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور لوگوں سے (غرور و تکبر سے) رخ نہ پھیرا کرو اور زمین پر اکڑ کر نہ چلا کرو، اللہ کسی اترانے والے خود پسند کو یقیناً دوست نہیں رکھتا۔

تشریح کلمات

تُصَعِّرۡ: (ص ع ر) تصعیر کے معنی ہیں تکبر کی وجہ سے گردن کو ٹیڑھا کرنا۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۸۶

مَرَحًا : (م ر ح) اس کے معنی ہیں بہت زیادہ اور شدت کی خوشی، جس میں انسان اترانے لگ جائے۔
مُخْتَالٍ : (خ ت ل) خود پسندی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ : غرور تکبر سے لوگوں سے اپنا رخ نہ پھیرا کرو۔ چنانچہ کوئی اگر کسی کے ساتھ برادری و برابری کی بنیاد پر بات کرتا ہے تو اس کی طرف متوجہ، روبرو ہو کر، اپنے مخاطب پر نگاہ مرکوز کر کے بات کرتا ہے لیکن متکبر شخص اگر کسی سے بات کرتا ہے یا اس کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو چہرہ دوسری طرف کر دیتا ہے۔

۲۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا : اور زمین پر اکڑ کر نہ چلا کرو۔ انسان کی چال اس کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔ ہر قدم اس کی نفسیات کے مطالعہ کے ایک ورق کی حیثیت رکھتا ہے۔

تکبر و نخوت اور زمین پر اکڑ کر چلنا نفسیاتی بیماری کی علامت ہے۔ جس شخص کی شخصیت میں خلا ہو وہ اسے تکبر کے ذریعے پر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ : اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو مُخْتَالٍ ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرتا ہے۔ خود بین ہے اور ساتھ اس خیال اور واہمے کا فخر و مباہات کے ذریعے اظہار بھی کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ خود بینی اور تکبر شخصیت میں خلا ہونے کی علامت ہے۔

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۱۹ ع	۱۹۔ اور اپنی چال میں اعتدال رکھو اور اپنی آواز نیچی رکھ، یقیناً آوازوں میں سب سے بری گدھے کی آواز ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ : چال میں اعتدال مطلوب ہے۔ نہ اکڑ کر چلو، نہ ہی ایسی حقیرانہ چال چلو جو وقار کے خلاف ہو:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا ...[1]	اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر (فروتنی سے) دبے پاؤں چلتے ہیں۔

---
[1] ۲۵ فرقان: ۶۳

چال میں اعتدال کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی چال کو اس قدر حقیرانہ بھی نہ رکھے کہ اس سے اپنا وقار مجروح کرے۔ عزت نفس کا حفظ بھی واجب ہے اور نہ تکبرانہ چال چلے کہ دوسروں کو حقیر سمجھے۔ اعتدال یہ ہے کہ نہ اپنے آپ کو حقیر دکھائے، نہ دوسروں کو حقیر سمجھے۔

حدیث میں آیا ہے۔

سرعۃالمشی تذھب بھاء المؤمن.[۱] تیز چلنے سے مؤمن کا وقار چلا جاتا ہے۔

۲۔ وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِکَ: اور آواز کو دھیمی رکھنا بھی تواضع اور شخصیت میں خلا نہ ہونے کی علامت ہے۔ اونچی آواز سے اعصاب پر منفی اثرات مترتب ہوتے ہیں اور آداب محفل کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ سورۃ الحجرات آیت ۲ میں فرمایا:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡہَرُوۡا لَہٗ بِالۡقَوۡلِ کَجَہۡرِ بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ○

اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

آواز اونچی کرنا بے ادبی ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وجود کو اعتنا میں نہ لانے کی وجہ سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے آخری وقت میں شور مچانے والوں سے آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: قوموا عنی میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔[۲]

خصوصاً گدھے کی آواز میں کراہت اس کے بے ہنگم ہونے کی وجہ سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر جانور آواز کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے سوائے گدھے کے۔ اس کی آواز بلا وجہ ہوتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْعَطْسَۃُ الْقَبِیحَۃُ.[۳] (بدترین آواز) بری طرح کی چھینک کی آواز ہے۔

مناسب یہ ہے کہ چھینک کے وقت دونوں ہاتھوں ناک پر رکھ کر آواز کو کنٹرول کیا جائے اور پاس بیٹھے ہوئے لوگ اس چھینک سے پھیلنے والے مضر اثرات سے محفوظ رہیں۔

اہم نکات

۱۔ قرآن راستہ چلنے اور آواز تک کے لیے آداب کی راہنمائی فراہم کرتا ہے۔

اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی ۲۰۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور

۱ بحار الانوار ۶۶: ۴۸ ۲ بخاری کتاب العلم باب کتابۃ العلم ۳ الکافی ۲: ۶۵۶۔ مشکاۃ الانوار ص ۲۰۷

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ وَاَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا ہُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیۡرٍ ﴿۲۰﴾

جو کچھ زمین میں ہے اللہ نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں کامل کر دی ہیں اور (اس کے باوجود) کچھ لوگ اللہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس نہ علم ہے اور نہ ہدایت اور نہ کوئی روشن کتاب۔

تشریح کلمات

اَسۡبَغَ: (س ب غ) اسباغ النعم پورا پورا انعام کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ: اپنے گرد و پیش سے غافل انسان کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کی ربوبیت کو چھوڑ کر واہموں کے پیچھے جانے والو! کیا تم نے کبھی اس بات کی طرف توجہ کی ہے کہ اللہ ہی نے تمہارے، تمہاری زندگی کی بقا و ارتقا اور ضروریات کی فراہمی کے لیے آسمانوں میں جو کچھ ہے مسخر کیا ہے۔ مسخر کرنے والا اللہ ہے۔ اس تسخیر کی غرض و غایت تم ہو، تمہاری زندگی کی تدبیر ہے۔ آسمان میں موجود چیزوں کی تسخیر کا مطلب یہ ہے آسمان میں موجود سورج، چاند اور ستارے ہماری زندگی کے لیے ضروری سامان فراہم کرتے ہیں۔ صرف سورج اہل ارض کے لیے سال بھر کی ضرورت کی انرجی ایک منٹ میں فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح زمین ایک مہرباں ماں کی طرح ہمیں اپنی گود میں پالتی ہے۔ اسی زمین کے سینے سے ہم گونا گوں غذا چوستے ہیں۔ ہم ناشکرے ہو سکتے ہیں لیکن اس زمین میں بخل نہیں ہے۔ وہ ہر وقت، ہر ایک کے لیے رنگ برنگ غذاؤں پر مشتمل دسترخوان بچھائے رکھتی ہے۔

۲۔ وَاَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَہٗ: اللہ ہی نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔ ظاہری نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہو سکتی ہیں جو مشرکین کے لیے ظاہری ہیں۔ جیسے اعضائے بدن، صحت اور انسان کی بقا و ارتقا کے لیے ضروری سامان کی فراوانی اور باطنی نعمتوں سے مراد جیسے عقل و ارادہ، وجدانیات وغیرہ۔ کتنی ہی ایسی نعمتیں ہمارے وجود میں ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔

۳۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ: ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اللہ کی ربوبیت، اس کی وحدانیت کے خلاف بلا دلیل بحث کرتے ہیں۔ قرآن کا موقف یہ ہے کہ کسی بھی موقف کے لیے خود موقف والے کے

پاس علم ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کسی ہدایت کنندہ کی طرف سے ہدایت ہونی چاہیے یا آسمانی کتابوں میں کسی کتاب کا حوالہ ہونا چاہیے۔ ان دلائل میں سے ایک دلیل بھی نہ ہو اور صرف اندھی تقلید ہو تو وہ موقف قابل اعتنا نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ نے اس ناشکرا انسان کی تدبیر زندگی کے لیے آسمانوں اور زمین پر مشتمل ایک بڑا دسترخوان بچھایا ہے۔

۲۔ کسی بھی موقف کے لیے اللہ کی طرف سے ہادی اور کتاب خدا کے علاوہ کوئی اور دلیل نہیں ہو سکتی۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوۡ کَانَ الشَّیۡطٰنُ یَدۡعُوۡہُمۡ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیۡرِ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے: جو اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، خواہ شیطان ان (کے بڑوں) کو بھڑکتی آگ کے عذاب کی طرف بلاتا رہا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّبِعُوۡا: جب ان مشرکین کو الٰہی دستور پر عمل کرنے کی دعوت دی جاتی ہے جس پر مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ جیسی مضبوط دلیل موجود ہے تو مشرکین اس دلیل کے مقابلے میں لا دلیل پیش کرتے ہیں۔ اس سند کے مقابلے میں لا سند پیش کرتے اور کہتے ہیں ہم نے تو اپنے آبا و اجداد کی سیرت کی اتباع کرنی ہے۔ آبا و اجداد کے پاس کوئی دلیل اور سند تو نہیں ہے۔ البتہ شیطان کی دعوت ان تک پہنچی ہے جو انہیں جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ باطل عقیدہ نسلوں میں بھی اثر چھوڑتا ہے: مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ....

وَ مَنۡ یُّسۡلِمۡ وَجۡہَہٗۤ اِلَی اللّٰہِ وَ ہُوَ مُحۡسِنٌ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ

۲۲۔ اور جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور وہ نیکوکار بھی ہو تو اس نے مضبوط رسی

الۡوُثۡقٰی ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ ﴿۲۲﴾ کو تھام لیا اور سب امور کا انجام اللہ ہی کی طرف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَنۡ یُّسۡلِمۡ وَجۡہَہٗۤ: یعنی ذاته و نفسه۔ وجه سے ذات مراد لینا قرآنی اصطلاح میں ایک مسلم امر ہے۔ اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ذات اللہ کی ملکیت ہے اور ملکیت مالک کے حوالے ہوتی ہے۔ اگر مالک کے علاوہ کسی دوسرے کے تصرفات میں دی جائے تو یہ انحراف اور بغاوت شمار ہوتی ہے۔

۲۔ وَ ہُوَ مُحۡسِنٌ: مالک کے حوالے ہونے کے بعد ہر عمل مالک کی مرضی کے مطابق ہو تو یہ حوالے کرنا درست ثابت ہو گا اور مالک کے حوالے کرنے کے اثرات صرف عمل کی صورت میں مترتب ہوں گے۔

۳۔ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی: وہ اثرات یہ ہیں کہ اس صورت میں نجات و فلاح کے لیے ایک مضبوط رسی اس کے ہاتھ میں آجائے گی جس کے بعد وہ ہر قسم کے انحراف سے محفوظ رہے گا۔

مضبوط رسی کو تھامنے کی تعبیر سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ نجات کا راستہ طوفانی آندھیوں سے گزرتا ہے۔ مضبوط رسی کے ساتھ متمسک نہ ہوں تو بچھڑ جانے کا خطرہ ہے۔

۴۔ وَ اِلَی اللّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ: تمام معاملات کا انجام کار اللہ کی بارگاہ میں جا کر وعدۂ الٰہی کے ساتھ روبرو ہونا ہے اور اپنی ابدی زندگی کی قسمت کا فیصلہ لینا ہے۔

فضیلت: الزہری نے انس بن مالك سے روایت کی ہے:

> وَمَنۡ یُّسۡلِمۡ وَجۡہَہٗۤ اِلَی اللّٰہِ حضرت علی بن ابی طالب علیہا السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے چونکہ وہ سب سے پہلے اللہ کے لیے خلوص ایمان کا مظاہرہ کرنے والے ہیں.... الی آخر الحدیث۔ (شواهد التنزیل ذیل آیت)

اہم نکات

۱۔ ایمان عمل کے ساتھ جفت ہو گا تو پھل ملے گا: وَمَنۡ یُّسۡلِمۡ وَجۡہَہٗۤ اِلَی اللّٰہِ وَ ہُوَ مُحۡسِنٌ ....

وَ مَنۡ کَفَرَ فَلَا یَحۡزُنۡکَ کُفۡرُہٗ ؕ اِلَیۡنَا مَرۡجِعُہُمۡ فَنُنَبِّئُہُمۡ بِمَا ۲۳۔ اور جو کفر کرتا ہے اس کا کفر آپ کو محزون نہ کرے انہیں پلٹ کر ہماری طرف آنا ہے پھر ہم

عَمِلُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُہُمۡ قَلِیۡلًا ثُمَّ نَضۡطَرُّہُمۡ اِلٰی عَذَابٍ غَلِیۡظٍ ﴿۲۴﴾

انہیں بتائیں گے کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں یقیناً اللہ ہر وہ بات خوب جانتا ہے جو سینوں میں ہے۔
۲۴۔ ہم انہیں (دنیا میں) تھوڑا مزہ لینے کا موقع دیں گے پھر انہیں مجبور کر کے شدید عذاب کی طرف لے آئیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنۡ کَفَرَ فَلَا یَحۡزُنۡکَ کُفۡرُہٗ: عالمین کے لیے رحمت ہونے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو بڑا اشتیاق رہتا تھا کہ لوگ راہ راست پر آجائیں لیکن لوگ جب کفر پر ڈٹ جاتے تو اس مجسمۂ رحمت کو بڑا دکھ ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے آپ کو اللہ کی رحمت سے کیوں محروم کر رہا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تسلی دیتا ہے کہ یہ لوگ رحمت الٰہی کے اہل نہیں ہیں لہٰذا آپ محزون نہ ہوں۔

۳۔ اِلَیۡنَا مَرۡجِعُہُمۡ: انہیں ہر حال میں میرے پاس پہنچنا اور اپنے برے اعمال کا سامنا کرنا ہے۔ اللہ ان کے خفیہ ارادوں سے واقف ہے کہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

۴۔ نُمَتِّعُہُمۡ قَلِیۡلًا: اللہ کا حکیمانہ فیصلہ ہے کہ مجرموں کو چند دن مہلت دی جاتی ہے پھر انہیں اپنی سزائے عمل تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسول رحمت، کافروں کے ساتھ بھی ہمدردی رکھتے ہیں: فَلَا یَحۡزُنۡکَ کُفۡرُہٗ ....

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں: آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یہ ضرور کہیں گے: اللہ نے، الحمد للہ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ سوال خالق کا ہے اور اختلاف مدبر میں ہے چونکہ مشرکین بھی اللہ کو خالق مانتے تھے لیکن مدبر نہیں مانتے تھے۔ یہاں اس آیت میں خالقیت کے اعتراف سے مدبریت کے اعتراف کا نتیجہ اخذ کیا جاتا

ہے کہ تخلیق و تدبیر قابل تفریق نہیں ہے۔

۲۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ: اس اعتراف پر اللہ کی حمد بجا لانی چاہیے اور اس لیے بھی کہ ان پر حجت پوری ہوگئی۔ اس آیت کی تشریح سورہ عنکبوت آیت ۶۱ میں گزر چکی ہے۔

۳۔ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ: ان میں سے اکثر اس بات کو نہیں جانتے کہ تخلیق ہی کے ذریعے تدبیر ہوتی ہے اور دوسرے لفظوں میں تدبیر، تخلیق مسلسل کا نام ہے۔

اہم نکات

۱۔ خالقیت کا اعتراف، ربوبیت و مدبریت کا اعتراف ہے: لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ ....

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۲۶﴾	۲۶۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کی ملکیت ہے، وہ اللہ یقیناً بے نیاز، لائق ستائش ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ کل کائنات میں موجود تمام چیزیں اللہ کی ملکیت ہیں۔ ان کا وجود و بقا اللہ کے قبضے میں ہے۔ اللہ جو ان تمام چیزوں کا مالک حقیقی ہے، کے ارادے کے بغیر ذرہ برابر کوئی چیز جنبش نہیں کر سکتی تو اللہ کے بغیر ان کی تدبیر کوئی اور کیسے کر سکتا ہے۔

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ: کائنات کی ملکیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ کو اس کائنات کی ملکیت کی ضرورت ہے، جیسا کہ غیر اللہ کسی چیز کا مالک ہوتا ہے اس چیز کی ضرورت کی بنا پر۔ اللہ مالک ہے بے نیازی کے ساتھ اور اس کائنات کے بغیر بھی وہ لائق حمد ستائش ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کائنات کا مالک بھی ہے اور کائنات سے بے نیاز بھی۔ دوسرے مالک اپنے مملوک کے محتاج ہیں لیکن اللہ اپنی بے نیازی کے ساتھ مالک ہے۔ یہی حقیقی مالک ہے۔

وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۷﴾	۲۷۔ اور اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر کے ساتھ مزید سات سمندر مل (کر سیاہی بن) جائیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے یقیناً اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ: انسان کے مشاہداتی امور کی روشنی میں محسوساتی دنیا میں بسنے والوں کے لیے ایک مثال ہے کہ کلمات خدا یعنی کلمۂ کن کے نتیجے میں وجود میں آنے والی موجودات کی ایک اجمالی فہرست تیار کرنا بھی روئے زمین پر موجود درختوں سے بننے والے قلموں اور سمندروں سے بننے والی سیاہیوں کے بس میں نہیں ہے خواہ اس سمندر کے ساتھ مزید سات سمندر مل جائیں کیونکہ محدود کے لیے لا محدود کا احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہ سارے سمندر سیاہی بن جائیں تو خود سمندری موجودات کی فہرست تیار کرنے کے لیے بھی شاید ناکافی ہو گا۔

دوسرے لفظوں میں کلمات اللّٰہ کی یہ تشریح ہو سکتی ہے: اللہ تعالیٰ کے کلمات، وہ ارادہ اور وہ تخلیق و ایجاد اور وہ فیوض ہیں جو ہمیشہ جاری رہتے ہیں: کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ۔[1] وہ ہر روز ایک (نئی) کرشمہ سازی میں ہے۔ مثل مشہور ہے: لا انقطاع فی الفیض۔ اللہ تعالیٰ کا فیض منقطع نہیں ہو سکتا۔ فیض خدا ہمیشہ جاری اور لا محدود ہے۔ ان لامحدود کلمات کا احاطہ کرنا کسی محدود کے بس میں نہیں ہے خواہ وہ محدود کتنا ہی عظیم اور وسیع کیوں نہ ہو۔

سورہ کہف آیت ۱۰۹ میں بھی کلمات اللہ کی تشریح ہو چکی ہے۔

اہم نکات

۱۔ فیوض الٰہی، کلمات اللہ کا احاطہ ناممکن ہے: مَّا نَفِدَتۡ کَلِمٰتُ اللّٰہِ ....۔

مَا خَلۡقُکُمۡ وَ لَا بَعۡثُکُمۡ اِلَّا کَنَفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اللہ کے لیے تم سب کا پیدا کرنا پھر دوبارہ اٹھانا ایک جان (کے پیدا کرنے اور پھر اٹھانے) کی طرح ہے یقیناً اللہ خوب سننے والا دیکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قریش کے مشرکین کے لیے یہ بات قابل فہم نہیں کہ اللہ ایک ہی گھڑی میں تمام مخلوقات کو دفعتہً کیسے پیدا کرے گا جب کہ دنیا میں تو ان کو ایک ایک کر کے پیدا کیا ہے۔ اس سطحی سوچ اور غلط فہمی کے ازالہ کے لیے فرمایا: اللہ کے ایک ارادے سے مخلوق وجود میں آ جاتی ہے خواہ وہ مخلوق ایک ہو یا ایک کھرب ہو۔ لہٰذا اللہ کے لیے خلق و اعادہ خلق، کثرت یا قلت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب یکساں طور پر آسان ہے۔ قلت

---

[1] ۵۵ رحمٰن: ۲۹

اور کثرت کا فرق اس کے لیے سامنے آتا ہے جو علل و اسباب کے ذرائع سے کوئی چیز بناتا ہے۔ ایک چیز بنانے کے لیے تھوڑے سامان کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کا فراہم کرنا آسان ہوتا ہے اور اگر بہت زیادہ تعداد میں بنانا ہے تو اس کے لیے بہت زیادہ سامان فراہم کرنا ہوتا ہے جو مشکل ہے۔

۲۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ: کثرت کی وجہ سے کسی کی شناخت میں اللہ کو کوئی دقت پیش نہیں آتی وہ ہر آواز اور ہر شکل کو پہچانتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے لیے ہر کام یکساں ہے، آسان اور مشکل کا یہاں تصور نہیں ہے: كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ....

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ رات کو دن اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے؟ سب ایک مقررہ وقت تک چل رہے ہیں اور تحقیق اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے.

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ: اس کائنات کی تدبیر کے سلسلے میں ایک شعبہ، دن رات کا ایک دوسرے میں داخل کرنے کے عمل کا ہے کہ مختلف موسموں میں رات کا کچھ حصہ دن میں اور دن کا کچھ حصہ رات میں داخل کیا جاتا ہے جس سے مختلف موسم وجود میں آتے ہیں۔

۲۔ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ: اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کیا ہے جس سے انسان کی بقا و ارتقا کا سامان فراہم ہو۔

۳۔ كُلٌّ يَّجْرِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى: یہ شمس و قمر اپنی مقررہ مدت تک چل رہے ہیں۔ اس کی ایک تشریح یہ ہے کہ مقررہ وقت تک یہ سب چلتے ہیں۔ اس کے بعد ابتدائی نقطے کی طرف واپس آتے ہیں دوسری تشریح یہ ہے کہ یہ شمس و قمر بھی اپنی ایک عمر رکھتے ہیں۔ یہ عمر عند اللہ معین ہے۔ اس وقت تک چلتے رہیں گے۔

اہم نکات

۱۔ شب و روز کا آنا جانا، گردش شمس و قمر کا تعلق تدبیر حیات سے ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ ....

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الۡبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡعَلِىُّ الۡكَبِيۡرُ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ یہ اس لیے کہ اللہ (کی ذات) ہی برحق ہے اور اس کے سوا جنہیں وہ پکارتے ہیں سب باطل ہیں اور اللہ ہی برتر و بزرگ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ: تدبیر کائنات سے متعلق مذکورہ حقائق کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مربوط ہونے اور غیر اللہ کا کوئی تعلق نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات ہی برحق ہے اور جن غیر اللہ کو تم پکارتے ہو وہ باطل، واہمہ، خیالی چیز ہے۔ کسی شیٔ کے ثبوت، وجود اور نفس الامری حالت کو حق کہتے ہیں۔ صرف اللہ کی ذات ہے جو علی الاطلاق حق ہے، بذات خود موجود ہے، دوسری تمام موجودات کی منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس کا وجود کسی اعتبار اور کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ جب کہ باقی موجودات اللہ کے وجود کا سایہ ہیں۔ غیر اللہ اگر ارادہ الٰہی کے ساتھ مربوط ہے تو اسے ایک وجود ظلی حاصل ہو گا، ورنہ وہ باطل اور نیستی محض ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کا وجود حق و حقیقت پر مبنی ہے باقی معبود خود ساختہ اور واہمہ ہیں: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ ....

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡكَ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمۡ مِّنۡ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کشتی سمندر میں اللہ کی نعمت سے چلتی ہے تاکہ وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے، تمام صبر اور شکر کرنے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡكَ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ: اللہ تعالیٰ کے تدبیری نظام میں سمندر کی افادیت کو تو نے نہیں دیکھا کہ اس کا کیا کردار ہے۔ تجارتی کشتیاں اللہ کی نعمت ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کے لیے پانی کی پشت پر کیسے چلتی ہیں۔

۲۔ لِيُرِيَكُمۡ مِّنۡ اٰيٰتِهٖ: اللہ کا یہ تدبیری معجزہ تم کو دکھایا جاتا ہے کہ پانی اپنے سے وزن میں کم چیزوں کو اپنی پشت پر اٹھا لیتا ہے جس سے انسان اپنی زندگی کی ضروریات دنیا کے ایک علاقے سے دوسرے

علاقوں تک آسانی سے منتقل کر سکتے ہیں۔

۳۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ: اس میں اللہ کی تدبیری نشانیاں ان لوگوں پر واضح ہو جاتی ہیں جو کسب معاش کے لیے سمندری سفر کی مشقت پر صبر کرتے ہیں۔ ان نعمتوں پر شکر کرتے ہیں جو کشتیوں کی وجہ سے انہیں میسر آتی ہیں ورنہ دوسرے لوگ کشتیوں کی اس عظیم افادیت سے غافل رہتے ہیں۔

وَ اِذَا غَشِیَہُمۡ مَّوۡجٌ کَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ۚ فَلَمَّا نَجّٰہُمۡ اِلَی الۡبَرِّ فَمِنۡہُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ؕ وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا کُلُّ خَتَّارٍ کَفُوۡرٍ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور جب ان پر (سمندر کی) موج سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو وہ عقیدے کو اسی کے لیے خالص کر کے اللہ کو پکارتے ہیں پھر جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کچھ اعتدال پر قائم رہتے ہیں اور ہماری نشانیوں کا وہی انکار کرتا ہے جو بدعہد ناشکرا ہے۔

تشریح کلمات

خَتَّارٍ: (خ ت ر) اصل میں غدّار کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح سورہ عنکبوت آیت ۶۵ میں ہو چکی ہے کہ جب انسان کے دل و دماغ سے دنیاوی خواہشات کا پردہ ہٹ جاتا ہے اور انسان کو صرف اپنی فطرت کے ساتھ سرگوشی کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس وقت اس کی فطرت کو اس کے خالق کے علاوہ کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔

۲۔ فَلَمَّا نَجّٰہُمۡ اِلَی الۡبَرِّ: جب خطرہ ٹل جاتا ہے تو چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو راہ راست پر قائم رہتے ہیں۔ فَمِنۡہُمۡ مُّقۡتَصِدٌ اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ خطرے اور امن دونوں حالتوں میں اپنی فطرت و ہدایت پر قائم رہتے ہیں۔

۳۔ وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا کُلُّ خَتَّارٍ کَفُوۡرٍ: اور بدعہد، ناشکرے ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں۔ فطرت کی طرف سے ان آیات کو قبول کرنے اور فطرت کے ساتھ عہد کرنے کے بعد جب حالت امن آ جاتے ہیں تو یہ بدعہد ہو جاتے اور نجات کی نعمت کو فراموش کر دیتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے:

الایمان نصفان نصف فی الصبر و نصف فی الشکر۔[1]

ایمان کے دو حصے ہیں: ایک حصہ صبر اور ایک حصہ شکر میں ہے۔

---

[1] تحف العقول ص ۴۸

اہم نکات

۱۔ کبھی اضطراری حالت میں فطرت کو اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے کا موقع مل جاتا ہے:
دَعَوُا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ...۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ وَ اخۡشَوۡا یَوۡمًا لَّا یَجۡزِیۡ وَالِدٌ عَنۡ وَّلَدِہٖ ۫ وَ لَا مَوۡلُوۡدٌ ہُوَ جَازٍ عَنۡ وَّالِدِہٖ شَیۡـًٔا ؕ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا ٝ وَ لَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اے لوگو! اپنے پروردگار (کے غضب) سے بچو اور اس دن کا خوف کرو جس دن نہ باپ بیٹے کے اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آئے گا، اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے لہٰذا دنیا کی یہ زندگی تمہیں دھوکہ نہ دے اور دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں نہ رکھے۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ: گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت، ربوبیت اور اعادہ حیات پر قدرت کے سلسلے میں دلائل و شواہد پیش کرنے کے بعد آخر میں تمام انسانوں کو چند باتوں کی طرف متوجہ فرمایا:

الف: اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ: اپنے رب کے عدل پر مبنی فیصلہ سے بچو۔ یہ فیصلہ غضب الٰہی اور ابدی عذاب پر مشتمل ہو گا۔

ب: وَ اخۡشَوۡا یَوۡمًا: اور قیامت کے اس دن سے ڈرو۔ جس میں کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا حتیٰ باپ بیٹا میں سے کوئی ایک دوسرے کے کام نہیں آئے گا۔ اس دن صرف اپنا عمل کام آئے گا۔

ج: اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ: اللہ کی طرف سے وعدہ آخرت، مبنی برحق ہے۔ حساب، جنت اور جہنم کا وعدہ بھی مبنی برحق ہے۔ رب کی عدالت سے بچنے اور روز قیامت کی ہولناکیوں سے بچنے کے لیے دو دشمنوں کی نشاندہی فرمائی:

۲۔ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا: پہلا دشمن دنیوی زندگی کی رعنائیاں ہیں جو انسان کو دھوکہ دیتی ہیں کہ وہ اسی میں مگن رہتا ہے اور روز آخرت کو ایک حقیقت کے طور پر نہیں لیتا۔

۳۔ وَ لَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ: دوسرا دشمن، دھوکے باز شیطان ہے۔ انسان کو دھوکہ دیتا ہے اور آخرت کو ایک واہمہ قرار دیتا ہے یا اس ابدی زندگی سے غافل کر دیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تقویٰ اور خوف قیامت، آخرت کے لے زاد راہ ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَ اخْشَوْا ....۔

۲۔ خواہشات دنیا اور شیطانی فریب کاری، انسان کو قیامت سے غافل کر دیتی ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾ ع ۱۳

۳۴۔ قیامت کا علم یقیناً اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش برساتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمانے والا ہے اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ کس سرزمین میں اسے موت آئے گی، یقیناً اللہ خوب جاننے والا، بڑا باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ: قیامت کب برپا ہو گی؟ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اللہ نے اس راز سے کسی کو بھی واقف نہیں کیا ہے۔

۲۔ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ: بارش بھی صرف اور صرف اللہ برساتا ہے۔ کسی اور کے بس میں نہیں ہے کہ وسیع و عریض سمندر خلق کرے۔ بخار اوپر کو اٹھائے۔ ہواؤں کے ذریعے اسے خشکی کی طرف چلائے اور بارش برسائے۔ فضا میں موجود بخارات سے استفادہ کر کے مصنوعی بارش کا نازل ہونا قدرت کے نظام سے استفادہ ہے۔ انسان کی اپنی ایجاد نہیں ہے۔

۳۔ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ: جو کچھ رحموں میں ہے صرف اللہ جانتا ہے۔ یہاں سوال کرتے ہیں کہ انسان بھی جاننے لگے ہیں کہ ماؤں کے رحموں میں کیا ہے؟ لڑکا ہے یا لڑکی؟

جواب یہ ہے:

اول: انسان بچے کو اس کی تخلیق مکمل ہونے کے بعد جانتا ہے۔ بچے پیدا ہونے کے بعد تو سب جانتے ہیں لیکن انسان یہ نہیں جانتا کہ چار سو ملین جرثومۂ پدر میں سے کون سا جرثومہ تخم مادر کے ساتھ جفت ہوا ہے اور کس خاصیت کا جرثومہ ہے چونکہ چار سو ملین جرثوموں میں سے ہر ایک اپنی جدا خاصیت رکھتا ہے۔

ثانیاً: انسان کو یہ علم نہیں ہوتا کہ جس لمحے جرثومہ پدر، تخم مادر کے ساتھ جفت ہوا، باپ کی طرف

سے Y جفت ہوا کہ لڑکا ہو جائے یا X ہوا کہ لڑکی ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اپنی خداداد صلاحیت سے جفت ہونے کے عمل کو خود انجام دے رہا ہے۔

ثالثاً: انسان صرف بچے کے مادی وجود کو جانتا ہے اس کی غیر مادی خاصیتوں کو نہیں جانتا کہ کس خاصیت کا بچہ ہے۔ مزید تشریح کے یے سورہ رعد آیت ۸ ملاحظہ فرمائیں۔

۴۔ وَمَاتَدۡرِیۡ نَفۡسٌ: انسان کو اپنے ایک دن کے فاصلے پر ہونے والے واقعات و حادثات کا علم نہیں ہے۔

۵۔ وَمَاتَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ: اس انسان کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کی زندگی کا خاتمہ زمین کے کس خطے میں ہوگا۔ یہ ناداں انسان قیامت کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کا علم اللہ نے صرف اپنے ساتھ مخصوص کر رکھا: اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ....

۲۔ انسان کا دائرہ علم نہایت محدود ہے: وَمَاتَدۡرِیۡ نَفۡسٌ ....

سُورَةُ السَّجۡدَة

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورہ کی ایک آیت میں سجدہ واجب ہونے وجہ سے اس سورۃ کا نام السجدۃ ہو گیا۔ یہ سورۃ بصری قرائت کے مطابق ۲۹ آیات اور کوفی قرائت کے مطابق تیس آیات پر مشتمل ہے۔ یہ قرائت باب مدینۃ العلم کے شاگردوں کی قرائت ہونے کے اعتبار سے معتبر ترین قرائت ہے جو قرائت عاصم مشہور ہے۔

یہ سورۃ المبارکۃ مکہ میں نازل ہوئی۔ بعض کے مطابق صرف تین آیات ۱۸۔۱۹۔۲۰ مدنی ہیں۔

سورہ ھائے عزائم: شیعہ امامیہ کے نزدیک قرآن مجید کی چار سورتوں میں ایسی آیات ہیں جن کے پڑھنے اور سننے پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں: سورۃ السجدۃ کی پندرھویں آیت۔ سورۃ حم السجدۃ کی آیت ۳۷، سورۃ النجم کی آیت ۶۲ اور سورۃ العلق کی آیت ۱۹۔

قرآن میں پندرہ مقامات پر آیۂ سجدہ مذکور ہیں۔ شافعی کے نزدیک ان تمام آیتوں پر سجدہ کرنا مستحب ہے۔ ابو حنیفہ ان آیات پر سجدہ واجب سمجھتے ہیں۔

شیعہ امامیہ کے نزدیک اوپر مذکور چار سورتوں میں واجب، باقی سورتوں میں مستحب ہے۔ محمد بن مسلم اپنی ایک صحیح السند روایت میں کہتے ہیں:

میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا: ایک شخص سورۂ عزائم (جہاں سجدہ واجب ہے) کی دوسرے کو تعلیم کرتا ہے اور آیۂ سجدہ کی ایک ہی نشست میں بار بار تکرار کرتا ہے۔ فرمایا:

عَلَيْهِ اَنْ يَسْجُدَ كُلَّمَا سَمِعَهَا وَ عَلَى الَّذِي يُعَلِّمُهُ اَنْ يَسْجُدَ۔[1]	شاگرد پر واجب ہے جب آیۂ سجدہ سنے، سجدہ کرے اور استاد پر بھی واجب ہے ہر بار سجدہ کرے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ	بنام خدائے رحمٰن رحیم
الٓمّٓ ۟ۚ﴿۱﴾	۱۔ الف، لام، میم۔

[1] التہذیب ۲: ۲۹۳

تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ﴿۲﴾

۲۔ ایسی کتاب کا نازل کرنا جس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے رب العالمین کی طرف سے (ہی ممکن) ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ: یعنی ھذا تنزیل۔ اس کتاب کی تنزیل رب العالمین کی طرف سے ہے۔ نزول قرآن کے وقت تبلیغ کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ مشرکین کی طرف سے تکذیب کی صورت میں پیش آ رہی تھی۔ اس وجہ سے اس کتاب کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے کے مسئلے کو بڑے اہتمام کے ساتھ صدر کلام میں پیش فرمایا ہے۔

۲۔ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ: اس کتاب کے اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہونے میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی تشریح سورہ بقرہ آیت ۲ میں ہو چکی ہے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ۚ بَلۡ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰىہُمۡ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ لَعَلَّہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۳﴾

۳۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس (رسول) نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ آپ کے رب کی طرف سے برحق ہے تاکہ آپ ایسی قوم کو تنبیہ کریں جس کے پاس آپ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا شاید وہ ہدایت حاصل کریں.

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ: کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصنیف کر کے اللہ کی طرف نسبت دی۔ سورہ یونس آیت ۳۸ میں اس کا جواب دیا ہے:

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ وَ ادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ○

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو (محمد نے) از خود بنایا ہے؟ کہدیجیے: اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جسے تم بلا سکتے ہو بلا لاؤ۔

۲۔ بَلۡ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ: بلکہ یہ قرآن مبنی برحق ہے۔ اس کی حقانیت پر خود قرآن شاہد ہے۔

۳۔ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰىہُمۡ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ: تاکہ آپ ایسی قوم کی تنبیہ کریں جس کے پاس آپ سے پہلے تنبیہ کرنے والا نہیں آیا۔ وہ قوم کون سی قوم ہے جس کے پاس کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا؟ ظاہر

ہے رسول اللہ ﷺ کو جس قوم کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اس قوم میں نبی مبعوث نہیں ہوئے۔ مَّاۤ اَتٰىهُمۡ اس قوم کے پاس کوئی نذیر یعنی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا اگرچہ انبیاء علیہم السلام کا پیغام ان تک پہنچتا رہا۔ براہ راست ان کے پاس کوئی نبی نہیں آیا۔ سورہ یٰس آیت ۶ میں فرمایا:

لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُهُمۡ ... تاکہ آپ ایک ایسی قوم کو تنبیہ کریں جس کے باپ دادا کو تنبیہ نہیں کی گئی تھی۔

ان دو آیات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نہ ان کے پاس کوئی تنبیہ کرنے والا نبی آیا نہ ان کی تنبیہ ہوئی۔

درست ہے کہ عربوں کی طرف صدیوں سے کوئی نبی نہیں آیا اور یہ بھی درست ہے ایک مدت سے ان کی تنبیہ بھی نہیں ہوئی چونکہ کفر و شرک نے ان میں ایسا رواج پایا تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت بھی ان تک نہیں پہنچنے دی گئی۔ چنانچہ عرب کے لوگ عمرو الخزاعی کے زمانے تک ملت ابراہیمی پر قائم تھے۔ عمرو الخزاعی نے ان میں بت پرستی کا رواج ڈالا۔ اس کے بعد ان میں نہ تنبیہ رہی، نہ تنبیہ کرنے والا۔

درج بالا بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ آیت آیہ وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ ...[1] کے ساتھ متصادم نہیں ہے۔ چونکہ کوئی امت کسی نبی کی دعوت کے بغیر نہیں رہی۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دعوت اور حجت خدا کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ خواہ وہ براہ راست ہو یا کسی وصی کے ذریعہ ہو۔ چنانچہ خود عرب مشرکین کے معاشرے میں ملت ابراہیمی کی بہت سی تعلیمات باقی رہیں جیسے حج کے اکثر اعمال، چار مہینوں کی حرمت وغیرہ اور ان میں موحد لوگ بھی موجود رہے۔

اہم نکات

۱۔ کفار کے پاس منطق نہیں ہوتی الزام تراشی سے کام لیتے ہیں۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ....

۲۔ رسول کریم ﷺ ایسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے جو نذیر و نذارت سے محروم رہی: مَّاۤ اَتٰىهُمۡ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ ....

اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَهُمَا فِیۡ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِیٍّ

۴۔ اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر متمکن ہو گیا، اس کے سوا تمہارا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ شفاعت کرنے

---

[1] ۳۵ فاطر: ۲۴

وَّلَا شَفِيۡعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ ④ والا، کیا تم نصیحت نہیں لیتے؟

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰهُ الَّذِىۡ: آیت کے اس جملے کی تشریح سورہ اعراف آیت ۵۴ سورہ یونس آیت ۳، سورہ ھود آیت ۷ میں ہوگئی ہے۔

۲۔ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ: اللہ تعالیٰ کے مقام تدبیر کا نام ہے۔ اس لیے آسمانوں کی تخلیق کے بعد عرش کا ذکر آتا ہے اور ہمیشہ عرش کے ذکر کے بعد اللہ کی ولایت و حاکمیت اور شفاعت کا ذکر آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ آفاقی مطالعہ سے انسان نصیحت حاصل کرسکتا ہے: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ ... اَفَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ۔

يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الۡاَرۡضِ ثُمَّ يَعۡرُجُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ⑤

۵۔ وہ آسمان سے زمین تک امور کی تدبیر کرتا ہے پھر یہ امر ایک ایسے دن میں اللہ کی بارگاہ میں اوپر کی طرف جاتا ہے جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الۡاَرۡضِ: اللہ تعالیٰ کے عرش پر متمکن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تدبیری حاکمیت پر متمکن ہوا۔ اللہ جس امر کے ذریعے تدبیر فرماتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقام رفعت سے مخلوقات کی طرف نزول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بات بھی اہل ارض کی طرف آتی ہے اسے نزول سے تعبیر فرمایا ہے۔ جیسے وحی، کتاب وغیرہ۔ لہٰذا اس جگہ السَّمَآءِ سے مراد مقام والائے پروردگار ہے جہاں سے تدبیر امور نازل ہوتے ہیں۔

۲۔ ثُمَّ يَعۡرُجُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ: زمانہ مادی چیزوں میں ہر جگہ یکساں نہیں ہے جیسا کہ نظریہ اضافت کے ہاں مسلم ہے لیکن جو چیز غیر مادی ہے وہ غیر زمانی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ زمانی نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

كَانَ وَ لَمْ يَزَلْ حَيّاً بِلَا كَيْفٍ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ كَانَ...[1] وہ اس وقت بھی بغیر کسی کیفیت کے زندہ موجود تھا جب کہ اس کے لیے "تھا" بھی نہ تھا۔

یعنی زمانہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے زمانی افعال کا ارضی زمانے کے ساتھ

---

[1] الکافی ۱: ۸۸

موازنہ کیا جائے تو اللہ کا ایک روز، یہاں کے ہزار سال کے برابر ہو جائے۔ یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے امور زمان و زمانیات سے ماوراء ہیں۔ مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے وقت اور زمانے میں امر الٰہی کا نزول و عروج ہوتا ہے کہ اگر ارضی زمانے کے مطابق یہ عروج و نزول انجام پائے تو ہزار سال لگ جائیں۔

اور ممکن ہے ''ہزار'' حد بندی کے لیے نہ ہو کثرت کی طرف اشارہ ہو۔ جیسے:

وَ اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ۞[1] اور آپ کے پروردگار کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے مطابق یقیناً ہزار برس کی طرح ہے۔

ہزار برس کی طرح ہے، ایک مثال ہے، حد بندی نہیں ہے۔

یَعۡرُجُ: یعرج الامر الی اللّٰہ۔ یہ امر آسمان سے زمین کی طرف آنے کے بعد اللہ کی طرف اوپر جاتا ہے۔ یہ امر نزول کے بعد عروج کرتا ہے۔ بظاہر یہ عروج ایک ہزار سال کی مدت میں پورا ہوتا ہے:

اَلَاۤ اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ ۞[2] تمام معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی طرف عروج سے کیا مراد ہے؟ صحیح طریقے سے معلوم نہ ہو سکا۔ تقریباً تمام مفسرین کی تشریحات کا مطالعہ کیا لیکن لا یسمن و لا یغنی من جوع۔ یہ مسئلہ میرے لیے حل نہ ہو سکا۔ ایک روایت کے مطابق ابن عباس نے بھی اس یوم کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔[3]

اہم نکات

۱۔ تدبیر امور کا نزول و عروج اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، نہ غیر اللہ کے ہاتھ میں: یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ ....

ذٰلِکَ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّهَادَۃِ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۙ﴿۶﴾ ۶۔ وہی جو غیب و شہود کا جاننے والا ہے جو بڑا غالب آنے والا، رحیم ہے۔

تفسیر آیات

وہ تدبیری امور کے نزول و عروج سے متعلق اسرار و رموز کا جاننے والا ہے۔ اسے معلوم ہے کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں کرنا چاہیے۔ الۡعَزِیۡزُ جو کرنا چاہیے اس کی انجام دہی کے لیے۔ اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ وہ الۡعَزِیۡزُ غالب آنے والا ہے۔ الرَّحِیۡمُ جو کام بھی انجام دیتا ہے وہ اس رحمت کی بنیاد پر انجام دیتا ہے جو اللہ نے اپنے اوپر لازم گردانی ہے۔

---

[1] ۲۲ حج: ۴۷ [2] ۴۲ شوریٰ: ۵۳ [3] معالم التنزیل ذیل آیت

الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ۚ﴿۷﴾	۷۔ جس نے ہر اس چیز کو جو اس نے بنائی بہترین بنایا اور انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی۔
ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِیۡنٍ ﴿۸﴾	۸۔ پھر اس کی نسل کو حقیر پانی کے نچوڑ سے پیدا کیا۔
ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۹﴾	۹۔ پھر اسے معتدل بنایا اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دیا اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ: اللہ نے جو خلق فرمایا، وہ بہترین خلق فرمایا۔ کسی تخلیق میں کوئی نقص نہیں ہے۔ ہر مخلوق اپنی جگہ بہتر مخلوق ہے۔ ہر ایک کی تخلیق میں حکمت و مصلحت ہے:

مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ...[1] تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بدنظمی نہیں دیکھے گا۔

اللہ نے مخلوقات کو عبث اور بے نظمی میں خلق نہیں فرمایا بلکہ ایک نظام کے تحت خلق فرمایا ہے:

وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِیۡرًا ﴿۲﴾[2] جس نے ہر چیز کو خلق فرمایا پھر ہر ایک کو اپنے اندازے میں مقدر فرمایا۔

لہٰذا ہر چیز میں اللہ کی طرف سے خیر ہی خیر ہے۔ اگر شر آتا ہے تو بندے کی طرف سے آتا ہے۔ بندے نے اس خیر کو شر سے بدل دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی بھی چیز مطلق شر اور خیر نہیں ہے بلکہ خیر و شر اضافتی و نسبی ہیں۔ یہ انسان ہے جو خیر کو شر بناتا ہے۔

تلوار کی دھار کا تیز ہونا تلوار کا کمال ہے۔ اگر اس سے کسی مظلوم کا گلا کٹ جاتا ہے تو یہ تلوار کا نقص نہیں ہے، یہ انسان ہے جس نے تلوار کے کمال کو نقص میں بدل دیا۔ اسی طرح بچھو، سانپ، مگرمچھ وغیرہ میں اپنے تخلیقی اعتبار سے کوئی نقص نہیں ہے۔ ان کی خلقت میں موجود ہر چیز کی افادیت ہے۔ اگر کسی کو اس سے ضرر پہنچا ہے تو یہ شخص کی نسبت سے شر ہے، یہ نسبت اللہ کی مخلوق نہیں ہے۔ اس کی ایک اور واضح مثال پانی ہے۔ پانی کی تخلیق میں مصلحت سب کو معلوم ہے اور اس پانی کا وافر ہونا بھی بہتر ہے لیکن اگر پانی کے طوفان کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچتا ہے تو یہ اس شخص کی نسبت شر ہے۔

۲۔ وَ بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ: انسانی تخلیق میں خاکی عناصر ہی استعمال ہوئے ہیں اور یہ نہیں

---

[1] ۶۷ ملک: ۳ [2] ۲۵ فرقان: ۲

معلوم ابتدائی خلیے (Cell) کو زندگی دینے کے لیے اسے کن مراحل میں گزارا گیا۔ تاہم یہ بات قرآنی نصوص کی روشنی میں واضح ہے۔ اس خلیے میں زندگی آنے سے پہلے یہ خاک کی گود میں پلتا رہا۔

۳۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَہٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ: انسان کی خلقت کی ابتدا تو مٹی سے ہوئی لیکن اس کی نسلوں کے تسلسل کو سُلٰلَۃٍ کے ذریعے جاری رکھا۔ یعنی طین سے ابتدا ہوئی۔ سُلٰلَۃٍ سے نسل انسانی کو آگے بڑھایا۔ سُلٰلَۃٍ نچوڑ کے معنوں میں ہے۔ اس کا بظاہر یہ مطلب نکلتا ہے کہ انسانی تخلیق کی بنیاد تو ارضی عناصر، مٹی ہے لیکن اس مٹی سے نسل کو آگے بڑھانے کے لیے ایک خاص قسم کے پانی سے کام لیا گیا۔

۴۔ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ: حقیر بوند سے اس کائنات کی سب سے اہم مخلوق کی تخلیق ہوئی۔ چنانچہ اس جگہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

عَجِبْتُ لِابْنِ آدَمَ اَوَّلُهُ نُطْفَةٌ وَ آخِرُهُ جِيفَةٌ وَ هُوَ قَائِمٌ بَيْنَهُمَا وِعَاءٌ لِلْغَائِطِ ثُمَّ يَتَكَبَّرُ۔[1]	مجھے اولاد آدم پر تعجب ہے کہ اس کی ابتداء ایک بوند ہے اور اس کی عاقبت بدبودار لاش ہے۔ درمیان میں فضلہ کے لیے ایک ظرف ہے۔ پھر تکبر کرتا ہے۔

۵۔ ثُمَّ سَوّٰىہُ: پھر اسے متعدل بنایا۔ اس کے اعضا و جوارح بنائے۔ جب مادی اعتبار سے ایک معتدل حالت میں آ گیا، پھر اسے زندگی کا بار امانت اٹھانے کے قابل بنا دیا۔

۶۔ وَ نَفَخَ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِہٖ: پھر اس میں اللہ نے اپنی روح پھونک دی اور اس معتدل موجود میں اپنی امانت یعنی حیات ودیعت فرمائی۔ یہ بات اگرچہ مسلم ہے کہ مردہ مادے سے حیات پیدا نہیں ہوتی۔ حیات، حیات سے ہی پیدا ہو سکتی ہے تاہم حیات مادے کی گود میں پرورش پاتی ہے۔

مِنۡ رُّوۡحِہٖ: قابل توجہ بات یہ ہے کہ انسان کے مادی وجود کو اللہ نے مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ حقیر بوند سے تعبیر فرمایا اور بعد میں اس میں داخل ہونے والی روح کو اس قدر عزت دی کہ اسے اپنی طرف نسبت دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ روح ہی انسان ہے۔ جسم اس کے لیے ایک ظرف کی حیثیت رکھتا ہے جو پرانا ہونے پر بدلتا رہتا ہے۔

۷۔ وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ: حواس میں سماعت اور بصارت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس لیے خصوصی طور پر ان دونوں کا ذکر فرمایا: الۡاَفۡـِٕدَۃَ سے مراد عقل ہی ہو سکتی ہے جو ان سب میں اہم ترین ہے اور جس سے انسان دوسری مخلوقات پر فوقیت حاصل کرتا ہے۔

۸۔ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ: عدم شکر یہ ہے کہ ان اعضاء کو اللہ کی خوشنودی کی راہ میں استعمال نہیں کرتے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی مخلوقات میں بہتری کا پہلو پیش نظر ہے: الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ ...۔

۲۔ انسان کا مادی پہلو حقیر اور روحانی پہلو کی نسبت اللہ کی طرف ہے: مِنۡ رُّوۡحِہٖ ...۔

---

[1] وسائل الشیعۃ ۱: ۳۳۴

وَ قَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ بَلۡ ہُمۡ بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور وہ کہتے ہیں: جب ہم زمین میں ناپید ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی خلقت میں آئیں گے؟ بلکہ یہ لوگ تو اپنے رب کے حضور جانے کے منکر ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ منکرین قیامت، معاد جسمانی کو قابل قبول نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ زمین میں گم شدہ اجزاء کو اللہ دوبارہ کیسے جمع کرے گا؟ ان مشرکین کو اس وقت یہ علم نہ تھا کہ صرف مرنے کے بعد نہیں بلکہ زندگی میں بھی اس انسان کے اجزاء فضا میں بکھرتے رہتے ہیں جو کبھی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اجزاء کی صورت میں ایک درخت کا حصہ بن جاتے ہیں پھر اس درخت کے پھل میں بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ پھل ایک دوسرا انسان کھاتا ہے، اس طرح اس کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ان کو اس بات کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس دنیا کے دور و دراز علاقوں سے اٹھنے والے بادلوں کے پانی انسانی جسم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مختلف ملکوں سے آنے والی گندم، پھل دنیا بھر سے سمٹ کر آپ کے دسترخوان پر آجاتے ہیں۔ جس سے آپ کا خون، نطفہ پھر آپ کا وجود بن جاتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿۱۵﴾ [1]

کیا ہم پہلی بار کی تخلیق سے عاجز آگئے تھے؟ بلکہ یہ لوگ نئی تخلیق کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

۲۔ بَلۡ ہُمۡ بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمۡ کٰفِرُوۡنَ: وہ اللہ کی قدرت کو سمجھتے ہیں۔ درحقیقت وہ اللہ کی عدالت میں پیش ہونے اور اپنے گناہوں کا حساب دینے کے لیے حاضر نہیں ہیں۔ جیسے ہمارے معاشرے کے بے عمل لوگ عمل کی ضرورت کے قائل نہیں ہوتے۔

اہم نکات

۱۔ انسان مرنے کے بعد زمین میں گم نہیں ہوتا۔ اجزاء بکھر جاتے ہیں، معدوم نہیں ہوتے: ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ....

قُلۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿٪۱۱﴾

۱۱۔ کہہ دیجیے: موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کرتا ہے پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

---

[1] ۵۰ ق: ۱۵

تفسیر آیات

موت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم زمین میں ناپید ہو جاؤ گے بلکہ موت یہ ہے کہ فرشتہ موت تمہارے پورے وجود کو وصول کرے گا۔ یعنی جس کو ''میں''، ''تم'' اور ''ہم'' کہا جاتا ہے وہ بغیر کسی کمی بیشی کے اپنے فرشتوں کے ذریعے وصول کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ انسان کا مادی وجود، جسم تو دنیا میں بھی ہر چھ سال بعد مکمل طور پر بدلتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود انسان کی ''خودی'' نہیں بدلتی۔ انسانی جسم جن خلیوں پر مشتمل ہے ان خلیوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔ ہر روز انسان کے اربوں سیلز (cells) جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ ان کی جگہ خون تازہ خلیے تعمیر کرتا ہے۔ اس طرح ہر چھ سال بعد انسان کا پورا مادی وجود بدل جاتا ہے لیکن اس کی خودی نہیں بدلتی۔

اہم نکات

۱۔ انسان گم نہیں ہوتا، ملك الموت وصول کرتا ہے: یَتَوَفّٰىكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ ....۔

وَلَوۡ تَرٰۤی اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاكِسُوۡا رُءُوۡسِهِمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَ سَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور کاش! آپ وہ وقت دیکھ لیتے جب کافر اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے (اور کہ رہے ہوں گے) ہمارے پروردگار! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا پس ہمیں (ایک بار دنیا میں) واپس بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل بجا لائیں کیونکہ ہمیں یقین آ گیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ آج یہ لوگ قیامت کا انکار کر رہے ہیں لیکن کاش قیامت کے دن کی رسوائی کی حالت کا آپ مشاہدہ کرتے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں سرنگوں ہو کر کہیں گے:

۲۔ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَ سَمِعۡنَا: جس قیامت کو ہم جھٹلایا کرتے تھے اس کو واقع ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔

وَ سَمِعۡنَا: ہم دنیا میں ہادیان برحق کی بات نہیں مانتے تھے اب ماننے کے لیے تیار ہیں۔

۳۔ فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا: ایک بات رہتی ہے وہ ہے عمل صالح جس کے بغیر یہاں قیامت میں نجات نہیں ہے۔ ہمیں ایک موقع اور دے دیں کہ ہم عمل صالح بجا لائیں۔ اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ عمل صالح کے لیے جس یقین کی ضرورت تھی وہ بھی حاصل ہو گیا ہے لیکن انہیں یہ موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔

اہم نکات

۱۔ آج کا جرم، کل کی رسوائی ہے: نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ....۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو اس کی ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف سے فیصلہ حتمی ہو چکا ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے ضرور بھر دوں گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ کی مشیت یہ ہوتی کہ ہر شخص کو اس کی مطلوبہ ہدایت میسر آ جائے تو ایسا کر سکتا تھا مگر اس صورت میں وہ ہدایت اختیاری نہیں، جبری ہوتی جس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر اللہ کو جبری ہدایت قبول ہوتی تو سارا نظام خلقت بے مقصد ہوتا اور اس صورت میں سب کو بلا استحقاق جنت میں داخل کرنا ہوتا۔

۲۔ وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ: لیکن یہ فیصلہ حتمی ہو چکا ہے کہ دوزخ کو جن و انس سے پر کروں گا۔ وہ اس طرح کہ جب جبری ایمان قبول نہیں اور انسان کو خودمختار چھوڑا گیا ہے تو اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ ایمان لاتے ہیں اور کچھ ایمان نہیں لاتے۔ جو ایمان نہیں لاتے ان سے ہم جہنم کو پر کریں گے۔

اہم نکات

۱۔ ہدایت اختیار کی جاتی ہے مسلط نہیں کی جاتی: كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا ....۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ پس اب اس بات کا ذائقہ چکھو کہ تم نے اپنے اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا، ہم نے بھی تمہیں فراموش کر دیا ہے اور اب تم اپنے ان اعمال کی پاداش میں ہیشگی کا عذاب چکھتے رہو جو تم کیا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ آج تمہیں اس بے اعتنائی کا مزہ چکھنا ہو گا جو اس روز کے بارے میں تم نے اختیار کر رکھی تھی۔ قیامت کے بارے میں ہماری طرف سے آنے والی پے در پے ہدایات سے بے اعتنائی برتنے کا لازمی نتیجہ یہ

ہو گا کہ آج تم سے بے اعتنائی برتی جائے گی۔ ہمارے بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ابدی عذاب چکھنا ہو گا۔

۲۔ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: یہ ابدی عذاب ہم سے نہیں، خود تمہارے برے اعمال کی طرف سے تمہیں مل رہا ہے۔

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ ﴿١٥﴾

۱۵۔ ہماری آیات پر صرف وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جب انہیں یہ آیات سمجھا دی جاتی ہیں تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی ثناء کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

السجدۃ الواجبۃ

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا: آیات الٰہی پر ایمان کے لیے وہ لوگ آمادہ ہوتے ہیں جو نصیحت آشنا ہوتے ہیں۔ جب اللہ کی ربوبیت کی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں تو ان دلیلوں کے سامنے ان کے دل جھک جاتے ہیں اور ان دلیلوں کا ان کے دلوں پر اثر ہوتا ہے۔

۲۔ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ: دوسری صفت ان کی یہ ہے کہ وہ اللہ کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی ربوبیت کو ان دلائل کی روشنی میں سمجھ جاتے ہیں۔ نتیجتاً اللہ کی تنزیہ کرتے اور اللہ کو ان تمام اوہام سے پاک قرار دیتے ہیں مشرکین جن کی نسبت اللہ کی طرف دیتے ہیں۔

۳۔ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ: ان کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کی بندگی میں تکبر نہیں کرتے۔ اللہ کی کبریائی کے مقابلے میں اپنی کسی حیثیت کے قائل نہیں ہوتے۔

واضح رہے اس آیت کی تلاوت پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ آیات الٰہی کا اثر، سجدہ گزاروں پر ہوتا ہے: اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا ....

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۫ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿١٦﴾

۱۶۔ (رات کو) ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ تَتَجَافٰی جُنُوۡبُهُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ: ان کی چوتھی صفت یہ ہے کہ جب لوگ سو رہے ہوتے ہیں اس وقت یہ لوگ عبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔

روایات میں آیا ہے کہ وہ بستروں سے الگ ہوتے ہیں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سوتے نہیں ہیں۔ سونا اس جسم کی ایک ضرورت ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ رات کے ابتدائی حصے میں سوتے ہیں۔ جب رات کے دو حصے گزر جاتے ہیں تو یہ اٹھ جاتے ہیں اور عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ نماز تہجد پڑھنے والوں کی طرف اشارہ ہے۔

یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا: ان کی پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ خوف و امید کے درمیان ہوتے ہیں۔ وہ امید کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں اور خوف کی وجہ سے محرمات سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان میں بندگی کا سلیقہ موجود ہے اور ان میں یہ شعور ہے کہ اللہ کی بندگی خوف و امید کے درمیان میں ہوتی ہے۔ بے خوفی میں بندگی ہوتی ہے اور نہ ناامیدی میں۔

وَّ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ: ان کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ فیاض ہوتے ہیں۔ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث میں مؤمن کے بیس اوصاف بیان فرماتے ہوئے فرمایا:

رُھْبَانٌ بِاللَّیْلِ اُسُدٌ بِالنَّھَارِ....[۱] وہ رات کے عابد اور دن کے شیر ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ رات کو عبادت کرنے والوں اور خوف و امید کے درمیان بندگی کرنے والوں پر ہی آیت الٰہی کا اثر ہوتا ہے: تَتَجَافٰی جُنُوۡبُهُمۡ ... یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ ....۔

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے صلے میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پردہ غیب میں موجود ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جنت کی زندگی اور وہاں کی نعمتوں کا اس دنیا کی زندگی اور اس دنیا کی نعمتوں کے ساتھ موازنہ نہیں ہوسکتا۔ وہاں کی زندگی کا نظام وہ نہیں ہوگا جو یہاں ہے۔ ہم انسان صرف ان چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں

---
[۱] الکافی ۲: ۲۳۲

جن کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے۔ اگر ہم نے پانی کو نہ دیکھا ہوتا تو ہم نہیں سمجھ سکتے تھے کہ پانی کیا چیز ہے۔ اس لیے جنت کی نعمتوں کے بارے میں روایت میں بھی یہی مطلب بیان ہوا ہے۔

رسول خدا ﷺ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رات و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر ....[1]	میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ ثواب آمادہ کر رکھا ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا، نہ کسی کان نے سنا ہوگا، نہ کسی انسان کے دل نے تصور کیا ہوگا۔

۲۔ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ: جو ان کے لیے پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ اسی لیے پوشیدہ ہے کہ اس کا تصور نہیں ہوسکتا۔ نہ اس کا وصف و بیان ہوسکتا ہے چونکہ ہمارا دنیوی ذہن ان چیزوں کو اپنے تصور میں نہیں لا سکتا۔

۳۔ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ: آنکھوں کی ٹھنڈک۔ اس سے مراد انتہائی مسرت ہے۔ کہتے ہیں خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

> ہر کار خیر کا ثواب قرآن میں بیان ہوا ہے سوائے تہجد کے۔ اس کے ثواب کی عظمت کی وجہ سے اس کے ثواب کا ذکر نہیں فرمایا۔

اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ ﴿۱۸﴾	۱۸۔ بھلا جو مومن ہو وہ فاسق کی طرح ہوسکتا ہے؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

وقف غفران

تفسیر آیات

مومن وہ ہے جو اپنے ایمان کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ ایمان کا تقاضا ہے اپنے مولا کی بندگی کے دائرے میں رہنا۔ فاسق وہ ہے جو اس دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے ترازو میں ان دونوں کا یکساں ہونا ممکن نہیں ہے۔

فضائل: اگرچہ یہ سورہ مکی ہے لیکن شیعہ سنی مصادر میں کثرت سے یہ روایت موجود ہے کہ یہ آیت علی بن ابی طالب علیہما السلام اور ولید بن عقبہ کے درمیان موازنہ کے بارے میں میں نازل ہوئی ہے۔ ان روایات کی روشنی میں آیت مدنی ہو جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اور ولید بن عقبہ کے درمیان کسی بات میں تکرار ہوئی تو ولید بن عقبہ نے حضرت علی علیہ السلام کو کہا:

---

[1] بحار الانوار ۸: ۹۲

خاموش ہو جا تو ابھی بچہ ہے۔ میں تم سے زیادہ زبان اور نیزہ زنی میں تیز تر ہوں۔ تجھ سے زیادہ شجاع اور لشکر میں زیادہ نمایاں ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

خاموش ہو جا۔ تو تو فاسق ہے۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ملاحظہ ہو: بغوی معالم التنزیل۔ نووی مراج لبید۔ ابن عطیه المحرر۔ بغدادی لباب التاویل۔ ثعلبی الکشف و البیان۔ میبدی کشف الاسرار۔ زمخشری: الکشاف۔ واحدی اسباب النزول۔ حسکانی شواهد التنزیل۔ ابن جوزی زاد المسیر۔ آلوسی روح البیان۔ قرطبی الجامع لاحکام القرآن۔ طبری جامع البیان۔ مظهری تفسیر مظهری۔ ابن کثیر تفسیر القرآن۔ سمرقندی بحر العلوم۔ اندلسی البحر المحیط۔ مقاتل التفسیر۔

اس روایت کی اسناد و طرق کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حواشی تفسیر شواهد التنزیل مطبوعہ وزارت ارشاد اسلامی ایران۔

واضح رہے یہ ولید بن عقبہ ہے جس کے خلاف یہ آیت نازل ہوئی:

اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا....[۱] اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو۔

جب ولید کو بنی مصطلق کی طرف زکوۃ کی وصولی کے لیے بھیجا گیا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ غلط خبر دی کہ بنی مصطلق مرتد ہو گئے اور زکوۃ دینے سے منکر ہیں۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ولید کو فاسق کہا ہے۔

ابن عبد البر نے کہا ہے:

قرآنی علوم کے حامل لوگوں میں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ آیہ اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ .... ولید کے بارے میں نازل ہوئی۔[۲]

یہی ولید ہے کہ جب یہ کوفہ کا گورنر تھا تو شراب پی کر صبح کی نماز چار رکعت پڑھائی اور کہا: مزید پڑھاؤں اور محراب میں شراب کی الٹی کی۔

اسی ولید سے حضرت امام حسن علیہ السلام نے فرمایا:

کیف تشتم علیا و قد سماه الله مؤمنا فی عشر ایات و سماك فاسقاً۔[۳] تو علی کو دشنام کیسے دے رہا ہے جبکہ علیؑ کو اللہ نے دس آیات میں مؤمن اور تجھے فاسق کہا ہے۔

---

[۱] ۴۹ حجرات: ۶　[۲] روح المعانی ذیل آیہ　[۳] الکشاف ۳: ۵۲۵

اہم نکات

۱۔ مؤمن اور فاسق میں امتیاز کرنا ضروری ہے کہ ان دونوں کو برابر سمجھنا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے: اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا...۔

اَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَہُمۡ جَنّٰتُ الۡمَاۡوٰی ۫ نُزُلًۢا بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴿۱۹﴾

۱۹۔ مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے جنتوں کی قیام گاہیں ہیں، یہ ضیافت ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ انجام دیا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں ایک کلیہ بیان فرمایا کہ مؤمن اور فاسق برابر نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد مؤمن اور فاسق کے بارے میں تفصیل کا بیان ہے:

جو لوگ ایمان کے ساتھ عمل صالح بجا لاتے ہیں ان کی ضیافت جنۃ الماوی میں ہو گی۔ جنت میں کئی جنتیں ہیں جنہیں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ جنۃ الفردوس، جنۃ عدن، جنت نعیم اور خصوصی طور پر جنت الماوی کا ذکر ہے جو سدرۃ المنتھی کے پاس ہے:

عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی ؕ عِنۡدَہَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی ؕ[۱]

سدرۃ المنتھیٰ کے پاس، جس کے پاس ہی جنۃ الماویٰ ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

عَلَیۡکُمۡ بِلُزُومِ الۡیَقِینِ و التَّقۡوَیٰ فَاِنَّہُمَا یُبَلِّغَانِکُمۡ جَنَّۃَ الۡمَاۡوَیٰ۔[۲]

تم یقین اور تقویٰ کو اپناؤ یہ دونوں تمہیں جنۃ الماوی پہنچانے والے ہیں۔

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡا فَمَاۡوٰىہُمُ النَّارُ ؕ کُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡہَاۤ اُعِیۡدُوۡا فِیۡہَا وَ قِیۡلَ لَہُمۡ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ

۲۰۔ لیکن جنہوں نے نافرمانی کی ان کی جائے بازگشت آتش ہے، جب بھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا: اس آتش کا عذاب چکھو جس کی تم تکذیب

---

[۱] ۵۳ نجم: ۱۴۔ ۱۵ [۲] مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۰۰

تُكَذِّبُوْنَ ⑳　　کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس آیت سے فسق کی نوعیت معلوم ہوتی ہے کہ یہ فسق ایمان کے مقابلے میں کفر کی حد تک ہے۔ اسی لیے ایسے فاسقوں کے لیے جہنم کا عذاب ابدی ہے۔

۲۔ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا: اس جملے سے معلوم ہوا کہ وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔

۳۔ وَ قِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا: ان سے کہا جائے گا: آتش کا مزہ چکھو۔ اس میں عذاب کے ساتھ ان کی اہانت بھی ہے۔

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ㉑

۲۱۔ اور ہم انہیں بڑے عذاب کے علاوہ کمتر عذاب کا ذائقہ بھی ضرور چکھائیں گے شاید وہ باز آ جائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى: کمتر عذاب سے مراد دنیوی مصائب، بیماریاں اور ناکامیاں ہیں۔ اس کمتر عذاب اور محرومیوں سے انسانی ضمیر جھنجھوڑا اور وجدان کو بیدار کیا جاتا ہے۔ اس سے اگر قابل ہدایت ہے تو وہ راہ راست پر واپس آتا ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۭ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ㉒ ع

۲۲۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جسے اس کے رب کی نشانیاں سمجھا دی گئی ہوں پھر وہ ان سے منہ موڑ لے؟ ہم مجرموں سے ضرور بدلہ لینے والے ہیں۔

تفسیر آیات

جسے آیات و معجزات کے ذریعے حق کی بات سمجھا دی گئی ہو، اس پر حجت پوری ہو گئی ہو، جیسے قوم صالح، اس کے باوجود وہ ان معجزات کو تسلیم نہ کرے تو اللہ اس سے انتقام لیتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام ہر مطالبے پر معجزہ پیش نہیں کرتے کیونکہ اگر معجزات کے بعد بھی ایمان نہ لائیں تو اللہ فوری انتقام لیتا ہے۔ اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ آیات الٰہی یعنی معجزات کے ذریعے حق

واضح ہونے کے بعد انکار کیا جائے تو انتقام الٰہی کی نوبت آتی ہے۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ فَلَا تَکُنۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآئِہٖ وَ جَعَلۡنٰہُ ھُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب دی ہے لہٰذا آپ اس (قرآن) کے ملنے میں کسی شبہے میں نہ رہیں اور ہم نے اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت (کا ذریعہ) بنایا۔

تفسیر آیات

ا۔ فَلَا تَکُنۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآئِہٖ: یہ قرآن کا طرز خطاب ہے کہ جسے بہت زیادہ اہمیت دینا مقصود ہو وہاں خطاب براہ راست اپنے رسولؐ سے ہوتا ہے اور بتانا دوسروں کو مقصود ہوتا ہے۔

لِّقَآئِہٖ میں ضمیر الکتاب کی طرف ہے اور لقاء، تلقی کے معنوں میں ہے۔ جیسے کِتٰبًا یَّلۡقٰىہُ مَنۡشُوۡرًا میں ہے۔ یعنی ہم نے جیسے موسیٰ کو کتاب دی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی کتاب دی ہے۔ لہٰذا آپ کو اس کتاب "قرآن" کے ملنے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس لیے ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپؑ کی بہت سی خصوصیات ملتی ہیں۔

وَ جَعَلۡنَا مِنۡھُمۡ اَئِمَّۃً یَّھۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ۟ؕ وَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اور جب انہوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھے ہوئے تھے تو ہم نے ان میں سے کچھ لوگوں کو امام بنایا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

ہر امت میں ایک جماعت کو امامت کا عہدہ صبر و یقین کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ علم کی وجہ سے صبر اور یقین کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتے ہیں اور عصمت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد امامت کی منزل پر فائز ہو جاتے ہیں۔

امامت کے موضوع پر سورہ بقرہ آیت ۱۲۴، سورہ انبیاء آیت ۷۳ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے: یہ آیت نزلت فی ولد فاطمہ۔ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی اولاد کے بارے میں نازل ہوئی۔ ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفۡصِلُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ یقیناً آپ کا رب قیامت کے دن ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ سنا دے گا جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

تفسیر آیات

یہاں اختلاف سے مراد وہ اختلاف ہے جو کسی دلیل و سند پر مبنی نہ ہو بلکہ علم و سند کو پس پشت ڈال کر اختلاف کرتے ہیں:

فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَهُمۡ ...[1]

تو انہوں نے اپنے پاس علم آ جانے کے بعد آپس کی ضد میں آ کر اختلاف کیا۔

اللہ قیامت کے دن ان اختلافات کا فیصلہ سنائے گا جو علم آنے کے بعد آپس کی ضد میں آ کر کیے ہیں۔

اَوَلَمۡ يَهۡدِ لَهُمۡ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ يَمۡشُوۡنَ فِيۡ مَسٰكِنِهِمۡ ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ کیا انہیں اس بات سے ہدایت نہیں ملی کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے جن کی قیام گاہوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں، تحقیق اس میں نشانیاں ہیں، تو کیا یہ لوگ سنتے نہیں؟

تفسیر آیات

کیا ان مشرکوں کو اس بات سے عبرت حاصل نہیں ہوتی کہ انبیاء علیہم السلام کے منکرین قوم عاد، قوم ثمود کے رہائشی مکانوں سے ان کا ہمیشہ شام جاتے ہوئے گزر ہوتا ہے اور ان کی تباہی کا منظر دیکھتے جاتے ہیں۔

اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ: ان قوموں کی تباہی میں انبیاء علیہم السلام کے برحق ہونے پر قطعی دلائل ہیں، اگر کسی کے پاس ان دلائل کو سننے کی صلاحیت ہے۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَى الۡاَرۡضِ الۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا تَاۡكُلُ مِنۡهُ اَنۡعَامُهُمۡ وَاَنۡفُسُهُمۡ ؕ اَفَلَا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾ الثلثة

۲۷۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم بنجر زمینوں کی طرف پانی روانہ کرتے ہیں پھر اس سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے جانور بھی کھاتے ہیں اور خود بھی، تو کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں؟

[1] ۴۵ جاثیۃ: ۱۷

تشریح کلمات

الۡجُرُزِ : (ج ر ز) وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہوتا ہو۔ بنجر زمین۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ: اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور مربیت پر اس دلیل کا یہ لوگ مشاہدہ نہیں کرتے کہ ہم ہی پانی سے لدے ہوئے بادلوں کو ہوا کے ذریعے غیر آباد زمینوں کی طرف چلاتے ہیں۔

۲۔ فَنُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا: اور ہم ہی اس پانی سے زمین میں روئیدگی پیدا کرتے اور لہلہاتے کھیت وجود میں لاتے ہیں۔ مختلف گھاس و سبزہ اگاتے ہیں جس سے انسان کے لیے ذریعۂ معاش جانوروں کا چارہ بنتا ہے اور خود انسان کے لیے روزی پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ اَفَلَا یُبۡصِرُوۡنَ: اس منظر کو روز دیکھتے ہو پھر بھی کہتے ہو کہ تمہاری زندگی کی تدبیر اور تمہاری معیشت کا انتظام اللہ کے علاوہ کوئی اور کرتا ہے۔

وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو (بتاؤ) یہ فیصلہ کب ہوگا؟

قُلۡ یَوۡمَ الۡفَتۡحِ لَا یَنۡفَعُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِیۡمَانُہُمۡ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ کہدیجیے: فیصلے کے دن کفار کو ان کا ایمان لانا فائدہ نہ دے گا اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔

تفسیر آیات

۱۔ یَوۡمَ الۡفَتۡحِ: سے مراد بعض نے یوم بدر اور بعض نے فتح مکہ اور بعض نے روز قیامت لیا ہے۔ اور جملہ لَا یَنۡفَعُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِیۡمَانُہُمۡ کافروں کو اس دن ایمان لانا فائدہ نہیں دے گا کو قرینہ قرار دیتے ہیں کہ اس سے مراد قیامت ہے چونکہ دنیا میں تو ایمان فائدہ دیتا ہے۔

یَوۡمَ الۡفَتۡحِ سے مراد فتح مکہ لینے کی صورت میں بعض ایمان سے مراد امان لیتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد ملنے والی امان انہیں عذاب سے نہیں بچا سکتی اور بعض یہ لکھتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر جو لوگ قتل ہو گئے ہیں ان کے لیے ان کا ایمان فائدہ نہیں دیتا جیسا کہ فرعون کا ایمان اس کے لیے فائدہ مند نہیں رہا تھا جب وہ غرق ہو رہا تھا۔

لفظ فتح قرآن مجید میں فتح و غلبہ کے معنوں میں کثرت سے استعمال ہوا ہے:

فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰہِ ...[1]　　اگر اللہ کی طرف سے تمہیں فتح حاصل ہو۔

فَافۡتَحۡ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَہُمۡ فَتۡحًا ...[2]　　پس تو ہی میرے اور ان کے درمیان حتمی فیصلہ فرما۔

مسلمان جب مشرکین کی طرف سے ظلم و ستم سہتے تھے تو اس وقت اللہ کی طرف سے ملنے والی فتح و نصرت اور غلبہ کا ذکر کیا کرتے تھے اور قرآن بھی ہمیشہ انہیں گذشتہ اقوام کے انجام بد اور انبیاء علیہم السلام کی فتح و نصرت کی خبریں بھی اسی غرض سے سناتا رہا ہے تو مشرکین مسلمانوں سے تمسخر کے طور پر کہا کرتے تھے: مَتٰی ہٰذَا الۡفَتۡحُ۔ یہ فتح جس کی تم روز ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو کب آنے والی ہے؟ میں ہٰذَا کا اشارہ اسی فتح کی طرف ہوسکتا ہے جس کا مسلمان ذکر کیا کرتے تھے۔ والعلم عند اللّٰہ۔

فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ انۡتَظِرۡ اِنَّہُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۳۰﴾ ع　　۳۰۔ ان سے منہ پھیر لیں اور انتظار کریں، یقیناً یہ بھی انتظار کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ: کافروں کی طرف سے تکذیب و توہین اس قابل نہیں کہ ان چیزوں کو درخور اعتنا سمجھیں۔ فَاَعۡرِضۡ سے مراد ان کے عمل سے بے اعتنائی برتنا ہے۔

۲۔ وَ انۡتَظِرۡ: اپنے رب کی طرف سے فتح و نصرت کا انتظار فرمائیں۔ یہ جملہ بھی ایک قرینہ ہے کہ یَوۡمَ الۡفَتۡحِ سے مراد دنیوی فتح و نصرت ہے۔

۳۔ اِنَّہُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ: یہ مشرکین بھی آپ کی ناکامی کا انتظار کر رہے ہیں یا یہ لوگ عذاب قیامت کے انتظار میں ہیں۔

---

[1] ۴ نساء: ۱۴۱　[2] ۲۶ شعراء: ۱۱۸

فہرست مطالب

سورۃ الفرقان

تعارف سورۃ ____ ۹

قرآن تمام عالم کے لیے تنبیہ کرنے والی کتاب ہے۔ اس آیت میں مستشرقین کی رد ہے ____ ۱۱

ہر شے کی تخلیق کے بعد اس کی تقدیر بھی بنائی ہے ____ ۱۲

معبود وہ ہے جو خالق، مالک ہو اور موت و حیات جس کے ہاتھ میں ہو ____ ۱۳

قرآن کے بارے میں کافروں کا نامعقول اعتراض ____ ۱۳

دشمن کی زبان سے عصر مکہ سے ہی قرآن کی تدوین کا اعتراف ____ ۱۵

رسولؐ کے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر اعتراض اور یہ سوال اٹھایا کہ رسولؐ کے پاس خزانے اور باغات کیوں نہیں ہیں؟ ____ ۱۶

الٰہی منصب ناز و نعمت میں نہیں کڑی آزمائش میں ہے۔ اسی لیے دین کی امانت کو غریبوں نے قبول کیا، مفاد پرستوں نے نہیں ____ ۱۷

جہنم کافروں کو شعور کے ساتھ قصداً جلا دیتی ہے ____ ۱۸

جنتی کی خوشنودی اللہ کی خوشنودی کے تابع ہو گی اور جنتی کا ارادہ نافذ ہوگا ____ ۲۰

دین کی بنیاد آزمائشوں میں ہے آسائشوں میں نہیں ____ ۲۳

کافروں پر فرشتے عذاب لے کر اتریں گے ____ ۲۴

کافر قیامت کے دن ندامت کریں گے کہ گمراہ کن لوگوں کو اپنا دوست کیوں بنایا تھا ____ ۲۷

ہر نبی کا ایک دشمن ہوا کرتا ہے ____ ۲۹

قرآن کے تدریجی نزول کی حکمت ____ ۳۰

انزال اور تنزیل میں فرق ____ ۳۱

موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے مبعوث ہونے کا ذکر ____ ۳۲

اصحاب رَس کا ذکر ____ ۳۳

خواہش پرستوں کے حواس کام نہیں کرتے ۳۶

دھوپ اور سایہ تدبیر الٰہی کے ستون ____ ۳۷

لیل ونہار اور خواب بھی تدبیری ستون ہیں ۳۸
ہوا اور پانی کا تدبیری کردار ۳۹
نسب اور دامادی (مرد وزن) کی تخلیق
بقائے حیات کی ضمانت ہے ۴۱
رب کا راستہ اختیار کرنا اجر رسالت ہے ۴۳
گردش لیل ونہار اللہ کی تدبیری نشانی ہے ۴۶
اللہ کے بندے وقار سے چلتے ہیں اور
بدتہذیبوں سے نہیں الجھتے ۴۷
مؤمن اسراف اور بخل کے درمیان اعتدال
میں رہتا ہے ۴۹
مؤمن شرک، ناحق قتل اور زنا کا
مرتکب نہیں ہوتا ۵۰
مؤمن جھوٹی گواہی نہیں دیتا اور
لغویات سے بچتا ہے ۵۲
اولاد وازواج اور تقویٰ کے بارے
میں مؤمن کی دعا ۵۳
آیت ۷۴ کا اہل بیت کی شان میں نزول ۵۳
درج بالا اوصاف کے حامل مؤمن کا اجر ۵۴
دعوت حق مطلوب نہ ہوتا تو اللہ
انسان کو اہمیت نہ دیتا ۵۵

سورۃ الشعراء

تعارف سورۃ ۵۹
لوگوں کے ایمان نہ لانے پر
رسولؐ کی دل جوئی ۶۲
ایمان وہ ہے جس کے سامنے
دل جھک جائے، نہ گردن ۶۲
رازق اور خالق ناقابل تفریق ہے ۶۴
حضرت موسیٰؑ کا ذکر ۶۵
حضرت موسیٰؑ اور فرعون روبرو ۶۷
معجزہ عصا کا مظاہرہ، فرعون کی طرف
سے جادو کا الزام ۷۲
فرعون جادوگروں کو جمع کرتا ہے ۷۳
فرعون کے جادوگروں کا جادو ناکام ہو
جاتا ہے اور جادوگر ایمان لے آتے ہیں ۷۴
حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر
مصر سے نکلتے ہیں اور فرعون تعاقب کرتا ہے ۷۶
حضرت موسیٰؑ کے لیے سمندر شق ہوتا ہے
اور فرعون اور فرعونی غرق ہو جاتے ہیں ۷۹
حضرت ابراہیمؑ کی بت پرستی
کی بیہودگی پر سوالات ۸۲
حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے
اللہ کی ربوبیت پر شواہد کا ذکر ۸۳
دعائے ابراہیمؑ ۸۵
قیامت کے دن مال و اولاد فائدہ مند نہیں
ہوں گی مگر یہ کہ قلب سلیم لے کر آئے ۸۸
تقویٰ والوں کے لیے جنت نزدیک کی
جائے گی اور گمراہوں کے لیے جہنم
نمودار ہو جائے گی ۸۹
جہنمی آپس میں لڑیں گے ۹۰
اہل بیت کی اپنے شیعوں کے لیے
شفاعت دیکھ دوسرے لوگ حسرت
کا اظہار کریں گے ۹۴
حضرت نوحؑ کا ذکر ۹۳

قوم عاد کا ذکر ________ ۹۷
حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر ________ ۱۰۲
ناقہ صالح کی کونچیں کاٹنے پر
عذاب کا نزول ________ ۱۰۵
قوم لوط اور اس قوم کی ہم جنسی کا ذکر ________ ۱۰۶
قوم لوط کی تباہی کا ذکر ________ ۱۰۹
حضرت شعیب علیہ السلام اور قوم ایکہ
کی تباہی کا ذکر ________ ۱۱۲
وحی، رسولؐ کے قلب پر علم حضوری
کے طور پر نازل ہوتی ہے ________ ۱۱۳
قرآنی تعلیمات کی صداقت کو بنی اسرائیل
کے علماء جانتے تھے ________ ۱۱۵
کلام الٰہی میں ایسے شواہد موجود ہیں کہ
یہ اللہ کا کلام ہے ________ ۱۱۹
رسولؐ کو اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت
دینے کا حکم ________ ۱۲۰
آیت کا شان نزول ________ ۱۲۱
دعوت ذوالعشیرۃ کے موقع پر حضرت علی علیہ السلام
کی وصایت اور خلافت کا اعلان ________ ۱۲۲
حدیث دعوت ذوالعشیرہ کی
مختلف عبارتوں کا ذکر ________ ۱۲۳
حدیث کی تحریف ________ ۱۲۳
آیت کی تحریف ________ ۱۲۳
روایات تحریف۔ شیعہ اور غیر شیعہ
موقف میں نمایاں فرق ________ ۱۲۴
خلافت علوی کے اعلان پر ایک اعتراض
اور اس کا جواب ________ ۱۲۴
رسولؐ کے لیے مؤمنین کے ساتھ تواضع
کا حکم ________ ۱۲۵
ساجدین میں نشست و برخاست کی
تین تفسیروں کا ذکر ________ ۱۲۷
ان لوگوں کا ذکر جن پر شیاطین
نازل ہوتے ہیں ________ ۱۲۸
شاعروں کی پیروی کا ذکر ________ ۱۲۹
اہل ایمان شاعر کی تعریف ________ ۱۳۰

سورۃ النمل

تعارف سورہ ________ ۱۳۵
قرآن کے اہم اوصاف کا ذکر ________ ۱۳۷
ایمان نہ لانے سے بصیرت
ختم ہو جاتی ہے ________ ۱۳۸
قرآن ذات حکیم و علیم کا عطیہ ہے ________ ۱۳۹
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا گھر کی
طرف واپسی کا ذکر ________ ۱۴۰
درخت کے ذریعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
پر وحی کا نزول ________ ۱۴۱
عصائے موسیٰ کو اژدھے میں
بدلنے کا معجزہ ________ ۱۴۳
ید بیضاء کا معجزہ ________ ۱۴۴
معجزات سے یقین حاصل ہونے
کے باوجود ایمان نہ لائے ________ ۱۴۵
حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کا ذکر ________ ۱۴۵
حضرت سلیمان، حضرت داؤد علیہما السلام
کے وارث بنے ________ ۱۴۶

آیت سے میراث
حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کا اثبات ___ ۱۴۷
حضرت سلیمانؑ کے لیے جنات اور
پرندے مسخر تھے ___ ۱۵۱
حضرت سلیمان اور چیونٹی کا کلام ___ ۱۵۳
حضرت سلیمانؑ کا ہدہد کے ساتھ واقعہ ۱۵۵
ہدہد کا ملک سبا کی خبر لانے کا ذکر ___ ۱۵۷
ہدہد کا حضرت سلیمانؑ کا خط ملکہ سبا
کو پہنچانے کا ذکر ___ ۱۵۸
ملکہ سبا خط کے مضمون سے درباریوں
کو آگاہ کرتی ہے ___ ۱۵۹
ملکہ درباریوں کی رائے طلب کرتی ہیں اور
درباری حضرت سلیمانؑ کا
مقابلہ کرنے کی رائے دیتے ہیں ___ ۱۶۱
ملکہ مقابلے کی رائے مسترد کرتی ہے
اور لالچ کا ذریعہ استعمال کرتی ہے ___ ۱۶۲
حضرت سلیمانؑ لالچ میں آئے بغیر
مقابلہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں ___ ۱۶۳
کتاب کا علم رکھنے والا تخت بلقیس کو چشم
زدن میں پیش کرتا ہے ___ ۱۶۶
ملکہ اپنے تخت کو تغییر کے باوجود
پہچان لیتی ہے ___ ۱۶۷
ملکہ سلیمانؑ کے دین میں داخل ہوتی ہے ۱۶۹
حضرت صالحؑ اور قوم ثمود کا ذکر ___ ۱۶۹
قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کو قتل
کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ
نے اس قوم کو تباہ کر دیا ___ ۱۷۳

حضرت لوطؑ ۔ قوم لوط کی تباہی کا ذکر ۱۷۵
معبود صرف اللہ ہونے کے
چند ایک شواہد کا ذکر ___ ۱۷۶
۱۔ آسمانوں اور زمین کا خالق ہونا
۲۔ اور پانی سے زمین کو شاداب کرنا ___ ۱۷۷
۳۔ زمین میں وسائل زندگی فراہم کرنا ___ ۱۷۸
۴۔ مضطرب الحال کی فریاد سننا ___ ۱۷۹
۵۔ زمین میں انسانوں کو جانشین کرنا ___ ۱۷۹
۶۔ سمندر اور خشکی میں راہنمائی کرنا ___ ۱۸۰
۷۔ ہواؤں کو بارش اور
رحمت خدا کی خوشخبری دینے والی بنانا ___ ۱۸۰
۸۔ خلق اور اعادۂ خلق کرنا ___ ۱۸۱
۹۔ آسمان اور زمین سے رزق فراہم کرنا ۱۸۱
۱۰۔ آسمانوں اور زمین کی موجودات
کا علم غیب حاصل ہونا ___ ۱۸۲
مشرکین کی طرف سے دوسری
زندگی کا انکار اور اس کا جواب ___ ۱۸۴
مشرکین کہتے تھے: ہم پر عذاب آنا ہے
تو کب آئے گا ___ ۱۸۵
عذاب آنے والا ہے۔ مہلت کافر کے لیے
عذاب اور مؤمن کے لیے رحمت ہے ___ ۱۸۶
رسولؐ سے فرمایا: آپ ناقابل ہدایت لوگوں
کی ہدایت نہیں کر سکتے ___ ۱۸۹
جب عذاب اٹل ہوگا تو دابة الارض
نکل آئے گا۔ دابة الارض کی تشریح ___ ۱۹۱
ہر امت سے ایک فوج کا
کیا مطلب ہے؟ ___ ۱۹۳

لیل و نہار میں پوشیدہ حکمت اللہ کی
تدبیری آیات ہیں ________ ۱۹۵
نفخ صور کا ذکر ________ ۱۹۶
قیامت کے دن پہاڑ خاک ہو کر بادلوں
کی طرح فضا میں منتشر ہو جائیں گے _ ۱۹۷
جو نیکی لے کر آئے اسے
قیامت کے ہولنا کیوں سے امن ملے گا۔
اس نیکی کی تفسیر ________ ۱۹۸
رسولؐ کے لیے خصوصی حکم ________ ۱۹۹
اللہ کی ربوبیت کی نشانی آنے والی ہے _ ۲۰۰

سورۃ القصص

تعارف سورۃ ________ ۲۰۵
موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا ذکر ________ ۲۰۶
آخر میں مظلوم لوگ زمین
کے وارث ہوں گے ________ ۲۰۷
مادر موسیٰ کو حکم ملتا ہے کہ موسیٰ
کو دریا میں ڈال دے ________ ۲۱۱
فرعون والے موسیٰ علیہ السلام کو دریا
سے اٹھاتے ہیں ________ ۲۱۲
موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کی گود میں
واپس آتے ہیں ________ ۲۱۵
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رشید ہونے
پر حکمت اور علم عطا ہوا ________ ۲۱۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں
ایک فرعونی قتل ________ ۲۱۷
فرعون کے درباریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے قتل کا منصوبہ بنایا ________ ۲۲۱
حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلتے ہیں __ ۲۲۲
حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین پہنچ جاتے ہیں دو
خواتین کے جانوروں کو پانی پلاتے ہیں _ ۲۲۴
ان میں ایک خاتون آ کر کہتی ہے
میرے بابا آپ کو بلا رہے ہیں
حضرت شعیب علیہ السلام نے خوشخبری دی
آپ کو ظالموں کا اب کوئی خوف نہیں
ہے ان دو لڑکیوں میں سے ایک
سے حضرت موسیٰ کی شادی ہو جاتی ہے آٹھ
یا دس سال خدمت کے معاوضے میں __ ۲۲۹
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر واپس جاتے
ہوئے کوہ طور پر روشنی نظر آتی ہے __ ۲۳۰
روشنی کے پاس سے موسیٰ علیہ السلام پر
وحی نازل ہونا شروع ہو گئی ________ ۲۳۱
یہاں عصا اور ید بیضاء کے معجزات
کا مظاہرہ ہوتا ہے ________ ۲۳۳
حضرت ہارون علیہ السلام کو شریک رسالت
کرنے کی درخواست کی قبولیت ____ ۲۳۵
فرعون معجزات موسیٰ کو جادو قرار دیتا ہے ۲۳۶
فرعون پکی اینٹ سے اونچا محل بنانے کا حکم
دیتا ہے تاکہ وہ موسیٰ کے خدا کو دیکھ لے ۲۳۷
پختہ اینٹ کی تاریخ پانچ ہزار قبل مسیح قدیم ہے
اس پر اعتراض بالکل غلط ہے ____ ۲۳۸
فرعونیوں کے تکبر کے نتیجے میں
ان کو غرق کر دیا گیا ________ ۲۳۹
فرعون جہنم کی طرف راہنمائی

کرنے والا رہنما بن گیا ________ ۲۳۹
رسول اللہؐ حضرت موسیٰ علیہ السلام
واقعات ایسے بیان کر رہے ہیں جیسے
آپ وہاں موجود تھے۔ یہ وحی نہ ہو
تو کیسے ممکن ہوا؟ ________ ۲۴۱
اگر ہم نبی نہ بھیجتے تو یہ لوگ ضرور کہتے کہ
اگر کوئی نبی آتا تو ہم اس پر
ایمان لے آتے ________ ۲۴۴
جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے تو کہتے ہیں
موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کی طرح معجزہ کیوں نہیں
دکھاتے۔ جواب: کیا موسیٰ علیہ السلام
معجزوں کو لوگوں نے قبول کیا ______ ۲۴۴
کچھ اہل کتاب ایمان لے آئے ہیں
ان کو دوگنا اجر ملے گا ________ ۲۴۷
عدم ایمان ابوطالب پر آیت ۵۶
سے استدلال اور اس کا جواب _____ ۲۴۹
عدم ایمان ابو طالب کی روایات کی رد _ ۲۵۲
حدیث ضحصاح کی رد ________ ۲۵۳
ایمان ابوطالب علیہ السلام کے شواہد ______ ۲۵۴
بستر رسولؐ پر ____________ ۲۵۵
شامی راہب (بحیرہ) کا واقعہ ______ ۲۵۵
عہد نامہ قریش کو دیمک کھا جاتی ہے __ ۲۵۶
قریش کے لیے ابوطالب علیہ السلام کی وصیت _ ۲۵۶
ابوطالب علیہ السلام کے لیے استغفار ______ ۲۵۷
ابو طالب علیہ السلام کے ایمان کا منکر جہنمی
اور ان سے بغض رکھنے والا کافر ہے __ ۲۵۸
بعض مشرکین کا یہ خیال درست نہیں کہ اگر
ہم ایمان لے آئے تو مشرکین یہاں سے
اٹھا کر لے جائیں گے۔ فرمایا: مکہ جائیں
امن ہے اس قسم کا خطرہ نہیں ہے ____ ۲۵۹
اللہ رسول کے ذریعہ پیغام پہنچانے
سے پہلے کسی بستی کو تباہ نہیں کرتا _____ ۲۶۰
اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے رسول کو علاقے کے
مرکز (دارالحکومت) میں مبعوث فرماتا ہے ۲۶۱
دنیا کی متاع حیات آخرت کے
مقابلے میں ناچیز ہے __________ ۲۶۲
مشرکین کے سرکردہ لوگ قیامت کے
دن اپنے مریدوں سے بیزاری کا اظہار
کریں گے ______________ ۲۶۳
دنیا کی زندگی کی کامیابی آخرت کی کامیابی
کی علامت نہیں ہے ___________ ۲۶۴
قیامت کے دن مشرکوں سے سوال ہوگا
تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟ تو
ان سے کوئی جواب نہیں بن پائے گا __ ۲۶۵
خلق کرنا اور برگزیدہ کرنا دونوں اللہ کے
ہاتھ میں ہے _____________ ۲۶۶
اگر ہمیشہ رات رہے یا ہمیشہ دن رہے
تو کون ہے جو رات کو دن اور دن کو
رات میں بدل دے؟ پس اللہ
خالق اور مدبر ہے ___________ ۲۶۸
قیامت کے دن ہر امت سے گواہ
پیش کیا جائے گا ____________ ۲۷۰
قارون اور اس کی دولت کا ذکر _____ ۲۷۱
دولت سے آخرت کو آباد کرنے اور ساتھ

ضرورت کی معیشت محفوظ رکھنے کا حکم
ہے۔ قارون کی طرح دولت کو اپنی
مہارت کا نتیجہ قرار دینا نعمت الٰہی
کا انکار ہے ________ ۲۷۳
جن کی نظر صرف دنیا تک محدود ہے وہ
دولت مندوں کو قابل رشک سمجھتے ہیں ___ ۲۷۴
راز حیات کا علم رکھنے والے دولتمندوں کو
قابل رشک نہیں سمجھتے ________ ۲۷۵
قارون اور اس کا گھر زمین میں دھنس
جاتا ہے تو بات کھل جاتی ہے کہ دولت
قابل رشک نہیں ہے ________ ۲۷۷
آخرت کی زندگی ان لوگوں کے لیے ہوگی
جو دوسروں پر برتری نہیں چاہتے ____ ۲۷۸
نیکی کرنے والوں کو اس نیکی سے بہتر
ثواب ملے گا جب کہ برائی کرنے والوں
کو برائی کے برابر سزا ملے گی _____ ۲۷۹
مکہ میں فاتحانہ داخل ہونے کی نوید ___ ۲۸۰
قرآن کا نزول اللہ کی وہ رحمت ہے جو
رسولؐ سے کبھی جدا نہ ہوئی ________ ۲۸۱
معبود فنا پذیر نہیں ہوتا۔ حاکمیت
صرف اللہ کے پاس ہے ________ ۲۸۳

سورۃ العنکبوت
تعارف سورہ ________ ۲۸۷
صرف ایمان کا اظہار کافی نہیں
آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے ______ ۲۸۹
مجرم عذاب الٰہی سے نہیں بچ سکتا ____ ۲۹۰

والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا
حکم۔ البتہ اگر والدین شرک کرنے کا
حکم دیں تو اطاعت نہیں کرنا ہے ____ ۲۹۳
آزمائش کا متحمل نہ ہونا ایمان نہ ہونے کی
علامت ہے کافر لوگ اہل ایمان سے کہتے
ہیں کفر اختیار کریں تو تمہارا گناہ
ہمارے ذمے جبکہ کسی کے گناہ کا بوجھ
کوئی اور نہیں اٹھا سکتا ________ ۲۹۵
حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ______ ۲۹۷
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر ۲۹۹
دنیا ہی میں خلق واعادۂ خلق کا منظر ہمیشہ
انسان کے سامنے ہے سیر فی الارض
سے اعادہ خلق قابل فہم ہو جاتا ہے
حضرت ابراہیم کو یہ جواب ملتا ہے کہ
اسے جلا ڈالو ________ ۳۰۳
قبول حق کے لیے برادری بندش
حائل ہوتی ہے ________ ۳۰۵
قوم ابراہیم علیہ السلام حضرت لوط علیہ السلام
لاتے ہیں جو خود بھی پیغمبری کے
درجے پر فائز تھے ________ ۳۰۵
نبوت اور کتاب صرف اولاد ابراہیم
کو ملی ہے ________ ۳۰۶
حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر ________ ۳۰۷
قوم لوط کی تباہی کا ذکر ________ ۳۰۸
حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر ________ ۳۱۱
قوموں کی تباہی کا ذکر ________ ۳۱۲
غیر خدا کی پرستش کرنے والے مکڑی کی تار

کو اپنا سہارا سمجھتے ہیں

نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے _ ۳۱۶

اہل کتاب کے ساتھ بحث ومناظرہ احسن
انداز سے کیا کرو۔ ہاں اگر وہ زیادتی
کریں تو بالمثل جواب دینا ہوگا ____ ۳۱۸

رسول اللہؐ نے انسان کی لکیروں کو کبھی پڑھا
نہ لکھا ہے ________ ۳۲۱

قرآن رسول اللہؐ کا دائمی عظیم معجزہ ہے _ ۳۲۳

مہلت دینا حکمت الٰہی کا اٹل فیصلہ نہ ہوتا
ان پر عذاب نازل ہو جاتا ____ ۳۲۶

دین کی خاطر وطن چھوڑنا واجب ہے __ ۳۲۷

ہر نفس کے لیے موت حتمی ہے ____ ۳۲۷

ہر جاندار کی روزی اللہ کے ذمے ہے __ ۳۲۹

مشرکین مانتے ہیں آسمانوں اور زمین کا
خالق، شمس وقمر کو مسخر کرنے والا، آسمان
سے بارش برسانے والا اللہ ہے۔
تدبیر حیات کے بارے میں
عقل سے کام کیوں نہیں لیتے ____ ۳۳۰

خطرۂ جان کے وقت اللہ یاد آتا ہے __ ۳۳۳

حرم مکہ کو امن کی جگہ بنانا
ایک عظیم نعمت ______ ۳۳۴

اللہ کی راہ میں کام کرنے والوں کے لیے
راہیں کھل جاتی ہیں _____ ۳۳۵

سورۃ الروم

تعارف سورۃ _____ ۳۳۹

روم کی شکست اور بعد میں فتح کی خبر __ ۳۴۰

مشرکین کے لیے ایک اہم خبردار ____ ۳۴۳

قیامت کے دن مشرکین کی
حالت زار کا ذکر _____ ۳۴۵

تسبیح کے اوقات کا ذکر _____ ۳۴۷

زندہ کو مردے سے اور مردہ کو زندہ سے
نکالنا صرف اللہ کا کام _____ ۳۴۸

زوجین کو ایک دوسرے سے سکون اور محبت
حاصل ہونا اللہ کی طرف سے تدبیر حیات
کی نشانی ہے _____ ۲۵۰

رنگ و زبان کا مختلف ہونا
اور اللہ کی تدبیری نشانی ہے ____ ۳۵۰

رات کا آرام اور دن کی جفاکشی بھی اللہ کی
تدبیری آیات ہیں ____ ۳۵۱

اللہ کل کائنات کا مالک ہے اور کل
کائنات اللہ کے تابع فرمان ہے ___ ۳۵۳

کائنات میں اللہ تعالیٰ کی شان وصفات
کی اعلیٰ مثالیں ہیں ____ ۳۵۴

انسان اپنے غلام کو شریک نہیں کرتا
تو اللہ اپنی مخلوق کو کیسے شریک بنائے گا؟ ۳۵۵

اللہ کا دین عین فطرت ہے ____ ۳۵۷

مشرک تکلیف کے وقت اللہ کو پکارتا ہے
آسائش میں اللہ کو بھول جاتا ہے ___ ۳۶۱

ذوالقربیٰ کا حق ادا کرنے کا حکم ___ ۳۶۳

رزق وخلق اور موت وحیات
اللہ کے ہاتھ میں ہے _____ ۳۶۵

لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے
کرۂ ارض فساد میں گھر جاتا ہے ___ ۳۶۶

اسلام، جو مضبوط ترین دین ہے
پر قائم رہنے کا حکم ______ ۳۶۷
ہوائیں رحمت خدا کی بشارت لے کر
چلتی ہیں اور کشتی بھی اللہ کی
تدبیر کا ایک نمونہ ہے ______ ۳۶۹
ہوائیں چلا کر اس سے بادل کی تشکیل کرنا
پھر اس بادل کو آسمان میں پھیلانا پھر اسے
گھنا کر کے بارش برسانا صرف اللہ کا
تدبیری عمل ہے ______ ۳۷۰
جو مردہ زمین کو زندہ کر سکتا ہے وہ مردہ
انسان کو بھی زندہ کر سکتا ہے ______ ۳۷۱
اے رسولؐ آپ ناقابل ہدایت کی ہدایت
نہیں کر سکتے ______ ۳۷۲
انسان کو ایک ناتواں سیل سے طاقتور جواں
بنانا اور طاقتور جواں سے ناتواں بوڑھا بنانا
اللہ کی حاکمیت و ربوبیت کی دلیل ہے _ ۳۷۳
قیامت کے دن مجرموں کو حیات برزخی
گھڑی بھر لگے گی جب کہ اہل علم
اس مدت کو جانتے ہوں گے ______ ۳۷۴
اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خطاب کے تمام
اسلوب اختیار کیے ہیں کسی معجزے
پر یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں _ ۳۷۶
رسولؐ کو صبر کی طاقت کا مظاہرہ کرنے
کا حکم ______ ۳۷۶

سورہ لقمان
تعارف سورہ ______ ۳۸۱
قرآن نیکی کرنے والوں کی
ہدایت کرتا ہے ______ ۳۸۲
بیہودہ باتوں اور غنا سے گمراہی پھیلتی ہے ۳۸۳
اس بیہودہ گو کو قرآنی آیات سنائی جائیں
تو تکبر سے منہ موڑتا ہے ______ ۳۸۴
آسمانوں کو ستون کے بغیر تھامنے والا،
پہاڑوں کی میخ کوبی کر کے زمین کو استقرار
دینے والا تمہارا رب ہے یہ کائنات
اللہ کی مخلوق ہے غیر خدا کی مخلوق کہاں ہے؟ ۳۸۶
حضرت لقمان کا ذکر ______ ۳۸۷
اللہ کے بعد والدین کے شکر گزار
ہونے کا حکم ______ ۳۸۹
والدین اولاد کو مشرک بنانے کی کوشش
کریں تو اطاعت نہ کرنے کا حکم لیکن
انسانی پہلو کا احترام پھر بھی ضروری ہے _ ۳۹۰
لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحتیں ______ ۳۹۱
پہلی نصیحت: کوئی گناہ پوشیدہ
نہیں رہے ______ ۳۹۱
دوسری نصیحت: نماز قائم، امر بالمعروف،
نہی از منکر، مصیبت پر صبر کرنا ______ ۳۹۲
تیسری نصیحت: تکبر نہ کرنا ______ ۳۹۲
چوتھی نصیحت: تواضع کرنا ______ ۳۹۳
اللہ کی نعمتوں کا ذکر ______ ۳۹۵
ایمان عمل کے ساتھ جفت ہوگا
تو پھل ملے گا ______ ۳۹۷
کلمات اللہ کا احاطہ ناممکن ہے ______ ۴۰۰
اللہ تعالیٰ کے لیے، کوئی کام آسان، مشکل

نہیں ہے ہر کام یکساں ہے ______ ۴۰۰
شب و روز کا آنا جانا گردش شمس و قمر
اللہ کی تدبیری آیات ہیں ______ ۴۰۱
قیامت کے دن صرف تقویٰ کام آئے گا ۴۰۴
قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔
انسان کا علم نہایت محدود ہے ______ ۴۰۵

سورۃ السجدۃ

تعارف سورۃ ______ ۴۰۹
اللہ نے ہر قوم تک اپنا پیغام پہنچایا ہے _ ۴۱۰
اللہ تعالیٰ کا عرش اللہ کے مقام
تدبیر کا نام ہے ______ ۴۱۲
اللہ نے جو چیز بھی بنائی بہترین بنائی __ ۴۱۴
مشرکین کہتے ہیں ہم جب زمین
میں گم ہو جائیں کون اٹھائے گا ______ ۴۱۶
اللہ فرماتا ہے تم گم نہیں ہوتے ملک الموت
وصول کرتے ہیں ______ ۴۱۷
مجرموں کی ندامت کا ذکر ______ ۴۱۷
ہدایت اختیار کی جاتی ہے مسلط
نہیں کی جاتی ______ ۴۱۸
مؤمن کے اوصاف کا ذکر ______ ۴۱۹
جنت کی نعمتیں دنیا میں ناقابل تصور ہے ۴۲۱
مؤمن اور فاسق برابر نہیں ہوتا
(شان علی علیہ السلام) ______ ۴۲۱
مؤمن اور فاسق کا انجام ______ ۴۲۳
فتح کے بعد کا ایمان فائدمند نہیں ہے __ ۴۲۷
فتح کے انتظار کا حکم ______ ۴۲۸